عالم اسلام میں اپنے موضوع پر جامع منضبط اور مدلل تحریر

ابکار الافکار فی اصول الاکفار

المعروف

اصولِ تکفیر

ایمان کی لغوی واصطلاحی تحقیق، ضروری شرائط، کفر کی لغوی واصطلاحی تحقیق، اقسام واحکام، کفر و تکفیر کی شرائط موانع تکفیر، افراط و تفریط پر مبنی رویے اور ان کی نشاندہی و اصلاح، ضروریات دین کا مفصل تعارف اور تحقیقی و تطبیقی جائزہ تکفیر کا جامع اور منضبط ضابطہ، استحلال واستخفاف کی شرائط اور مختلف صورتیں، سیکولرزم کی تاریخ، اہداف اور شرعی حکم، حکم بغیر ما انزل اللہ کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام۔ یہ اور اس کے علاوہ اس موضوع پر ایک مفصل ومدلل تحریر

تقریظ

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ
سابق مہتمم جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک

تاثرات

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم، کراچی

تقدیم

حضرت مولانا سجاد الحجابی صاحب زید مجدہم
شیخ الحدیث جامعہ انوار القرآن والعلوم، نرشک مردان

تالیف

مفتی عبید الرحمٰن صاحب، مردان

ناشر
مکتبہ دار التقویٰ مردان
030-093-26101
031-430-17364

اُصولِ تکفیر

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم، کراچی

شہید ناموسِ رسالت

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب

سابق مہتمم جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک

حضرت مولانا محمد سجاد الحجابی صاحب زید مجدہم

شیخ الحدیث جامعہ انوار القرآن والعلوم، نرشک مردان

تالیف

مفتی عبید الرحمن صاحب، مردان

فہرست عنوانات

عنوان صفحہ نمبر

تقریظ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم ۲۰
تقریظ شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ ۲۱
مقدمہ حضرت مولانا محمد سجاد الحجابی صاحب زید مجدہم ۲۴
پیش لفظ ۳۷
دیباچہ طبع ثانی ۴۴
بابِ اوّل ۴۵
ایمان کی لغوی ۴۶
اصطلاحی تعریف ۴۸
حضراتِ اشاعرہ اورماتریدیہ کا مؤقف ۴۸
فوائد قیود ۴۹
متکلمین کاایمان کی تعریف سے متعلق ایک اہم نکتہ ۵۵
مقلد کے ایمان کی بحث ۵۷
جمہور متکلمین کا مؤقف اور علامہ شقرون ؒ کے ایک رسالے کا خلاصہ............ ۵۸
ترجیح ۶۰
اُصولِ دین ۶۱
ایمان باللہ ۶۱
ایمان بالملائکہ ۶۲
ایمان بالکتب ۶۲

ایمان بالانبیاء ۶۲
ایمان بالیوم الآخر ۶۴
ایمان بالقدر ۶۴
شرائطِ ایمان ۶۴
۱۔ اقرار باللسان ۶۵
۲۔ رضاومحبت ۶۷
۳۔ تعظیم واحترام ۶۸
۴۔ تسلیم وانقیاد ۶۹
امام اعظم رحمہ اللہ کی تصریح ۷۰
آیتِ تسلیم کی وضاحت پر ایک اشکال کا جواب ۷۱
بالفاظِ دیگر ۷۴
حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی جامع تفسیر ۷۵
۵۔ مخالف ادیان ومذاہب سے بیزار ہونا ۷۶
ان شرائط کو مقرر کرنے کی بنیادی وجہ ۷۷
علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی عبارت ۷۹
کفر کی لغوی تحقیق ۸۲
لغوی اور اصطلاحی معنیٰ میں مناسبت ۸۳
کفر کا اصطلاحی تعارف ۸۴
پہلی تعریف ۸۴
دوسری تعریف ۸۵
تیسری تعریف ۸۵
کفر کی راجح تعریف ۸۷
ایمان اور کفر کے درمیان نسبت ۸۸

کفر کی مختلف قسمیں ۸۹
محلِ انکار کے اعتبار سے کفر کی قسمیں ۹۱
بابِ دوم ۹۳
باب دوم ۹۴
تکفیر میں افراط کرنا ۹۵
کسی کو کافر کہنے کے بارے میں قرآن کریم کی ہدایت ۹۵
تکفیر میں نہایت احتیاط سے متعلق حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیم ۹۷
امام طحاوی کی ذکر کردہ توجیہ ۱۰۰
بلا تحقیق کفر کا حکم جاری کرنے پر حضور ﷺ کی طرف سے سخت سرزنش ۱۰۱
دربارِ نبوت کی طرف سے خصوصی ہدایت ۱۰۴
بے بنیاد تکفیرِ مسلم کے ناجائز ہونے سے متعلق متواتر احادیث ۱۰۶
تکفیرِ مسلم میں احتیاط ایک بنیادی فقہی اُصول کی روشنی میں ۱۰۷
فقہاءِ کرام کا تکفیر سے متعلق نہایت درجہ احتیاط برتنا ۱۰۸
فقہاءِ کرام کے نزدیک کفر اور تکفیر میں فرق کی رعایت ۱۰۹
لزوم کفر اور التزام کفر کی تفریق: احتیاط کا ایک مظہر ۱۱۰
لزومِ کفر اور التزامِ کفر میں فرق امام عزالدین کی نظر میں ۱۱۲
امام شاطبی رحمہ اللہ کا مؤقف ۱۱۳
علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ۱۱۳
علامہ شامی رحمہ اللہ کی نظر میں لزوم اور التزام کا فرق ۱۱۴
لزوم بیّن التزام کی طرح ہے ۱۱۵
سلفِ صالحین کا تعامل اور طریقہ کار ۱۱۶
خوارج کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دلچسپ جواب ۱۱۷
علامہ محمد بن المرتضی رحمہ اللہ کا ذکر کردہ ایک عجیب نکتہ ۱۱۸

ایک علمی اشکال اور اس کا جواب ۱۱۸
متواتر احادیث کے باوجود تکفیر نہ کرنے کی تین بنیادی وجوہات ۱۱۸
مختلف نصوص میں لفظ "کفر" کے استعمال سے متعلق اہلِ سنت کا مؤقف ۱۲۰
اہل سنت والجماعت کا مؤقف ۱۲۳
مختلف نصوص میں تطبیق کی صورتیں ۱۲۳
تطبیق کی تمام صورتوں کا خلاصہ ۱۲۴
گناہ کبیرہ سے تکفیر کے متعلق ایک مفید تحقیق ۱۲۶
پہلا مؤقف ۱۲۶
دوسرا مؤقف ۱۲۶
تیسرا مؤقف ۱۲۷
چوتھا مؤقف ۱۲۷
پانچواں مؤقف ۱۲۸
حضرات صحابہ کرام کا طرزِ عمل ۱۲۸
تکفیر کے باب میں تفریط کرنا ۱۳۱
کسی کافر کو مسلمان قرار دینے سے متعلق احتیاط کا پہلو ۱۳۱
تکفیر کے متعلق اہل سنت والجماعت کا راہ اعتدال ۱۳۲
بروقت تکفیر نہ کرنے کا نقصان ۱۳۲
امام الحرمین کا ایک زریں ملفوظ ۱۳۳
تکفیر سے متعلق حضرات صحابہ کرام کا طرزِ عمل ۱۳۳
حضرات شیخین کا باہمی مکالمہ ۱۳۴
ایک مسلمہ ضابطہ ۱۳۵
کسی کا اسلام و کفر دونوں مشکوک ہو تو ؟ ۱۳۶
اہلِ قبلہ کی تکفیر کا مسئلہ ۱۴۳

اہلِ قبلہ کا مفہوم ۱۴۴
علامہ فرہاروی کی تشریح ۱۴۵
امام مزنی کی تصریح ۱۴۶
علامہ تفتازانی کی وضاحت ۱۴۶
اہلِ قبلہ کو کافر قرار نہ دینے کی اصل وجہ ۱۴۷
لفظِ "بذنب" کی قید ۱۴۹
فقہاء اور متکلمین کے تصریحات ۱۵۰
بروقت تکفیر کرنا اہلِ علم کی ذمہ داری ہے ۱۵۱
امام ابن دقیق العید کی تصریح ۱۵۲
خلاصہ کلام ۱۵۳
حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ الفاظِ کفر کی فقہی حیثیت ۱۵۳
پہلا مؤقف ۱۵۴
دوسرا مؤقف ۱۵۴
علامہ بزازی رحمہ اللہ کا مؤقف ۱۵۵
علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کا فیصلہ ۱۵۶
اعتدال پسندانہ مؤقف ۱۵۷
باب سوم ۱۶۱
بابِ سوم ۱۶۲
کفر کا حکم ۱۶۲
تکفیر کا حکم ۱۶۲
تکفیر کا فیصلہ کون کرے؟ ۱۶۳
ارتداد و کفر کا رُکنِ اعظم ۱۶۵
شرائط ۱۶۶

مکفِّرکے اعتبار سے شرائط کی تفصیل ۱۶۶
مکلف ہونا ۱۶۷
عدالت ۱۶۷
تیقظ ۱۶۷
زمانے کے عرف سے واقفیت ۱۶۸
زمانہ کے عرف وعادت سے واقفیت کی اہمیت ایک مثال کی روشنی میں ۱۶۹
مکفَّر کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل ۱۷۰
پہلی شرط :عاقل ہونا ۱۷۰
دوسری شرط : بالغ ہونا ۱۷۰
بلوغ کی شرط ہونے کے متعلق فقہاء کرام کے مختلف مذاہب کا خلاصہ ۱۷۱
تیسری شرط: اختیارورضامندی ۱۷۲
غلطی سے کوئی کفریہ کلمہ کہنے کا حکم ۱۷۳
کفریہ کلمہ کہا اور معنٰی معلوم نہیں ۱۷۴
کافر ہونے کا قصد ضروری نہیں بلکہ قصد فعل کافی ہے ۱۷۶
عام تکفیراور شخصِ معین کی تکفیر میں فرق ۱۷۷
علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی تصریح ۱۷۸
علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی توضیح ۱۷۸
تکفیر مطلق اور معین میں فرق کی دلچسپ نظیر احادیث کی روشنی میں ۱۸۰
تکفیر مطلق اور معین میں فرق کرنے کی فقہی نظیر ۱۸۱
امام صاحب کے کلام سے ایک اور نظیر ۱۸۴
معین سے کیا مراد ہے؟ ۱۸۴
چوتھی شرط : موانع کا موجود نہ ہونا ۱۸۵
موانع تکفیر ۱۸۵

پہلا مانع: جہل ۱۸۶
قیامِ حجت ۱۸۷
ایک شبہ اوراس کا ازالہ ۱۸۸
لفظ کفر کے دو مختلف مفہوم ۱۸۹
امام محمد رحمہ اللہ کا مدبرانہ فیصلہ ۱۹۱
دوسرا مانع: اکراہ ۱۹۲
امام کاسانی رحمہ اللہ کی ایک دلچسپ تفریع ۱۹۳
اکراہ سے مقصود ۱۹۴
اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کہنا شرعاً ضروری نہیں ۱۹۵
عزیمت کی راہ ۱۹۶
حضور ﷺ کا فیصلہ ۱۹۸
فقہاء شافعیہ کی طرف سے ایک مناسب تطبیق ۱۹۸
امکانی حد تک زوایہ فکر کی تبدیلی ۱۹۹
حضرات فقہاءِ کرام کے نزدیک توریہ کی اہمیت ۲۰۰
تیسرا مانع: تاویل ۲۰۲
لغوی تحقیق ۲۰۲
متکلمین کی اصطلاح ۲۰۳
فوائد قیود ۲۰۵
تاویل کے جائز یا ناجائز ہونے کی اُصولی بحث ۲۰۶
نقل خلافِ اصل دلیل سے ہو ۲۰۷
تاویل کے جائز ہونے کی شرائط ۲۰۸
پہلی شرط: لغوی معنیٰ کا متعذر ہونا ۲۰۸
تاویل ہی کا سہارا لینے کی وجہ ۲۰۹

علامہ کفوی کی وضاحت ۲۱۰
ضرورت کے بغیر نصوص میں تاویل ۲۱۱
کن حالات میں نصوص کے اندر تاویل کی جاسکتی ہے؟ ۲۱۲
متکلمین کی ذکر کردہ تفصیلات کا خلاصہ ۲۱۲
علامہ فرہاروی رحمہ اللہ کی مختصر اور جامع عبارت ۲۱۳
بحث کا حاصل ۲۱۳
دوسری شرط: مؤول کی اہلیت ۲۱۵
تیسری شرط: الفاظ میں تاویل کا احتمال موجود ہو۔ ۲۱۵
تکفیر کے باب میں تاویل کی اہمیت ۲۱۶
"تاویل" تکذیب نہیں بلکہ تصدیق کی فرع ہے ۲۱۷
جمہور اُمت کا مؤقف ۲۱۸
ضروریاتِ دین میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے ۲۱۹
مسئلہ ختم نبوت میں تاویل کے کفر ہونے کی اصل وجہ ۲۲۰
امام صاحب کے کل فتاویٰ تکفیر کی تعداد ۲۲۱
ضروریاتِ دین میں تاویل کے کفر ہونے کی بنیادی وجہ ۲۲۲
تاویل معتبر ہونے کے متعلق ایک ضروری نکتہ ۲۲۴
علامہ کشمیری اور جامع الفصولین کی عبارات میں تضاد ۲۲۷
تطبیق ۲۲۸
تیسری قسم کی شرائط ۲۳۰
پہلی شرط: موجبِ کفر ہونا ۲۳۰
دوسری شرط: کفر و تکفیر کا دار ومدار ۲۳۰
دلالت کا معیار ۲۳۱
تیسری شرط: کفریہ عمل کے صادر ہونے کا شرعی ثبوت ۲۳۳

چوتھی شرط: موانعِ تکفیر موجود نہ ہوں ۲۳۴
پانچویں شرط: بنائے تکفیر کا کفر ہونا یقینی ہو ۲۳۴
احکام وکفر و تکفیر ۲۳۹
ایمان وکفر کے اعتبار سے اُخروی احوال ۲۳۹
دنیوی معاملات میں کفر اور کفار کے احکام ۲۴۰
کفر کے متعلق اسلام کا نظریہ ۲۴۱
عبادات اور معاملات میں اسلام وکفر کے درمیان بنیادی فروق ۲۴۵
نکاح ومعاشرت کے باب میں فرق ۲۴۷
حقوق واملاک میں فرق ۲۴۷
جماعت کی تکفیر کا ضابطہ ۲۴۹
باب رابع ۲۵۴
موجبات کفر و تکفیر کی منضبط بحث ۲۵۵
کفر اور تکفیر میں فرق اوراس کی وضاحت ۲۵۵
کفر کا موجب: اعتقاد ۲۵۶
ضروریاتِ دین کی تعریف ۲۵۷
علم منطق کی اصطلاح میں ضروری کا مفہوم ۲۵۷
علم کلام کی اصطلاح میں ضروری کا مفہوم ۲۵۷
ضروریاتِ دین کا مطلب ۲۵۹
ضروری سے حکم کا بدیہی ہونا ضروری نہیں؟ ۲۶۰
علامہ کشمیری کی عبارت ۲۶۱
علامہ عثمانی کی واضح عبارت ۲۶۲
"ضروریاتِ دین" کیا ہیں؟ ۲۶۳
ماحول اور زمانے کا اثر ۲۶۳

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کی تصریح ۲۶۴
حدیث حذیفۃ بن الیمان رضی اللہ عنہ ۲۶۵
ضروریاتِ دین کیلئے فرض واجب ہونا کوئی ضروری نہیں ۲۶۷
"عوام" کا مفہوم ۲۶۸
کیا سب عوام کا جاننا ضروری ہے؟ ۲۶۹
"ضروریاتِ دین" کی تعداد ۲۷۰
حضرت بنوری رحمہ اللہ کا ایک مفید مقالہ ۲۷۱
ضروریاتِ دین کے انکار کا حکم ۲۷۳
ضروریاتِ دین میں اپنی طرف سے تاویل کرنے کا حکم ۲۷۴
اکفار الملحدین کا خلاصہ ۲۷۶
قطعی احکام کے انکار کا حکم اور فقہاء کرام کا مؤقف ۲۷۷
جن فقہاء کرام کے نزدیک صرف ضروریاتِ دین کا انکار کفر ہے ۲۷۹
سابقہ تفصیلات کا حاصل ۲۸۱
قولِ فیصل ۲۸۲
پہلی وجہ: اساسِ تکفیر موجود ہے ۲۸۲
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۸۳
"ضروریاتِ دین" کی قید لگانے کی اصل وجہ ۲۸۴
دوسری وجہ: قطعی اور ضروری کے درمیان اصل فرق ۲۸۵
تیسری وجہ: ۲۸۶
علامہ مرتضی یمانی رحمہ اللہ کی عبارت ۲۸۷
چوتھی وجہ ۲۹۰
پانچویں وجہ: قطعی اور ضروری مترادف ہیں یا نہیں؟ تحقیقی مبحث ۲۹۰
علامہ ابو الشکور سالمی رحمہ اللہ ۲۹۰

قاضی عیسی بن ابان ۲۹۱
حضرت شاہ عبدالعزیز کا مؤقف ۲۹۲
علامہ کشمیری کامؤقف ۲۹۴
علامہ بنوری کی تحقیق ۲۹۴
ایک بنیادی اشکال اوراس کا حل ۲۹۵
حنفیہ کے مؤقف کی توجیہ محققین کی نظر میں ۲۹۵
علامہ ابن الہمام کی توجیہ ۲۹۵
علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کی توجیہ ۲۹۶
علامہ کشمیری رحمہ اللہ ۲۹۷
علامہ محمد زاہد الکوثری کی توجیہ ۲۹۸
چھٹی وجہ: تواتر علمِ ضروری کے لئے مفید ہے ۲۹۹
خبرِ متواتر کے متعلق جمہور اُمت کا مؤقف ۲۹۹
علامہ صفی الدین ہندی ۳۰۰
ساتویں وجہ:فقہاء کرام کی تصریحات ۳۰۱
علامہ بدرالرشید کی تصریح ۳۰۲
آٹھویں وجہ: ضروریاتِ دین کی تقسیم ۳۰۵
امام سبکی کی تفصیلی عبارت ۳۰۶
نویں وجہ:اُصولیین کاضابطہ ۳۰۸
اُصول فقہ میں مسئلہ تکفیر کی ضمنی مباحث ۳۱۰
فرض اور واجب کے درمیان فرق کی ضمن میں تکفیرکامسئلہ ۳۱۰
امام سرخسیؒ ۳۱۰
سنت اور اجماع کی ضمن میں تکفیر کی بحث ۳۱۳
اُصولیین کی چند عبارات ۳۱۳

تواتر کی شرائط ۳۱۴
تواتر کی قسمیں ۳۱۵
اُصولِ تکفیر ۳۱۷
تکفیر کی دوسری اور تیسری بنیاد: قول و عمل ۳۱۷
قول و فعل کے موجب کفر بننے کی اصل وجوہات ۳۱۸
فقہ حنفی کی جامعیت ۳۱۹
قول و عمل کے موجب کفر بننے کے متعلق تحقیق کا حاصل ۳۲۰
استحلال کی تحقیق اور اس کا مفہوم ۳۲۱
استحلال کا حکم ۳۲۲
مستحِل کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل ۳۲۳
پہلی شرط: مسئلہ کا علم ہونا ۳۲۳
دوسری شرط: استحلال تاویل کے ساتھ نہ ہو ۳۲۵
بدعتی کی تکفیر کا مسئلہ ۳۲۸
علامہ ابن الہمام کی صراحت ۳۲۹
مستحَل کے اعتبار سے شرائط کا بیان ۳۳۰
معصیت کا ثبوت قطعی ہو ۳۳۰
حرام کی حرمت لعینہ ہو ۳۳۲
فقہائے کرام کی آراء ۳۳۲
راجح بات ۳۳۴
عالم و غیر عالم کا فرق ۳۳۵
ضروریاتِ دین میں سے ہونا ۳۳۶
استحلال کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل ۳۳۷
استحلالِ عملی ۳۴۰

عملی استحلال کے متعلق ایک ضروری وضاحت ۳۴۳
استخفاف ۳۴۶
استخفاف کی صورتیں ۳۴۶
استخفاف کی ایک صورت لاپرواہی ۳۵۰
استہزاء ۳۵۲
استہزاء کیا ہے؟ ۳۵۳
شرعی احکام کا مذاق کفر ہے ۳۵۴
استہزاء کے موجب کفر بننے کی اصل وجہ ۳۵۶
ایک اُصولی اشکال اوراس کا جواب ۳۵۷
استہزاء کی بناء پر تکفیر کرنے کی شرائط ۳۵۸
دوسری شرط ۳۶۱
فقہاءِ کرام کی ذکر کردہ تفصیل پر اشکال کا جواب ۳۶۱
ایک مسلمہ ضابطہ ۳۶۲
علامہ موصلی، قاسم قطلوبغا اور علامہ خیالی کی وضاحت ۳۶۳
فصل دوم ۳۶۵
تکفیر کے باب میں نہایت جامع اور منضبط ضابطہ ۳۶۵
اعتقاد میں شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم ۳۶۶
اقوال میں شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم ۳۶۹
شہادتین کی اہمیت ۳۶۹
علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی تحقیق ۳۷۰
اعمال میں شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم ۳۷۲
کونسے اعمال کفریہ ہیں اور کونسے نہیں؟ ۳۷۲
فقہاءِ احناف اور جمہور حضرات کا مؤقف ۳۷۴

مخالفت کی دوسری قسم ۳۷۵
اعتقاد میں شریعت کے مخالفت کی دوسری قسم ۳۷۵
اقوال واعمال میں مخالفت کی دوسری قسم ۳۷۶
ایمان کے چار بنیادی لوازم ۳۷۶
اس قسم کی مخالفت کا شرعی حکم ۳۷۹
گناہ کبیرہ کے متعلق اہل سنت والجماعت کا مؤقف ۳۷۹
رضاومحبت فوت ہونے کی بنیاد پر تکفیر کی مثال ۳۸۲
رضابالکفر کفر کیوں ہے؟ ۳۸۳
کفر کی تعلیم، تبلیغ اوراس کا مشورہ دینا بھی کفر ہے ۳۸۶
تبلیغ و تعلیم کے کفراور بددعا کے کفر نہ ہونے میں بنیادی فرق ۳۸۸
تعظیم واحترام فوت ہونے کی وجہ سے تکفیر کی مثال ۳۹۰
حکم شرعی کا مذاق کفر ہے ۳۹۱
تسلیم وانقیاد فوت ہوجانے کی وجہ سے تکفیر کی مثال ۳۹۲
ادیان باطلہ سے بری نہ ہونے کی وجہ سے تکفیر کی مثال ۳۹۴
حضرات فقہاء کرام کی چند جزئیات ۳۹۵
باب خامس ۳۹۹
باب کا تعارف ۴۰۰
قدیم وجدید فتنوں میں فرق ۴۰۰
تکفیر کے باب میں ان مسائل کو ذکر کرنے کی بنیاوی وجہ ۴۰۱
سیکولرازم کا تعارف ۴۰۳
اصطلاحی تعریف ۴۰۴
آغاز وارتقاء ۴۰۵
کلیسا کی کہانی ۴۰۶

سیکولرازم کا فکر وفلسفہ برائے نظام زندگی ۴۰۸
علم وفکر کے باب میں سیکولر نظریہ ۴۰۹
حکومت وسیاست کے باب میں اس کا نظریہ ۴۱۰
دستور وقانون کے متعلق نظریہ ۴۱۰
معیشت واقتصاد کے متعلق نظریہ ۴۱۱
اخلاق وتربیت کے میدان میں اس کا نظریہ ۴۱۱
تعلیم کے میدان میں سیکولر نظریہ ۴۱۲
سیکولر تعلیمات ونظریات کا خلاصہ ۴۱۲
سیکولرازم کے شرعی حکم کی تحقیق..۴۱۳
سیکولر ازم کا نظریہ متقدمین کی نظر میں ۴۱۵
مجمع الفقہ الاسلامی کی قرارداد ۴۱۹
سعودی عرب کے لجنۃ العلماء کا فیصلہ ۴۲۰
شیخ الاسلام مصطفی صبری رحمہ اللہ کی دقت نظری ۴۲۱
علامہ زاہد کوثری رحمہ اللہ کا فتویٰ ۴۲۳
علامہ عبد القادر عودہ کی رائے ۴۲۶
تحکیم بغیرماانزل اللہ ۴۲۷
مسئلہ کی نزاکت ۴۲۹
معاصر فقہاء کرام کا اختلاف ۴۳۰
بعض اہل علم کا موقف ۴۳۰
علامہ ابن تیمیہ کی تصریح ۴۳۰
اس موقف کا نتیجہ ۴۳۳
وقتی اور دائمی طور پر فیصلہ کرنے کا فرق ۴۳۳
اہل سنت والجماعت کا موقف... ۴۳۶

وضعی قوانین اور تکفیر کی متنوع صورتیں ۴۳۹
مفتی محمد ابن ابراہیم کی تحقیق ۴۴۷
المصادر والمراجع ۴۴۹

تقریظ

حضرت مولانا **مفتی محمد تقی عثمانی** صاحب مد ظلہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عزیز گرامی قدر! جناب مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

آپ کا گرامی نامہ اوراس کے ساتھ آپ کی تالیف لطیف ''اُصول تکفیر'' موصول ہوئی، چونکہ روزانہ بہت سی کتابیں آتی ہیں، اس لئے مطالعے کا موقع کم ملتا ہے، لیکن آپ کی اس کتاب کا بندہ نے معتدبہ حصہ تک مطالعہ کیا، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ الحمدللہ! آپ نے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اس نازک موضوع پر اہل سنت والجماعت کے معتدل مسلک کے عین مطابق بحثیں فرمائی ہیں۔ دل سے دُعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں اور یہ قارئین کیلئے نافع ثابت ہو۔ آمین

آپ سے بھی دعا کا خواستگار ہوں کہ بقیہ ایام زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رضائے کامل کے ساتھ گذار دیں۔ آمین

بندہ کے یہ کلمات اگر آپ شائع بھی کرنا چاہیں تو بندہ کی طرف سے اجازت ہے۔

والسلام

محمد تقی عثمانی

۲۰۔۰۷۔۳۱

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مد ظلہ [۱]

الحمدلحضرۃ الجلالۃ و الصلوۃ و السلام علی خاتم الرسالۃ،

وبعد!

دینِ اسلام میں اہم ترین اُمور اور واجباتِ مہمہ میں سے یہ بھی ہے کہ ہر مسلمان اس بات کو خوب سمجھ لے کہ دینِ اسلام وہ دین ہے جس نے ترجیحات کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور اہم ترین اُمور کو ایک ترتیب دی ہے اور اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ تمام مسائل و قضایا کو ان کی صحیح میزان پر تولا جائے، ان کو شرعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور ان کی تفصیلات اور فروع کا مکمل ادراک حاصل کیا جاسکے اور دینِ اسلام کے کسی بھی حکم اور مسئلہ میں افراط و تفریط، غلو و عناد سے کام نہ لیا جائے اور احکام کے نفاذ میں سے کسی بھی حکم میں خواہشِ نفس کی جانب ہر گز جھکاؤ نہ کرے، خواہ مقصد کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو۔

اسلام کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا معاملہ بہت نازک ہے اور جن کی شان و شوکت بہت عظیم اور ان کا فہم اور ادراک بہت دقیق و مشکل ہے، وہ مسائل قدموں کے لڑکھڑانے اور فہموں میں گمراہی کا باعث تب بن جاتے ہیں، جب اس فہم اور انطباق میں احتیاط سے کام نہ لیا جائے۔ ان مسائل میں سب سے نازک مسئلہ "مسئلہ تکفیر" ہے، یہ

[۱] جن کو کچھ عرصہ قبل شہید کیا گیا۔

بہت دقیق اور مشکل ترین مسئلہ ہے۔ اس میں دخل اندازی کرنے والا اگر اس کے دقائق، رُموز، شرائط، اقسام اور حدود سے باخبر نہ ہو، نیز محقق اور فقیہ شخص نہ ہو تو ٹھوکر کھا جاتا ہے اور جو عالم ربانی نہ ہو گا وہ اس مسئلہ کی پیچیدگیوں میں گم ہو کر رہ جائے گا۔

مسئلہ تکفیر کو تاریخ کے ہر دور میں اہلِ علم مشکل سمجھتے آئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبقہ نے مبالغہ آمیزی اور غلو سے کام لیا تو دوسرے طبقہ نے اسے سمجھنے میں کوتاہی و تفریط برتی، یہ مسئلہ ایسا ہے جس میں صحیح و صواب تک صرف وہی ہدایت پا سکتا ہے جس نے کتاب و سنت کے نور سے حظِ وافر پایا ہو اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، تابعین عظام اور تبع تابعین رحمہم اللہ علیہم کے منہج اور اسلاف کے نقش قدم پر چلا ہو، یہ مسئلہ، علم الکلام، علم العقائد اور ایمانیات کے باب سے تعلق رکھتا ہے، جس کے قواعد و ضوابط، اُصول و قوانین، شرائط و حدود، تشریحات و مباحث کو عام فہم بنانے میں علماءِ کرام اور اہلِ تحقیق نے ہر دور اور ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ اور اس کی انواع واقسام، حدود و موانع کو ادلہ ومآخذِ اسلامیہ کے تحت مضبوط کر کے اس کے اُصول وضوابط طے کئے اور بغیر فہم وادراک کے اس میں دخل اندازی کی نزاکت کی نشاندہی کر کے اس پر تنبیہ کی ہے۔ اب تک اس موضوع پر ہر زبان میں ہر مسلک اور مکتب فکر کے علماء کرام اور اہلِ تحقیق نے بے شمار کتابیں تحریر فرمائی ہیں، تاہم اس حوالہ سے کسی ایسی تحریر کی تشنگی محسوس کی جارہی تھی جو تمام مکاتبِ فکر کے لیے اطمینان کا سامان فراہم کر سکے۔

زیر نظر کتاب ''إبكار الأفكار فی أُصول الإكفار'' معروف بہ ''اُصولِ تکفیر'' بھی اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے، یہ کتاب مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب کی تالیف لطیف ہے جو کفر اور تکفیر کے موضوع پر جامع، منضبط اور مدلل تحریر ہے۔ مفتی عبید الرحمن

صاحب ایک باصلاحیت، صاحبِ قلم محقق اور نوجوان عالم دین ہیں، ان کا ذوقِ تحقیق قابل صد تحسین ہے کہ اُنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس نازک موضوع پر پُر از معلومات اور فکر انگیز کتاب مرتب فرمائی اور اس حساس اور نازک مسئلہ پر اہلِ سنت والجماعت کے تمام اکابر واہلِ علم کے اقوال اور تحقیقات کی روشنی میں تکفیر کے لیے شرعی معیار کا تعین کیا اور ائمہ اہلسنت کے اقوال واعمال کی روشنی میں تکفیر کی شرائط اور حدود کا تعین کیا ہے۔ عدیم الفرصتی کے باوجود جستہ جستہ مباحث اور مقامات کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ موصوف نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حساس موضوع پر کافی مواد اکٹھا کر کے اس کو کتابی شکل میں اہلِ علم کے سامنے پیش کیا۔ ان شاء اللہ یہ وقیع علمی کاوش اس پر فتن دور میں ہر گروہ، ہر فرقہ اور ہر مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ اور ہر صاحبِ علم کے لیے چشم کشا، بصیرت افروز، معلومات افزاء ہوگی۔ اللہ سے دُعا ہے کہ مؤلف کی اس کاوش کو قبولیت بخشے۔ آمین

سمیع الحق

خادم دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

مقدمہ

حضرت مولانا محمد سجاد الحجابی صاحب زید مجدہم

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کو دینِ فطرت اور ملتِ حقہ پر پیدا فرمایا، مگر حالات وماحول کی وجہ سے ان کے مزاج، رائے وسوچ میں نفسانی وساوس اور شیطانی خیالات داخل ہوئے اوراس دینِ فطرت پر مضبوط عقیدہ رکھنے میں رخنے ڈالنے شروع کر دیے اور یوں دینِ فطرت پر ایسی دُھند پڑ گئی کہ حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو گیا، صریح حدیث شریف میں انسانیت کی اس طرف رسول اللہ ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله ﷺ: ما من مولود إلا يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه وينصرانه ويشركانه-[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ہر بچہ اصل فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے پھر اسکے والدین اسکو یہودی، عیسائی یا مشرک بناتے ہیں۔"

چنانچہ صحیح اور غلط میں تفریق کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا گیااور ان پر کتابیں اور وحی نازل فرمائی، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين-

---

[١] سنن ابن ماجه، باب ما جاء فيمن ترك الصلاة، رقم الحديث: ١٠٧٩.

انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کی وجہ سے تمام انسان ماننے والے اور انکار کرنے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے، ایک جماعت اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کے رسولوں، نبیوں، کتابوں، فرشتوں، احکامات، تقدیر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر دل وزبان سے ایمان لا کر مؤمن کہلائی اور دوسری جماعت نے ان میں سے کسی ایک یا سب پر ایمان لانے سے انکار کیا، تو وہ کافر کہلائی، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُم مُّؤْمِنٌ -

انسانیت کا نقطۂ اتفاق ایمان ہے اور اس سے انحراف کفر وضلال ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیاوی اُمور کے حواس دے کر چند اُصول کے ساتھ کمانے کی اجازت دی، ایسے ہی ان حواس کو استعمال کر کے ایمان و کفر میں بھی کسب کے درجہ میں اختیار دیا ہے، تاکہ اپنے لیے دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے دینِ فطرت یا ملتِ ممسوخہ میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔

کفر و اسلام آپس میں دو متضاد تصویریں ہیں اور دو ایسی نہریں ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف سمت میں بہتی ہیں، دونوں کا تضاد روشنی اور تاریکی سے زیادہ واضح ہے، کیونکہ کفر کے پیروکار طاغوت کی پوجا کرتے ہیں اور شیطان کے ہمنوا ہیں، جب کہ مؤمن اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے سکون وراحت پا کر دنیا وآخرت میں نہایت چین کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اس واضح افتراق کی وجہ سے بعثت کے پہلے دن سے عزت وشرافت کے لیے گورے و کالے، حسب ونسب اور عرب وعجم کی تمیز ختم کر کے ایک ملتِ واحدہ کی حیثیت سے اسلامی تشخص کو حقیقی انداز میں دینِ فطرت کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا، جب کہ کفر

وشرک ایمان کے مقابلے میں ایک الگ ملت کا رُوپ دھار کر اسلام کی مخالف سمت میں ایک اُلٹ متوازی جماعت اُبھر آئی۔

ایمان وکفر کے حدود آپس میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں، کیونکہ ایمان کا تعلق دل کے یقین سے ہے، جو مذکورہ بالا اُمور کو قرآن و حدیث اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تعامل کی روشنی میں ماننے کا نام ہے، جب کہ ان عقائد کے تسلیم کرنے سے انکار کفر ہے۔

قرآن وحدیث کے ان مسلمہ حقائق کو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اور حضرات تابعین رحمہم اللہ علیہم نے اپنے تعامل سے ان کی عملی صورتوں کو واضح کر دیا، لہٰذا ان اُصولوں کے مقابلے میں جو کوئی انحراف کرتا گیا، وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم وتابعین رحمہم اللہ علیہم کی جماعت سے جدا ہو گیا، جیسے کہ دورِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں روافض اور خوارج اور عہد تابعین عظام رحمہم اللہ علیہم میں مجسمہ، معطلہ، مشبہہ، مرجئہ وکرامیہ جدا ہو گئے۔

جب کہ قرامطہ وباطنیہ اور دیگر فرقِ ضالہ جنہوں نے قرآن وحدیث کے مسلمہ عقائد کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ علیہم کے ذکر کردہ متواتر معانی سے نکال کر نئی اور خود ساختہ تعبیر بیان کرنی شروع کر دی اور صوم وصلاۃ، زکوٰۃ وجہاد اور دوسرے دینی اصطلاحات کے نئے مطالب نکالنا شروع کئے، تو تبع تابعین اور حضرات مشائخ رحمہم اللہ علیہم نے دینِ فطرت سے انحراف کی پاداش میں ان کے بارے میں تکفیر کا فتویٰ دیا۔

واضح رہے کہ ان لوگوں نے بذاتِ خود اپنے آپ کو کفر کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا، فقہاءِ کرام نے ان کے عقائد کو شریعت کے نہایت صاف وشفاف شیشہ سے

دیکھ کر اور دِکھا کر یہ بیان کیا کہ یہ لوگ اس وقت اس خطرناک مقام پر کھڑے ہیں، الغرض یہ لوگ اپنے اختیاری فعل سے کافر بنے، نہ یہ کہ علماءِ کرام نے ان کو کافر بنایا۔

چنانچہ حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ علیہم نے جب بھی کفر کا فتویٰ دیا، تو وہ دراصل ان کے عقائد و اقوال کی وجہ سے ان کے حقیقی کفر کو صرف ظاہر کیا، تاکہ اُمت مسلمہ کے متفقہ اُصول سے اِعراض اور ایمان کے ضروری تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اپنی مرضی کو استعمال کرتے ہوئے دین ممسوخہ کے ایک نئے رُکن کی نشاندہی کریں۔

گذشتہ چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلم اُمہ کی روش ایمان و کفر کی سرحدات کے تعیین میں یہی رہی، جس سے ایک طرف تو ایمان و کفر کی حدود مشخص ہوئیں، تو دوسری طرف اسلام کا نام اور مسلمانوں کے عقائدِ حقہ تا قیامت رُو بہ زوال ہونے سے بچ گئے۔ اگر علمائے حقہ ایمانی حقائق اور اسلام کی حدود کی حفاظت نہ کرتے، تو ایک جانب اسلام کا نام ہی صفحہ ہستی سے کب کا مٹ چکا ہوتا اور دوسری جانب دینِ اسلام غیروں کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتا اور جنت و جہنم کے مباحث صرف افسانے بن کر رہتے۔

اگر ایسا ہوتا تو آج کے مسلمان کا دین بھی مذہب عیسائیت کی طرح ساؤل و سینٹ فال کے پلندوں کے رکھوالے ہوتے، نہ دیر و خانقاہ بچتے اور نہ مسجد و مدرسہ، یہ تو ان بوریہ نشینوں کی کوششوں اور جدوجہد کا تسلسل ہے، جن میں بانئ علم الکلام، سرتاج اہلِ حق، سراج الامۃ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام دار الھجرۃ امام مالک رحمہ اللہ کے نام سرفہرست ہیں، جو اُموی و عباسی اُمراء کے سامنے عزم مصمم کے مینار ثابت ہوئے اور عقائد و فروعات میں اُمت کی کامل رہنمائی کی، جب کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ معتزلہ کے خلاف صبر و استقامت کے ساتھ نبرد آزما رہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ جیسے عباقرہ نے حفص الفرد کے ساتھ کامیاب مناظرے

کئے جن کے ذریعے اس کی بدعات کو طشت از بام کیا، آگے چل کر اسی میدان میں جس کی مثال سے تاریخ انسانی تقریباً عاجز نظر آتی ہے، اسی میں امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ اور امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کی خدمات پیش پیش ہیں، جو عقائدِ حقہ کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو کر ہر لعن طعن کے سامنے سینہ سپر ہو کر ایسے ڈٹے کہ عقائدِ باطلہ کے علم بردار انگشت بدانداں ہو کر ان کو دیکھتے ہی رہ گئے، کفر والحاد، زندقہ اور ارتداد کے خلاف مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی تحریک نے جہاں کفری تشریحات کو ختم کر دیا، وہاں ان کے آلۂ کار علمائے سوء کی تحریف و تدلیس کو ہر سو واشگاف الفاظ میں بیان کر کے اپنے خلفاء کے ذریعہ باطنی اصلاحی تحریک (جو کہ مکمل طور پر کتاب و سنت کی روشنی میں تھی) کو چار چاند لگا دیئے۔ نیز علمائے سرزمینِ ہند کی کلامی اور اعتقادی خدمات میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے صاحبزادوں، نواسوں اور مریدوں و شاگردوں کے کارنامے پائندہ تابندہ رہیں گے۔

الغرض جب بھی کفر و طغیان نے سر اُٹھایا، تو علمائے اسلام نے اس کی سرکوبی کو اپنا فرض منصبی قرار دے کر اپنے تن من، دھن کی قربانی دی، یہی وجہ ہے کہ جب انگریز ڈپلومیسی، معاشی اور تعلیمی میدانوں میں مسلمانانِ ہند کو شکست دے کر عقائد کی تبدیلی کیلئے اپنے عیسائی مشنریوں کو لایا، تو محسنِ اعظم حضرت مولانا رحمت اللہ کیرنوای رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء نے ان کے پاپاؤں کو ناکوں چنے چبوانے پر مجبور کر دیا اور وہ بوریہ بستر گول کر کے واپس اپنے مستقر کو چلے گئے، اسی طرح حجۃ اللہ فی الارض مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور ان کے قابلِ قدر رفقاء نے "میلہ خداشناسی" اور پنڈت دیانند سرشوتی کے سامنے اسلام کے حقائق کو نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کر کے حق کی خوشبو سے پورے ارضِ ہند کو معطر کیا۔

اور جب انگریز کی یہ پالیسی ناکام رہی، تو "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے تحت

مسلمانوں کے حصّے کر دیئے اور عقائدِ حقہ کی غلط تشریح کے لیے مختلف فرقے وجود میں لائے، تو علمائے دیوبند کے سپوتوں نے جہادی، تدریسی، سیاسی اور تبلیغی میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مناظروں، محاکموں ومباحثوں کے علاوہ تصنیف و تحقیق، افتاء و تالیف کے ذریعے بھی اس کام میں اپنا حصہ ڈال کر قادیانیت اور دوسرے فرقِ ضالہ و مبتدعہ کے عقائد واقوال اور اعمال وافعال سے پردے ہٹائے اور ان کے کفر وفسق کو واضح کر دیا۔

انگریزی سرپرستی میں جب قادیانیوں نے مختلف دعوے کرکے مسلمانوں کو اپنا پیروکار بنانا شروع کیا، تو اِن اکابرین نے قادیانیوں کو گمراہ فرقہ قرار دیا، مگر جب انکے عقائد ایمانی حدود سے تجاوز کرکے کفری سرحدوں کو چھونے لگے، تو حکومتِ وقت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے قادیانیوں کے کفر کا فتویٰ جاری کر دیا اور ان سے ہر قسم کے تعلقات قطع کرنے کا فیصلہ کر دیا۔

کلمہ، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ احکامات کا اقرار کرنے کے باوجود کفر و اسلام کے ان امتیازات پر کتابیں لکھ کر عام مسلمانوں کے ذہنوں سے اشتباہ کو ختم کر دیا، اِن میں مفتی غلام مصطفی امر تسری کشمیری کی کتاب "أحسن التقریر فی أحکام التکفیر" سر فہرست ہے، مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے قادیانیوں اور دیگر فرق ضالہ کی کفری تحاریف سے عرب دنیا اور علمائے ہندوستان کو اس پیش آمدہ فتنوں سے خبر دار کرنے کے لیے "ضروریاتِ دین" کے انکار کی بحث کو اپنی کتاب "إکفار الملحدین فی إنکار شیئ من ضروریات الدین" میں بیان کر دیا، امام المناظرین مولانا سید مرتضیٰ حسن رحمہ اللہ نے " تحقیق الکفر والإیمان" لکھ کر اس میں مزید اضافہ کر دیا، شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے مسلمان اور کافر کی وضاحت کے لیے "أحسن البیان فی تحقیق الکفر والإیمان" لکھا، یہ رسالہ ایک نہایت محققانہ کاوش تھی، جب کہ مذکورہ بالا

اُمور کی تلخیص واضافہ کر کے مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے " وصول الأفكار إلى أصول الإكفار" لکھی اور علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب نے ایمان وکفر کا معیاری رسالہ دارالعلوم سے ۱۹۵۳ میں قسط وار شائع کیا۔

یہاں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ علماءِ ہند کا یہ اقدام کچھ مخترع اور خود ساختہ نہیں بلکہ اس سے سینکڑوں برس قبل اُنہی کے روحانی آباء واجداد نے اس مسئلہ کو اپنے عصری انداز میں طشت ازبام کیا، ان میں سے حجۃ الاسلام امام ابو حامد غزالی رحمہ اللہ قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اپنی کتاب " فيصلة التفرقة بين الإسلام والزندقة" لکھی، اسی طرح علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ جنھوں نے " الإعلام بقواطع الإسلام" لکھ کر اس ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ نبھایا۔

علمی خدمت کے نام پر انگریزوں نے اُردو کی ترویج وترقی کے لیے مختلف ادارے قائم کر کے کتب تفسیر، حدیث، تاریخ وفقہ وغیرہ کتابوں کے اُردو تراجم علمائے کرام سے خدمتِ اُردو کے نام پر کرا کے فتنۂ استشراق کے لیے سامان بہم پہنچاتے رہے اور مستشرقین تحقیق وتخریج کے نام پر مغرب میں قرآن وحدیث، فقہ وتاریخ کی غلط ترویج کرتے رہے، تاکہ اہلِ مغرب کے اذہان میں اسلام کی حقیقی تصویر جاگزیں نہ ہو جائے اور اپنے مفتوحہ شہروں اور اطرافِ عالم سے مغرب میں آئے ہوئے سادہ لوح لوگوں کو تحقیق وتصنیف کے نام پر مذہب وملت سے گمراہ کر کے اپنے گماشتے بنائیں، تاکہ وہ لوگ دینِ اسلام کی غلط تشریح کر کے ان مفتوحہ شہروں کے مسلمانوں کو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم وتابعین رحمہم اللہ علیہم، علماء ومشائخ سے بد ظن کر کے جہاد کو بربریت، خلافت کو ظلم وجبر اور تصوف وعلم الکلام کو بے فائدہ قرار دیا جائے، ان کے ہاتھوں میں سیف وسنان کی بجائے ڈھول وطبل پکڑا یا جائے اور قرآن وحدیث، فقہ وکلام کو دہشت گردی قرار دے کر ان کی بجائے

میوزک وگیتار کو وقعت کی نظر سے دیکھیں اور شعائر دینیہ کو ضیاعِ اوقات یا اوہام و اغلاط بنائیں اور مغربی طرز حکمرانی کو آئیڈیل بنا کر دینِ جمہوریت کی پوجا پاٹ میں لگ کر عیسائیت کی طرح دین ومذہب کو عبادت گاہ ومسجد تک محدود کرا کے اسلام کو چند رسوم اور چند عبادات کا نام دیں اور پارلیمنٹ کو چند آزاد خیال اور مذہب بیزار لوگوں کے فیصلوں کا مسکن بنائیں اور پھر اُنہی فیصلوں کو قرآن وحدیث کے مقابلے میں آئین کے نام سے فرض وواجب کا مرتبہ دیں اور ان کے مقابلے کے پارلیمنٹ میں آئے ہوئے علمائے کرام کو ہر طرح کے طعن وتشنیع، ضد وتذلیل کا ہدف قرار دیں اور پھر من مانیاں کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی صریح نصوص میں مذکور حدود اللہ کو دُور اَز خیال سزائیں اور کالا قانون کہیں۔

اس سلسلے میں بھی اُنہی بوریا نشینوں نے جہاں سیف وسنان کو تھامے ہوئے قلم وزبان سے کلمہ حق کو بلند کیا، وہیں باشندگانِ برصغیر کو انگریزوں اور ان کے گماشتوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے وہ کارنامے سرانجام دیئے، جن کی تحریر کے لیے مستقل ضخیم جلدوں پر مشتمل کتابوں کی ضرورت ہے۔

اسی تسلسل میں فتنہ انکارِ حدیث کی صدا ہندوستان میں اُٹھی تو علمائے دیوبند نے عظمتِ حدیث کے جذبے سے سرشار ہوکر ولی اللہی طرز کی اتباع میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور ان کے دیگر شاگرد میدان میں نکلے اور فتنہ انکارِ حدیث کا دامن پوری مستعدی سے چاک کر کے علمائے مصر کو بھی اپنا ہمنوا بنایا، جس کی تفصیل سلطان المناظرین علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم ونفعنا بوجودہ وعلومہ نے اپنی کتاب "آثار الحدیث" کے ج ۲ ص ۴۳۸ پر خوب بیان کی ہے۔

ہمارے اِن اکابر نے عوام وخواص کے سامنے فتنہ انکارِ حدیث کی سرکوبی منبر و محراب کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف، افتاء وتدریس میں بھی جاری رکھی، اِن میں مولانا

مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی تدوینِ حدیث، مولانا کریم بخش مظفر گڑھی رحمہ اللہ کی ضرورتِ حدیث، مولانا مفتی رفیع عثمانی دامت برکاتہم کی کتابتِ حدیث، مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی حجیتِ حدیث، مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ کا مقدمہ ترجمان السنۃ، حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمہ اللہ کا ''حدیث رسول کا قرآنی معیار'' مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی ''انکارحدیث کے نتائج'' اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی ''فہم القرآن'' وغیرہ کتب سرفہرست ہیں، یہاں تک کہ عرب دانشوروں کی مفید کتابوں کے کامیاب اُردو تراجم کئے جس کی ایک مثال شیخ مصطفی سباعی رحمہ اللہ کی نفیس کتاب" السنة ومكانتها فى التشريع الإسلامي "کا وہ ترجمہ ہے جو مرکز علم و عمل بنوری ٹاؤن سے شائع شدہ ہے، میرے شیخ واُستاد، اُستاذالمحدثین مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی کتاب "کشف الباری" ج ا میں آپ اس فتنے کے خلاف کافی مواد دیکھ سکتے ہیں۔

کفر وشرک، الحاد وارتداد، بدعات وفسوق کے سامنے سد سکندری باندھنے والے یہی علمائے دین ہی تھے، جنہوں نے روکھی سوکھی کھاکر اور نرم گرم سے کنارہ کش ہوکر اور تزک واحتشام کو بالائے طاق رکھ کر دین محمدیہ ﷺ کی تشریحات کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اور تابعین عظام رحمہم اللہ علیھم کے نہج پر اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد اور اطرافِ عالم کے کونے کونے اور چپے چپے تک پہنچا کر ایمان واسلام اور اعمال وافعال کی وہی تعبیرات محفوظ انداز میں عملی صورتوں اور حقیقی مصداقات کے ساتھ من وعن یکے بعد یگرے معین اور مخصوص کردیں اور ان کے اُصول وضوابط، قواعد ونظائر وضع کرکے آئندہ آنے والے فتنوں کی سرکوبی کے لیے علمائے اُمت کے لیے رہنمائی کا سامان بہم رکھا، تاکہ کفر وضلال کے آنے والے لیڈر وکارکن زندقہ والحاد کی نئی خوشنما تعبیرات کے جھانسے میں

نصوص قرآنیہ اور فرامینِ نبویہ (علی صاحبها الصلاة والسلام) کے ارشادات کو معروف ومتواتر شرعی معانی سے نہ نکال سکیں اور نہ ہی اسلامی قوانین کی تشریحات وتوضیحات کے باب میں ایسی تاویلیں ذکر کریں، جو چودہ سو سالہ عرصہ میں کسی بھی عالم دین نے نہ کی ہو اور اگر کسی نے ایسا کیا، تو قرآنی اصطلاح اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ آدمی ملحد ٹھہرے گا۔

عصر حاضر میں اسی الحاد وبے دینی نے سیکولر ازم کا لبادہ اوڑھ کر حقوقِ انسانی، مساوات، آزادی، تحقیق وریسرچ، قانونِ دُولی اور تعلیم وتہذیب کے نام پر انسانوں کو روحانیت سے بیگانہ کرکے مادیت کا گرویدہ بنانا دین اسلام کے احکامات کو انسانی آزادی کے منافی قرار دے کر دین کو زندگی کے تمام شعبہ جات سے الگ کرنا سیکولر ازم کے بنیادی اہداف ہیں۔

مغربی بالا دستی کی بقاء کے لیے کج فکر مسلمانوں نے ڈارون کا "نظریہ ارتقاء"، فرائیڈ کا "نظریہ جنسیت" ڈارکایم کا "نظریہ عقلیت"، جان پول سارتر کا "نظریہ وجودیت"، آدم اسمتھ کا "کیپیٹل ازم" اور کارل مارکس کا "کمیونزم وسوشلزم" کی اتباع کرکے اُمتِ مسلمہ کو اسلام سے بے زار کیا اور مادیت پرستی کے بت کا گرویدہ بنا دیا، جس کی وجہ سے خلافت جیسی عظیم نعمت سے محروم ہوئے، اگرچہ ان بوریہ نشین علماء کرام نے ان کا بھی تعاقب کیا، جدید منکرِ اسلام فلسفے کی کمزوریاں ظاہر کرنے کے لئے ایک بہترین مثال کتاب " مؤقف العقل والعلم والعالم من رب العالمين إلى عباده المرسلين "کی دی جاسکتی ہے جو خلافت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام شیخ مصطفی صبری کے قلم سے ہے جس کو "کتاب القرن " کہاجاتاہے ،اگر ماہر اُردودان اس کا ترجمہ کریں تو دینی لٹریچر میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہو گا۔

؎شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات

سیکولر ازم کے ان مقاصد کی روشنی میں یہ کہنا بجاہو گا کہ تاریخ اسلامی میں اس سے بڑی مصیبت اُمت مسلمہ پر نہیں اُتری، جس کی وجہ سے مرد وزَن، چھوٹے بڑے اور جوان وبوڑھے سے ایمان کی نعمت تک بھی چھیننے کی کوشش ہوئی اور دین ومذہب، قرآن وسنت اور اکابر ومشائخ سے بد ظن کر کے بس صرف نام کے مسلمان باقی رہ گئے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی احکامات کی تضحیک وتذلیل، تمسخر وتبدل کرنے والوں کے بارے میں اپنے پیش رَو ائمہ دین، اکابر ومشائخ کی پیروی کرتے ہوئے از سرنو جائزہ لے کر سیکولر ازم کے متبعین کے بارے میں فقہی احکامات واضح کئے جائیں، اس کی نشاندہی فقیہ اُمت محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے بھی فرمائی تھی، آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قرآن کریم نے الفاظ کفر، نفاق، الحاد، ارتداد کو جو استعمال فرمایا ہے، تو جب تک روئے زمین پر قرآن کریم موجود رہے گا، یہ الفاظ بھی انہی معانی میں باقی رہیں گے۔ اب یہ علمائے اُمت کا فریضہ ہے کہ وہ اُمت کو بتلائیں کہ ان کا استعمال کہاں کہاں صحیح ہے اور کہاں کہاں غلط ہے؟ یعنی یہ بتلائیں کہ جس طرح ایک شخص یا فرقہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد مؤمن ہوتا اور مسلمان کہلاتا ہے اسی طرح ان ایمان کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے والا شخص یا فرقہ کافر اور اسلام سے خارج ہے، نیز علمائے اُمت کا یہ بھی فرض ہے کہ ان حدود وتفصیلات کو یعنی ایمان کے تقاضوں کو اور ان کے کفریہ عقائد واعمال وافعال کو متعین کریں، جن کے اختیار کرنے سے ایک مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، تاکہ نہ کسی مؤمن کو کافر اور اسلام سے خارج کہا جاسکے اور نہ کسی کافر کو

مؤمن و مسلمان کہا جاسکے، ورنہ اگر کفر و ایمان کی حدود اس طرح مشخص و متعین نہ ہوئیں تو دین اسلام بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا اور جنت و جہنم افسانے۔۔۔غرض یہ ہے کہ علماء پر-کچھ بھی ہو- رہتی دنیا تک یہ فریضہ عائد ہے اور رہے گا کہ وہ کافر پر کفر کا حکم اور فتویٰ لگائیں اور اس میں پوری پوری دیانت داری اور علم و تحقیق سے کام لیں اور ملحد و زندیق پر الحاد و زندقہ کا حکم اور فتویٰ لگائیں اور جو بھی فرد یا فرقہ قرآن و حدیث کی نصوص و تصریحات کی رو سے اسلام سے خارج ہو اس پر اسلام سے خارج اور دین سے بے تعلق ہونے کا حکم اور فتویٰ لگائیں، جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، قیامت نہ آجائے۔"

چنانچہ جس طرح ایمان و اسلام، اسلامی معاشرہ، اسلامی شعائر اور مسلمانوں کے دین و ایمان کو ملحدوں، افتراء پردازوں اور جاہلوں کی جارحیت سے بچانا علمائے حق اور فقہائے اُمت کے ذمہ فرض ہے، اسی طرح اُصول تکفیر کو بھرپور انداز سے واشگاف کرنا بھی ایک ضروری امر ہے، اُصول تکفیر پر پہلے بھی اکابر اُمت کی طرف سے قلم اُٹھایا گیا تھا، لیکن مسئلہ اُصولی، اعتقادی اِغلاق کی وجہ سے پھر بھی تشنہ رہا، اس ضرورت و تشنگی کو ہمارے محترم دوست، رفیق کار، فاضل نوجوان حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب نے پورا کیا اور نہایت عرق ریزی اور دقتِ نظری سے اس کو نبھایا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ فاضل مؤلف کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گوناگوں خصوصیات سے مالامال کیا، مولانا عاجزی وانکساری کے پیکر ہے اور علمی و کتابی آدمی کا درست مصداق ہے، میں جب بھی ان سے ملا، کسی مسئلہ فقہیہ، کلامیہ، نحویہ وغیرہ پر بحث و تمحیص کرتے ہوئے پایا، فاضل مؤلف نے اس سے پہلے بھی ایک بہت وقیع قضیہ پر قلم اُٹھایا ہے جس کا عنوان "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہے جو راقم کے مقدمہ کے ساتھ چھپ بھی چکا ہے، زیر نظر

کاوش میں بھی فاضل مؤلف نے اپنی جستجو، قابلیت اور مطالعہ شناسی کے گوہر بکھیرے ہیں۔

مسئلہ کی نزاکت اور باریک بینی کی وجہ سے میں نے تقریباً بالاستیعاب پڑھ ڈالا، اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب پڑھنے سے پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنے بہترین مباحث کو اس کتاب میں ترتیب کے ساتھ سمو دیا گیا ہے، میں نے جیسے ہی تحریر پڑھنی شروع کی تو مجھے اپنی طرف مائل کر دیا اور دوسری مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اس تحریر سے کافی مستفید و محظوظ ہوا، دورانِ مطالعہ جہاں جہاں میں نے کوئی بات قابلِ اصلاح سمجھی تو اسے تبدیل کر دیا اور فاضل مؤلف کو مشورہ بھی دیتا رہا، ان کی رحابت صدری اور وسیع ظرفی تھی کہ اس کمترین خلائق کے مشوروں کو قبول فرما کر ان پر عمل کیا، میرے خیال میں جدید لٹریچر میں یہ کتاب ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ان کی اس کتاب کو قبولیت عطا فرما کر اُمت مرحومہ کے لیے ذریعۂ نجات اور ہمارے اور ان کے لیے وسیلہ آخرت میں خلاصی کا سبب بنائے۔آمین یاربّ العٰلمین

محمد سجاد الحجابی

۶/ربیع الاول ۳۸ھ

پیش لفظ

نحمده ونصليّ على رسوله الكريم، أما بعد:

اُمت مسلمہ تاریخ کے جن کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے اس پر ہر درد دل رکھنے والا مسلمان اشکبار ہے، ہر دن طلوع ہوتے ہی سورج کی کرنیں کسی نئی مصیبت وآزمائش کی نوید سناتی ہیں، رات کے اندھیرے اس بے چاری اُمت کے نہال بدن پر مصائب کے پہاڑ توڑ ڈالتے ہیں، عالم عرب خصوصاً انبیاء کرام علیہم السلام کی سرزمین شام کے اندر ہونے والے نت نئے مظالم اتنی عروج پر ہیں کہ جس نے پوری دنیا کے مسلمانوں کا جینا حرام کردیا ہے، اس صورتِ حال میں جہاں اُمت کی اپنے دین ومذہب سے بے رُخی وغفلت وغیرہ اسباب وعناصر کا دخل ہے وہیں کفر واسلام اور اس کے واقعی حدود وقیود نہ پہچاننے کا بھی اس میں بڑا کردار ہے۔

ایمان وکفر کا مسئلہ دینِ اسلام بلکہ کسی بھی دین ومذہب کی پہلی کڑی ہوتی ہے کہ اس کی حدود وقیود، اس کی حمایت کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے درمیاں خط فاصل واضح کیا جائے، اس لئے اس دینِ فطرت نے روزِ اوّل ہی سے اس پر بھرپور توجہ دی ہے اور اس کی حدود وقیود کو واضح کررکھا ہے۔

ایک طرف تو دینِ حق کی اس قدر توجہ اور عنایت ہے، دوسری طرف اس کے ماننے والے عالم اسلام کی مجموعی صورتِ حال ہے، جس پر غور کرنے کے بعد ہر دردِ دل رکھنے والا مسلمان انگشت بدندان ہے، ایک طرف وہ جماعت ہے جس کے خیال میں اپنے

سوا ہر مخالف کافر ہے، چاہے وہ کوئی اور کیسا ہی کیوں نہ ہو، اگر ان کے ساتھ ظنی مسائل میں بھی کوئی اختلاف کرے تو بر ملا اس کو کافر و مشرک قرار دیتے ہیں، بلکہ کئی بار تو محض طرزِ فکر یا اندازِ عمل اور مزاج کے خلاف کرنے کی وجہ سے اس قسم کے فیصلہ کئے جاتے ہیں، ان کی جرأت و بے باکی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کی ڈکشنری میں لفظ کفر سے ہلکا کوئی لفظ موجود ہی نہیں اور ان کے خیالات و طرزِ عمل ہی وہ واحد سفینہ نجات ہے جس سے ذرہ برابر نکلنا ہی طوفانِ کفر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غرق آب ہونے کے مترادف ہے۔

اسی افراط کے بالکل متوازی کنارے پر کچھ مسلمان ہیں جو کسی واقعی کافر کو کافر کہنے سے بھی نالاں ہوتے ہیں، ان کی سخاوت کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرے جس کی وجہ سے وہ تمام فقہائے کرام اور متکلمین کے اتفاق سے کافر ہوجاتا ہو اور اس کی تکفیر کرنی ضروری ہوجاتی ہو تو بھی یہ لوگ اپنی بے پناہ فیاضی سے اس کو مسلمان قرار دینے اور خیال کرنے پر ڈٹے رہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اب دنیا میں کفر کے فیصلہ کا اختیار ہمیشہ ہمیشہ ایسا ہی سلب ہوا جس طرح حضور ﷺ کی تشریف آوری سے مزید نبوت کے دروازے کو تالا لگا ہے۔

اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ کفر و تکفیر کا فیصلہ نہایت ہی احتیاط و نزاکت کا متقاضی ہے، اس میں ذرہ بے احتیاطی بھی خطرناک بلکہ نہایت خطرناک ہے، یہ ایک ایسی غلطی ہے جو صرف اپنی جگہ تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس کی بنیاد پر دینی احکام کا ایک طویل سلسلہ مرتب ہوتا ہے جس میں دنیا و آخرت کے بیسیوں احکام پروئے ہیں، اس لئے اس باب میں ایک غلطی بھی بہت سی غلطیوں کی سبب ہے، کسی کو کافر کہنا صرف زبانی بات ہی نہیں، بلکہ اس کا مطلب اس کو ان تمام حقوق سے محروم کرنا ہے جو خدا اور سول کی طرف سے ایک مسلمان کے لئے ثابت ہوتے ہیں، اب اس کے جرم عظیم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب " الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ " میں علامہ ابو المعالی رحمہ اللہ سے نقل فرمایا کہ:

إن إدخال كافر في الملة و إخراج مسلم عنها عظيم في الدين.

"کسی کافر کو ملتِ اسلام میں داخل کرنا اور کسی مسلمان کو اس سے نکالنا دینی لحاظ سے بڑا (اور نہایت نازک) معاملہ ہے۔[۱]"

جغرافیائی، علاقائی، لسانی، نسلی وغیرہ ہزاروں فاصلوں کے باوجود بھی پوری اُمت مسلمہ جسم واحد کی مانند ہے، اگر کہیں جسم میں کوئی عضو ایسا سڑ جائے کہ اس کی بیماری متعدی ہو، دیگر اعضاء وجوارح کا اس سے متاثر ہونے کا خدشہ یقینی ہو جائے تو اس جسم کی سلامتی کا واحد علاج یہی تجویز ہوتا ہے کہ اس عضو کو جسم سے بروقت کاٹ کر جدا کر لیا جائے، اگر مریض پر نرمی و شفقت کے خیال سے اس میں تاخیر کی جائے تو اس کا جو کچھ نتیجہ ظاہر ہو گا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اسی طرح اگر اسی جسم انسانی کے اندر نامناسب اور ناپاک اور غیر موزوں خوراک داخل کی جائے تو بھی یہ جسم متوازن نہیں رہ سکتا، بلکہ اس احمقانہ حرکت کے بعد اگر کچھ زندگی نصیب بھی ہو جائے تو بھی ایسی اجیرن ہو گی کہ اس کے مقابلہ میں موت بھی بھلی معلوم ہو گی۔

بس یہی کچھ صورتِ حال اسلام اور اُمتِ مسلمہ کی بھی ہے، اگر شریعت کے مقرر کردہ اُصول وضوابط کے مطابق کوئی شخص واقعی کافر ہے تو اس کو زبردستی اسلام کے

---

[۱] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، فصل فى تحقيق القول فى إكفار المتأولين، ج۲ ص۲۷۷.

اندر گر دانا پوری ملتِ اسلامیہ کو نقصان پہنچانا ہے اور اگر ان مقرر کردہ قواعد کے مطابق کسی کو کافر قرار دینا جائز نہ ہو تو اس کو خواہ مخواہ کافر قرار دینا ایسا ہی احمقانہ جرم ہے جیسا بلا ضرورت کسی انسان کا عضو کاٹا جائے، محض گناہِ کبیرہ کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا ایسا ہی ہے جیسا کسی معمولی پھوڑے نکل آنے کی وجہ سے عضو کاٹا جائے، حالانکہ اس کے علاج کے لئے سہل اور مفید تدبیریں موجود ہیں۔

موضوع کی اسی نزاکت کی وجہ سے عرصہ دراز سے تلاش وانتظار میں تھا کہ علم وعمل سے مالا مال کوئی شخصیت اس موضوع پر ایسا جامع تحقیقی کام کریں، جس سے اس موضوع کے متعلق پائے جانے والے تمام اشکالات وتشنگیاں دور ہو جائیں، کیونکہ عالم اسلام کو موجودہ انتشار، خلفشار اور کسمپرسی کے عالم میں اس کی شدید ضرورت ہے۔

اس باب میں حضرت العلامۃ مولانا انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "إكفار الملحدين" کو خوب شہرت حاصل ہے، لیکن حضرت کے پیشِ نظر تکفیر کے اُصول وقواعد کو جمع کرنا نہیں تھا، بلکہ کتاب لکھنے کا اصل باعث یہ بنا تھا کہ قادیانیت، ان کے باطل عقائد اور ضروریاتِ دین میں ان کی بے جا تاویلات کا پردہ چاک کیا جائے، اس مقصد کے لئے یہ کتاب انتہائی مفید ثابت ہوئی، لیکن چونکہ مقصود صرف یہی کچھ تھا، اس لئے تکفیر کے تمام اُصول وضوابط سے تعرض بھی نہیں فرمایا، ورنہ اگر حضرت رحمہ اللہ اس موضوع پر کچھ لکھتے تو آج کسی کو لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

اس کے علاوہ اردو زبان میں "اُصولِ تکفیر" کے نام سے مولانا پیر محمد چشتی صاحب کی بھی ایک کتاب دستیاب ہے[۱]، یہ کتاب اگر حشو وزوائد، بے جا تعصب، ردّ و قدح میں

[۱] ابھی تقریباً سال پہلے انکا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت نصیب فرمائے۔

حد سے غلو وافراط وغیرہ کمزوریوں سے خالی ہوتی اور ان اُمور میں توجہ واستعداد صرف کرنے بلکہ یوں کہئے کہ ضائع کرنے کی بجائے خود اُصولِ تکفیر ہی پر پوری توجہ مرکوز رکھی ہوئی ہوتی تو اُمید کی جاسکتی تھی کہ کسی حد تک یہ کتاب اُمت کے حق میں مفید ثابت ہوتی۔

لیکن اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ ان تمام عناصر کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں جابجا اکابرینِ ہند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، رحمہم اللہ علیہم وغیرہ حضرات پر کفر کے فتوے داغے گئے ہیں، کفریہ اُمور کی مثال کے طور پر ان حضرات کی عبارات نقل کر کر کے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُنہوں نے متفقہ طور پر التزام کفر کا ارتکاب کیا ہے جس کے بعد ان کو کافر قرار دینا ضروری ہے، اس سے بسا اوقات قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ کتاب کا مقصود اسی افسوسناک تسلسل کو دُہرانا ہے جو آج سے تقریباً ایک صدی پہلے "حسام الحرمین" کے نام سے تاریخ کے سیاہ صفحات میں ثبت ہے۔

جب تلاش بسیار کے باوجود اس پر کوئی ایسا جامع کام نظر نہیں آیا، ایک آدھ جگہ اس پر جو محنت ہوئی بھی، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں، وہ اس طرز کی نہیں کہ ملت اسلامیہ کی درپیش ضرورت پوری کرسکے، کئی سالوں کے انتظار اور تلاش کے باوجود جب بات نہ بنی تو بالآخر اللہ کا نام لے کر اس کام کی ابتدا کی گئی۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ اس کو کل پانچ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اوّل میں ایمان وکفر کی لغوی واصطلاحی تحقیق، دونوں کے درمیان نسبت، ایمان کی شرائط اور کفر کی قسمیں ذکر ہیں۔

باب دوم کے اندر تکفیر کے باب میں ہونے والی افراط وتفریط کی نشاندہی، اس کے نقصانات، اور قرآن وسنت اور ائمہ اسلام کی روش پر اس باب میں حد اعتدال پر رہنے

کے مختلف مظاہر کی تفصیل ذکر کی گئی۔ اس ضمن میں اہلِ قبلہ اور ان کی تکفیر کا مسئلہ، گناہ کبیرہ کی بنیاد پر کسی کو کافر قرار دینے کا مسئلہ اور فقہاء کرام کے ذکر کردہ الفاظ کفر کی بناء پر تکفیر کا حکم لگانے کی تفصیلات بیان کی گئیں ہیں۔

باب سوم میں کفر و تکفیر کے ارکان، مکفِّر (فاء کے کسرہ کے ساتھ)، مکفَّر (فاء کے فتحہ کے ساتھ) کے اعتبار سے اس کی شرائط اور دنیا و آخرت میں اس پر متفرع ہونے والے مختلف احکام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں تکفیر مطلق اور تکفیر معیّن، تکفیرِ فرد اور تکفیرِ جماعت/طائفہ، موانع تکفیر اور تاویل کے معتبر ہونے کی شرائط بھی ذکر کی گئی ہیں۔

باب چہارم میں ضروریاتِ دین کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا اور یہ تفصیل بھی ذکر کی گئی کہ مدارِ تکفیر صرف ضروریاتِ دین کا انکار ہے یا اس کے ساتھ قطعیاتِ دین کا انکار بھی کفر ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ قول و عمل کے موجبِ کفر بننے کا ضابطہ، استحلال و استخفاف کے موجبِ کفر ہونے کی شرائط بھی زیر بحث آئیں اور آخر میں تکفیر کا جامع اور منضبط ضابطہ بھی تحریر کیا گیا۔

باب پنجم میں سیکولرازم کی تاریخ، اہداف و مقاصد، اس کے متعلق علماء اُمت کے انفرادی و اجتماعی آراء اور اس کا شرعی حکم تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

پیش لفظ کو ختم کرنے سے پہلے میں حضرات اہلِ علم سے بصد ادب یہ عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ ایمان و کفر اور اس کی حدود و قیود متعین کرنے کا مسئلہ جس قدر دِقّت طلب اور نزاکت کا حامل ہے، اسی قدر موجودہ دور میں اس کی اہمیت و ضرورت بھی کچھ کم نہیں ہے، پھر یہ ضرورت بھی کسی خاص فرد یا کسی ایک مکتبہ فکر کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ جب مسئلہ ہی ایمان و کفر کی حدود و معیارات واضح کرنے کا ہے تو وحدت کی اس

سنہری لڑی میں پروئے ہوئے تمام حضرات پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے بقدر اس کی حفاظت کریں، اسی خدمت کے پیش نظر اس کتاب کی اشاعت لازم ہوئی۔

میں نے اس کتاب کی تیاری میں اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ کوئی بات بے دلیل ذکر نہ ہو، لیکن باین ہمہ مجھے اس کے مضامین کے سو فیصد درست ہونے کا دعویٰ ہے نہ اس کو حرف آخر کہنے کا خیال، بلکہ کھلے دل سے اعتراف ہے کہ اس نازک موضوع کے لئے جس قدر علم واطلاع، پختگی و تجربہ، تقویٰ و تدین اور فصاحت و بلاغت کی ضرورت ہے، میں اس سے سراسر محروم ہی محروم ہوں، اس لئے بہت سی غلطیاں ہو چکی ہوں گی، اگر کسی صاحبِ علم کو اس میں کسی بھی قسم کی کوئی کمزوری، غلطی یا کوتاہی نظر آئے تو براہ کرم اس ناکارہ کو ضرور متنبہ فرمائیں، جو غلطیاں سالوں یا صدیوں بعد انتشار وافتراق کا ذریعہ بن سکتی ہیں، ان کو اگر ابھی سے بروقت نمٹایا جائے تو بے چاری اُمت مسلمہ مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ سکے گی ورنہ ماضی کی تاریخ میں عبرت کی ہزار مثالیں موجود ہیں۔

ربّ کریم کے بے حد وحساب حمد وشکر کے بعد میں ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری سے لے کر طباعت تک کسی بھی طرح اس ناکارہ کے ساتھ تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو دین ودنیا میں بہترین جزائے خیر عطا فرمائیں۔

ناکارہ خلائق: عبید الرحمن
یکم ربیع الاول ۳۸ھ

دیباچہ طبع ثانی

یہ "اُصولِ تکفیر" نامی اس کتاب کی دوسری اشاعت ہے، پہلی اشاعت آج سے کئی سال پہلے منظرِ عام پر آئی تھی، تھوڑے ہی عرصہ میں وہ طباعت ختم ہو گئی اور نئی اشاعت کی ضرورت محسوس ہوئی، مختلف احباب کی طرف سے کچھ تقاضا بھی شروع ہوا، لیکن طباعت واشاعت جیسے صبر آزما کام کی خود ہمت نہیں ہو رہی تھی، اور اس کے علاوہ اسباب میسر نہیں تھے۔

کتاب میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی، البتہ پہلی طباعت میں اُردو کی کچھ کمزوریاں باقی رہ گئیں تھیں، اس لئے ہمارے ایک مخلص کرم فرما مولانا مؤمن شاہ صاحب زید مجدہ نے بڑی دقت اور جانفشانی کے ساتھ نظر ثانی کر کے اردو کی اصلاح کرنے کی پوری کوشش فرمائی اور اُمید یہ ہے کہ بڑی حد تک یہ کوشش کامیاب ثابت ہو گی ان شاء اللہ۔ اسی طرح کتاب کے آخر میں ایک باب "مسئله تحكيم بغير ما أنزل الله" کا اضافہ کیا گیا جو پہلی اشاعت کے وقت شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔

پہلی اشاعت کی طرح اس موقع پر بھی اہلِ علم کی خدمت میں عاجزانہ درخواست ہے کہ اگر اس کتابچہ میں کوئی علمی یا لسانی سقم نظر آئے یا اس کے علاوہ کوئی قابلِ اصلاح پہلو سامنے آئے تو ضرور اس ناکارہ کو مطلع فرمائیں، کیونکہ موضوع بڑی نزاکت واہمیت کا حامل ہے جس میں معمولی سی غلطی بھی بڑے مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

ناکارہ: عبید الرحمٰن، مردان

۲۱ ربیع الاول ۴۴ھ

بابِ اوّل

- ❖ ایمان کی لغوی اور اصطلاحی تعریف
- ❖ کفر کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق
- ❖ ایمان اور کفر کے درمیان نسبت
- ❖ اُصولِ دین
- ❖ شرائطِ ایمان
- ❖ کفر کی مختلف اقسام اور متنوع صورتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایمان کی لغوی

لغت میں لفظ ایمان دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

ا۔ "ایمان" امن سے "باب افعال" کا مصدر ہے، "امن" مطمئن ہونے اور بے خوف ہونے کو کہا جاتا ہے۔ باب افعال میں استعمال ہونے کی وجہ سے چونکہ عام طور پر فعل متعدی ہو جاتا ہے، اسلئے اس لحاظ سے اس کا معنیٰ ہے کسی کو امن دینا، بے خوف کرنا، کسی کو اعتماد ویقین دلانا، اس معنیٰ کے لحاظ سے ایمان کو ایمان اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے اسلام قبول کرنے والا مخاطب کو اس بات کا اطمینان دلاتا ہے کہ میں تکذیب نہیں کروں گا۔

نیز باب افعال کی ایک خاصیت "تصییر" بھی ہے یعنی صاحبِ ماخذ بننا مثلاً " ألحم زید" کا معنیٰ ہے کہ زید صاحب لحم بنا یعنی موٹا ہو گیا، اس لحاظ سے ایمان کا معنیٰ ہے "صاحبِ امن بننا" اور اس خاصیت کی بناء پر ایمان کو ایمان اس لئے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں جب تک انسان اسلام قبول نہیں کرتا، اس وقت تک اس کی جان ومال مامون ومحفوظ نہیں، اسلام قبول کرنے سے ہی وہ معصوم بن جاتا ہے، اسلئے اسلام میں داخل ہونے کو ایمان کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایمان کا دوسرا معنیٰ "تصدیق" ہے یعنی کسی کو سچا سمجھنا، اس کی توثیق کرنا، اس کی طرف سچائی کی نسبت کرنا، چونکہ اس معنیٰ میں کسی کی "تصدیق" کرنے کی وجہ سے خود کی

بھی حفاظت ہو جاتی ہے اور مخاطب بھی مطمئن ہو جاتا ہے، اسلئے اس مناسبت کی وجہ سے تصدیق کو ایمان کہا جانے لگا گویا یہ " تسمية الشئ باسم مسببه "کے قبیل سے ہے۔

بعض متکلمین نے اس کو لغوی معنیٰ ماننے سے انکار فرمایا، لیکن بہت سے محققین کے نزدیک خود لغت کے اندر بھی ایمان تصدیق کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

علامہ احمد بن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

(أمن) الهمزة والميم والنون أصلان متقاربان: أحدهما الأمانة التي هي ضد الخيانة، ومعناها سكون القلب، والآخر التصديق.[1]

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا کہ تصدیق ایمان کا لغوی معنیٰ ہے، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

(والإيمان) في اللغة التصديق، أي إذعان حكم المخبر وقبوله وجعله صادقاً، إفعال من الأمن، كان حقيقة آمن به آمنه من التكذيب، والمخالفة.

"ایمان لغت میں تصدیق کرنے کو کہا جاتا ہے (تصدیق کرنے کا مطلب) خبر دینے والے کی بات کا یقین کرنا، قبول کرنا اور اس کو سچا سمجھنا ہے، باب افعال کا صیغہ ہے (اور اس کو ایمان اس لئے کہتے ہیں کہ) گویا ایمان لانے والے نے تکذیب و مخالفت سے مطمئن کر دیا۔"[2]

---

[1] مقاييس اللغة، باب الهمزة والميم وما بعدهما في الثلاثي، ص١٣٣.

[2] شرح العقائد النسفية ص: ٦٩

اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس نکتہ پر بحث فرمائی ہے، اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ایمان ان دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے، دونوں اس لفظ کے حقیقی معانی ہیں، مگر چونکہ اس لفظ کا اصل مادہ امن ہی ہے اور اس لحاظ سے پہلے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، دوسرے معنیٰ میں اسی پہلے معنیٰ کی مناسبت سے استعمال ہوا کہ چونکہ تصدیق کرنے کے نتیجہ میں تکذیب سے امن ہو جاتا ہے، اس مناسبت سے تصدیق کو بھی اہلِ لغت نے ایمان کہنا شروع کر دیا، گویا پہلا معنیٰ حقیقی اور دوسرا مجازی ہے۔[۱]

اصطلاحی تعریف

ایمان کی اصطلاحی تعریف، علم حدیث اور علم کلام دونوں علوم کا ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، اس میں مختلف اقوال ہیں، ہر جماعت نے ایمان کی تعریف بھی اپنے مزعومات کے سانچے میں ڈھال دی ہیں، لیکن چونکہ اس تحریر کا اصل مقصود اہلِ سنت والجماعت یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ کے ایمان و تکفیر کے قواعد واُصول کی وضاحت کرنا ہے، اس لئے ان حضرات کے علاوہ دیگر فرقوں اور مکاتبِ فکر کی تعریفات سے قصداً اعراض کیا جاتا ہے، یہاں صرف اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مسلک کے مطابق ہی اس مسئلہ کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

حضراتِ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا مؤقف

لفظ "ایمان" کا لغوی معنیٰ جو اَبھی تحریر کیا گیا، شریعت میں بھی اس معنیٰ (تصدیق)

---

[۱] لاحظ النبراس، ص ۲٤٥-۲٤٦

کالحاظ رکھا گیا تاہم اس میں چند قیودات لگائی ہیں، چنانچہ علامہ عضد الدین الایجی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۵۶ھ) اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأما في الشرع وهو متعلق ما ذكرنا من الأحكام فهو عندنا وعليه أكثر الأئمة كالقاضي والأستاذ التصديق للرسول فيما علم مجيئه به ضرورة فتفصيلا فيما علم تفصيلا و إجمالا فيما علم إجمالا.

"ہمارے اور دیگر اکثر ائمہ کرام کے نزدیک ایمان شریعت کی اصطلاح میں ان اُمور میں حضور ﷺ کی تصدیق کا نام ہے جو آپ ﷺ سے بداہت کے ساتھ ثابت ہوں، تفصیلی اُمور میں تفصیلی تصدیق کرنا اور اجمالی اُمور میں اجمالی تصدیق کرنا ضروری ہے۔"[۱]

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۹۳ھ) بھی یہی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعلم أن الإيمان في الشرع: (هو التصديق بما جاء به من عند الله تعالىٰ) أي تصديق النبي عليه السلام بالقلب في جميع ما علم بالضرورة مجيئه به من عند الله تعالىٰ إجمالاً-[۲]

فوائد قیود

۱-التصديق للرسول:

لفظ "تصدیق" کا استعمال تین طرح ہوتا ہے:

---

[۱] المواقف، المقصد الأول في حقيقة الإيمان، ج۳ ص۵۲۷.

[۲] المصدر السابق

الف: منطقی تصدیق: علم **منطق** کی اصطلاح میں تصدیق" معرفت اور ادراک نسبت" کا نام ہے یعنی کسی بھی جملہ (قضیہ) کے دونوں طرفوں کے درمیان نسبت کا ادراک۔

ب: لغوی تصدیق: کسی کی طرف سچائی کی نسبت کرنا یعنی کسی کو سچا کہنا۔

ج: شرعی تصدیق: شریعت میں ان دونوں اُمور کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کی لائی ہوئی تمام تعلیمات کو تسلیم و قبول بھی کیا جائے۔

گویا شریعت میں تصدیق کے معتبر ہونے کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں:

(۱) دل میں معرفت۔

(۲) حضور ﷺ کو صادق سمجھنا۔

(۳) حضور ﷺ کی لائی ہوئی تمام ثابت شدہ تعلیمات کو دل و جان سے تسلیم کرنا۔

یہاں ایمان کی تعریف میں جو لفظ تصدیق مذکور ہے، اس سے یہ آخری تصدیق ہی مراد ہے، ایمان معتبر ہونے کے لئے یہی تصدیق ضروری ہے، محض لغوی یا منطقی تصدیق ہرگز کافی نہیں۔

چنانچہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ليس حقيقة التصديق أن يقع في القلب نسبة الصدق إلى الخبر أو المخبر من غير إذعان وقبول، بل هو إذعان وقبول لذلك بحيث يقع عليه اسم التسليم على ما صرح به الإمام الغزالي. وبالجملة هو المعنى الذي يعبر عنه بالفارسية بكرويدن.

"تصدیق صرف اس کا نام نہیں کہ دل میں کسی بات یا اس کے کہنے والے کو سچا جانے، بغیر کسی قبولیت کے، بلکہ تصدیق کسی بات پر اس طور پر یقین رکھنے اور اعتماد کرنے کو کہا جاتا ہے کہ اس کو مکمل طور پر تسلیم کرے جیسا کہ امام غزالی رحمہ

اللہ نے اس کی صراحت کی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں تصدیق سے مراد وہ چیز ہے جس کو فارسی زبان میں "گرویدن" کہا جاتا ہے۔"[۱]

۲۔ تعریف میں دوسری اہم قید لفظ "بالضرورۃ" کی ہے۔

لفظ ضروری کے مختلف استعمالات ہیں اور ہر استعمال میں اس کا ایک الگ اور خاص معنیٰ ہوتا ہے، کبھی یہ "علم اکتسابی" کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا معنیٰ ہوتا ہے: وہ علوم جو مخلوق کی قدرت واختیار سے باہر ہو۔ کبھی یہ لفظ استدلالی کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور اس صورت میں اس سے مراد وہ علوم ہوتے ہیں جو فکر و نظر کو بروئے کار لانے کے بغیر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی بدیہی کے مترادف کے طور پر بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ایمان کی تعریف میں اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ اس میں متکلمین کی تین مختلف آراء ہیں:

۱۔ ضروری یہاں استدلالی کے مقابلے میں ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں غور و فکر کے بغیر محض حضور ﷺ کی زبان مبارک سے براہِ راست سنے یا تواتر کے ساتھ حضور ﷺ سے ثابت ہوں، ان کی تصدیق کی جائے اور ان پر ایمان لایا جائے۔

۲۔ بعض متکلمین کی رائے یہ ہے کہ یہاں ضرورت بمعنیٰ یقین ہے یعنی جو احکام حضور ﷺ سے یقینی طور پر ثابت ہوں، ان کی تصدیق ایمان کہلاتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کا انکار کرے جو حضور ﷺ سے ثابت ہو لیکن ثبوت یقینی نہ ہو بلکہ ظنی ہو تو اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

---

[۱] المصدر السابق.

۳۔ جمہور متکلمین کی رائے یہ ہے کہ یہاں ضرورت سے سابقہ دونوں معانی مراد نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ شریعت کے جو احکام اس طور پر عام ہوں کہ عوام وخواص کو اس کا دینی حکم یا اسلامی عقیدہ ہونا معلوم ہو تو ان جیسے احکامات کی تصدیق ایمان کیلئے شرط ہے، اگر کوئی شخص کسی ایسے حکم کا انکار کرے جس کا دینی اور اسلامی ہونا عوام وخواص کو معلوم ہو تو وہ مسلمان نہیں کہلائے گا، کیونکہ ان جیسے اُمور کی پورے طور پر تصدیق کئے بغیر ایمان قابلِ اعتبار نہیں۔

علامہ ابو البقاء کفوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

الضروري المقابل للاكتسابي: هو ما يكون تحصيله مقدورا للمخلوق، والذي يقابل الاستدلالي هو ما يحصل بدون فكر ونظر في دليل-

"ضروری جب استدلال کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، تو اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا مخلوق کی قدرت میں نہ ہو اور جب یہ استدلالی کے مقابل استعمال ہوتا ہے تو اس سے ہر وہ بات مراد ہوتی ہے جو دلیل میں غور وفکر کئے بغیر حاصل ہو جائے۔"[۱]

علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ تینوں معانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قيل أراد بالضروة ما يقابل الاستدلالي فالضروري كالمسموع من فم رسول الله صلي الله تعالیٰ عليه وسلم أو المنقول عنه

[۱] الكليات،ج۱ص۵۷٦

بالتواتر كالقران والصلوات الخمسة وصوم رمضان وحرمة الخمر والزنا، وقيل أراد بالضرورة ما اشتهر بين الخاصة والعامة ضروريا كان الحكم أو استدلاليا۔۔۔وكتب الشارح علي هوامش الكتاب أن المراد بالضرورة اليقين-[۱]

"بعض حضرات نے کہا کہ ضرورت استدلالی کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، ضروری کی مثال جیسے کوئی بات حضور ﷺ سے زبانی سنی یا ان سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئی جیسا کہ قرآن کریم، پنج وقتہ نمازیں، رمضان کا روزہ، شراب وزنا کا حرام ہونا، اور بعض حضرات نے کہا کہ ضرورت سے مراد وہ احکام ہیں جو خواص اور عوام (دونوں) کے درمیان مشہور ہو چکے ہوں، چاہے وہ حکم (اپنی اصل کے لحاظ سے) ضروری ہو یا استدلالی، اور شارح نے لکھا ہے کہ ضرورت سے مراد یقین ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی تعریف میں لفظ "ضرورۃ" کے بارے میں متکلمین کی یہ تینوں آراء ہیں، لیکن آخری قول ہی راجح اور درست ہے کہ اس سے مراد صرف یقین نہیں، اور نہ ہی یہ استدلالی کے مقابلہ میں استعمال ہے، بلکہ مقصود ان احکامات کی تصدیق کرنا ہے جو اس قدر مشہور ہوں کہ عوام وخواص سب اس کو دینی حکم کے طور پر جانتے ہوں، چنانچہ اکثر حضرات متکلمین نے اسی معنیٰ کو بیان کرنے پر اکتفاء فرمایا ہے۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

تصديق النبي فيما علم مجيئه به بالضرورة أي فيما اشتهر كونه

---

[۱]النبراس، مبحث الإيمان، ص۲٤۹

من الدين بحيث يعلمه العامة من غير افتقار إلى نظر واستدلال كوحدة الصانع ووجوب الصلاة وحرمة الخمر ونحو ذلك-

(ایمان) حضور ﷺ کی ان باتوں میں تصدیق کرنے کو کہا جاتا ہے جو آپ ﷺ سے "ضرورت" کے ساتھ ثابت ہیں۔ "ضرورت" (کے ساتھ ثابت ہونے) سے مراد وہ اُمور ہیں جن کا دینی حکم ہونا اتنا مشہور ہو کہ عام لوگ اسے بغیر کسی دلیل کے جانتے ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کا ایک ہونا، نماز کا واجب ہونا، شراب کا حرام ہونا، وغیرہ"[۱]

شرح المواقف کے حاشیہ پر علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قوله:(فيما علم مجيئه به ضرورة) أي فيما اشتهر كونه من الدين بحيث يعلمه العامة بلا دليل.

"ایمان کی تعریف میں ضروریاتِ دین سے مراد وہ اُمور ہے جس کا دین میں سے ہونا اتنا مشہور ہو چکا ہو کہ عام لوگ بھی بے دلیل اس کو جانتے ہوں۔"[۲]

حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی ضروری اور ضروریاتِ دین کا یہی مفہوم بیان فرمایا اور اسی پر تفصیلات مرتب فرمائیں۔[۳]

---

[۱]شرح المقاصد في علم الكلام، ج۲ص۲٤۷.

[۲] شرح المواقف، المرصد الثالث، المقصد الأول،ج۸ص۳٥۲.

[۳] إكفار الملحدين فى ضروريات الدين، ص٤۱، ٤۲.

متکلمین کا ایمان کی تعریف سے متعلق ایک اہم نکتہ

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ایمان میں صرف ان احکام کی تصدیق کافی نہیں جو مندرجہ بالا اصطلاح کے مطابق "ضروریاتِ دین" میں داخل ہیں، بلکہ دینِ اسلام کے تمام احکام کی اجمالی یا تفصیلی طور پر تصدیق کرنا ضروری ہے، اور حضرات متکلمین ایمان کی تعریف میں جو "بالضرورۃ " کی قید ذکر کرتے ہیں، یہ دراصل ان کی اصطلاح ہے، کیونکہ علم کلام میں بنیادی طور پر قطعیات ہی سے بحث کی جاتی ہے، اس لئے یہ حضرات ایمان میں بھی اس قید کو خاص طور پر ذکر کرتے ہیں، ورنہ کامل مسلمان بننے کے لئے دین اسلام کے تمام ثابت شدہ احکام کی تصدیق ضروری ہے، صرف قطعی احکام کو درست ماننا کافی نہیں۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ تکفیر کا تعلق قطعی احکام کے ساتھ ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص دین اسلام کے کسی حکم کا انکار کرے جو قطعی طور پر ثابت نہ ہو تو اس کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔

علامہ ابی المعین نسفی رحمہ اللہ ایمان کی لغوی تعریف نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> ثم إن هذا اللغوی و هو التصديق بالقلب هو حقيقة الإيمان الواجب على العبد حقا لله وهو أن يصدق الرسول صلى الله عليه وسلم فيما جاء به من عند الله تعالیٰ، فمن أتى بهذا التصديق فهو مؤمن فيما بينه وبين الله تعالیٰ والإقرار يحتاج إليه ليقف عليه الخلق فيجروا عليه أحكام الإسلام-

> "ایمان کا یہ لغوی معنیٰ یعنی تصدیق بالقلب ہی ایمان کی اصل حقیقت ہے جو کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ان تمام باتوں میں تصدیق کی جائے جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے، لہٰذا جس کسی نے اس طرح تصدیق کی تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمان کہلائے گا،

رہا زبانی اقرار تو اس کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ لوگوں کو پتہ چلے اور اس پر اسلام کے احکام جاری کریں۔"[۱]

اس عبارت میں علامہ نسفی رحمہ اللہ نے عام متکلمین کے مقابلے میں ذرا مختلف انداز میں ایمان کی وضاحت کی، عام متکلمین ایمان کی تعریف میں "ضروریاتِ دین" کی تصدیق کو ضروری قرار دیتے ہیں جبکہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ان تمام احکام کی تصدیق کو ایمان کہا جو حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔

متکلمین کی تعریف کے مقابلے میں یہ مؤقف زیادہ عموم پر مشتمل ہے، کیونکہ اس مؤقف کے مطابق صرف "ضروریات دین" کی تصدیق ہی مسلمان ہونے کے لئے کافی نہیں، بلکہ ان تمام احکام کی تصدیق لازم ہے جن کو حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے، چاہے وہ "ضروریاتِ دین" کی فہرست میں شامل ہوں یا نہیں۔

تعبیر کی اس اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے دیگر متکلمین کی طرح "ضروریاتِ دین" کی قید کیوں نہیں لگائی؟ اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے جو ابھی ذکر کی گئی ہے کہ ایمان کے لئے صرف "ضروریاتِ دین" کو درست ماننا کافی نہیں بلکہ دین اسلام کے تمام قطعیات کو تسلیم کرنا ضروری ہے اس لئے علامہ نسفی نے تصدیق کو صرف ضروریاتِ دین کے ساتھ خاص اور مقید نہیں فرمایا، اسی طرح دیگر متکلمین بھی اس بات کے قائل ہیں اور تمام قطعی احکام کی تصدیق و تسلیم کو وہ بھی لازم سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب وہ بھی اس مؤقف کے قائل ہیں تو پھر تعریف کے اندر اس کی

[۱]التمهيد لقواعد التوحيد، ص ۳۷۷، ۳۷۸.

وضاحت کیوں نہیں فرمائی؟ تعریف کے اندر "ضروریاتِ دین" کی قید لگانے کی کیا وجہ ہے؟

علامہ کشمیری رحمہ اللہ اسی بات کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

من قصره من المتكلمين على الضروريات فِلأنّ موضوع فنّهم هو القطعي، لا أن المؤمن به هو القطعي فقط، نعم التكفير إنما يكون بجحوده فقط.

"متکلمین نے ضروریات کو ذکر کرنے پر اکتفاء اس لئے کیا کہ ان کے فن کا موضوع ہی قطعی اُمور ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ایمان کا تعلق صرف قطعیات کے ساتھ ہے، ہاں البتہ تکفیر کا تعلق قطعی احکام کے انکار کرنے کے ساتھ ہے (کسی ظنی حکم کا انکار موجب تکفیر نہیں)۔"[۱]

مقلد کے ایمان کی بحث

بعض متکلمین نے ایمان کی تعریف میں یہ قید بھی لگائی کہ فکر و نظر سے حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کی تصدیق کرے، اگر استدلال کے بغیر محض تقلیداً اس کو سچا مانے تو اس کا اعتبار نہیں، اس بحث کو "ایمانِ مقلد" کے عنوان سے بعض حضرات نے ذکر فرمایا ہے۔

اس مؤقف کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ فکر واستدلال کی نعمت سے محروم ہوں، مثلاً عام مسلمان لوگ جو علم کلام کے باریک دلائل، وجودِ صانع، ضرورتِ بعثتِ رسل اور

[۱]حاشيه إكفار الملحدين، ضمن مجموعة رسائل الكشميري، ج۳ ص٤.

اثباتِ یومِ آخرت کے پر مغز دلائل اور طویل مباحث سے قطعاً ناواقف ہیں، ان کی تصدیق وایمان معتبر نہ ہو گا۔

جمہور متکلمین کا مؤقف اور علامہ شقرونؒ کے ایک رسالے کا خلاصہ

لیکن جمہور متکلمین کے نزدیک یہ مؤقف درست نہیں، علامہ ابوعبداللہ محمد شقرون رحمہ اللہ (المتوفی ۹۲۹ھ) سے جب یہی سوال پوچھا گیا تو آپ نے بڑا تفصیلی جواب لکھا جو سن ۱۴۲۴ھ میں غالباً مصر کے شہر طنطا سے مستقل رسالہ کی شکل میں "الجیش والکمین لقتال من کفر عامۃ المسلمین" کے نام سے شائع ہوا۔

اس تفصیلی جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اوّل تو عام مسلمانوں کے بارے میں یہ مؤقف اختیار کرنا درست نہیں کہ اُنہوں نے محض تقلیداً ایمان قبول کیا، اور اُصولِ دین کی تصدیق لوگوں کے اتباع میں کی، کیونکہ اگر کسی عام سے عام آدمی سے بھی زمین وآسمان کے بارے میں پوچھا جائے کہ اس کا خالق کون ہے تو وہ بلا جھجک یہی جواب دے گا کہ اللہ، اگر کسی ایسے دیہاتی کو تلاش کیا جائے جو کہ علم کلام کے نام تک سے نابلد ہو، اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود وغیرہ مباحث بالکل اس نے نہ سنے ہوں، لیکن تخلیقِ کائنات وغیرہ ضروری اُمور کا جب اس سے سوال کیا جائے گا، تو اس کا یہی جواب ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب چیزوں کا خالق ہے، اس لئے ان کو مقلد قرار دینا درست نہیں۔ اگر ان کو مقلد قرار بھی دیا جائے تو مقلد کا ایمان معتبر ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق کل تین اقوال ہیں:

۱۔ جب دل سے تمام ضروری عقائد کی تصدیق کرے تو اس کا ایمان معتبر ہے اور استدلال نہ کرنے کا کوئی گناہ بھی نہیں ہو گا۔

۲۔ ایمان تو معتبر ہے، لیکن غور وفکر اور استدلال چھوڑنے کی وجہ سے گناہ گار ہو گا، کیونکہ استدلال بھی ایک ضروری حکم ہے جس کا شریعت کی طرف سے بندہ مکلف ہے،

اور مقلد نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔[۱]

۳۔ مقلد کی تصدیق وایمان کا کوئی اعتبار نہیں، اس طرح تصدیق وایمان سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا، بلکہ بدستور کافر ہی رہے گا۔

جمہور اہل سنت والجماعت کا یہی مؤقف ہے جو نمبر ۱ میں ذکر کیا گیا، امام ابو منصور ماتریدی، امام ابوالحسن اشعری، امام قشیری، امام غزالی، امام عزالدین بن عبدالسلام رحمہم اللہ علیہم وغیرہ حضرات کا یہی رجحان ہے، امام ابن رشد وغیرہ حضرات نے بھی اس کو ترجیح دی[۲]۔

اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے طرزِ عمل ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے طریق

[۱] بعض متکلمین نے اسی مؤقف کو جمہور کا قول قرار دیا اور دیگر اقوال کے مقابلے میں اسی قول کو ترجیح دی مثلاً" تهذيب شرح السنوسية"ص: ۱۳۰اسی قول کو جمہور کی طرف منسوب فرمایا اور باقی دونوں اقوال لفظ "قیل" کے ساتھ ذکر کئے اور آخر میں یہ تصریح بھی کر دی کہ یہ دونوں اقوال ضعیف ہیں۔
لیکن خود علامہ سنوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حکم تمام عوام کے لئے نہیں ہے، بلکہ عوام میں سے صرف ان لوگوں کے متعلق یہ حکم ہے جن کے اندر فکر و نظر اور استدلال کی استعداد موجود ہو، ورنہ عام آدمی گناہ گار نہیں ہوگا۔ نیز استدلال سے بھی منطقی یا متکلمین جیسا علمی استدلال کوئی ضروری نہیں، بلکہ عوام کی طرز کا استدلال بھی گناہ سے بچنے کے لئے کافی ہے جیسا کہ ایک اعرابی نے امام اصمعی رحمہ اللہ کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب حیوان کے فضلہ جات حیوان پر اور انسانی قدم کے نشانات انسان پر دلالت کرتے ہیں تو یہ زمین وآسمان کیونکر خدا تعالیٰ کے وجود پر دلالت نہ کریں۔ منہ

[۲] علامہ کمال الدین ابن ابی شریف نے "مسامرہ" میں اس کو فقہاء اور اکثر علماء کا مذہب قرار دیا ہے، اور علامہ قاسم قطلوبغا نے مسایرہ کے حاشیہ میں اس کو امام ابو حنیفہ، سفیان، مالک، اوزاعی، شافعی، احمد بن حنبل، عبداللہ بن سعید القطان وغیرہ کا مؤقف قرار دیا ہے۔(ملاحظہ فرمائیں: "المسامرة مع المسايرة " ص:۲۸۵تا۲۸۸)۔

کار کو دیکھتے ہوئے بھی یہی مؤقف مضبوط معلوم ہوتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ کسی کافر کو اسلام قبول کرتے وقت صرف شہادتین ہی کہلواتے تھے، وجودِ صانع اور بعثتِ رسل وغیرہ کے دلائل ہر کسی کو بیان نہیں فرماتے تھے، نہ ہی ہر نو مسلم کو اس بات کا مکلف بنایا، اگر ایمان کے صحیح ہونے کے لئے فکر واستدلال بھی ضروری ہوتا تو حضور ﷺ اس کو ہرگز نہ چھوڑتے بلکہ ہر کسی کو اس کا حکم فرماتے۔

علاوہ ازیں علم کلام میں ذکر کردہ دلائل اور فکر واستدلال کے اسلوب تو بہت بعد کو مرتب ہوئے، اس سے پہلے عوام مسلمان ان فنّی باریکیوں اور کلامی موشگافیوں سے ہرگز کماحقہ واقف نہ تھے، لہٰذا ایمان کو ان اُمور پر کیونکر موقوف کیا جا سکتا ہے؟

ترجیح

یہ دوسرا مؤقف بھی بعض متکلمین سے منقول ہے، لیکن پہلا نکتہ نظر ہی راجح ہے، نیز اس مؤقف کے مطابق بھی فکر واستدلال ہر شخص پر ضروری نہیں، بلکہ جن لوگوں میں اس کی صلاحیت موجود ہو، ان کے بارے میں یہ حکم ہے، لہٰذا عوام اس سے مستثنیٰ ہیں۔

تیسرا مؤقف اہل سنت والجماعت کے معروف متکلمین میں سے کسی سے مستند ذریعے سے ثابت نہیں، بلکہ بہت سے حضرات نے اس کو معتزلہ کے مؤقف کے طور پر ذکر فرمایا ہے، اس لئے اس کو قابلِ عمل نہیں بنایا جا سکتا۔[۱]

---

[۱] مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں رسالۃ " الجیش والکمین لقتال من کفر عامۃ المسلمین" للعلامۃ محمد شقرون ابوعبداللہ الوھرانی المتوفیٰ ۹۲۹ھ ، مطبوعہ دار الصحابۃ للتراث.

اُصولِ دین

اصطلاحی تعریف سے معلوم ہوا کہ ایمان لانے کیلئے ضروری ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقینی طور پر جو بھی تعلیمات لے کر آئے ہیں، ان سب کو بالکل درست تسلیم کرنا اور دل و جان سے اس کی تصدیق کرنی ہے۔

اس لحاظ سے تو شریعت کے وہ تمام احکامات اس میں داخل ہو گئے جو ہم تک یقین و تواتر کے راستے سے پہنچے، ان سب کی تصدیق ضروری ہے، لیکن ان تمام احکامات میں سے چند احکامات بنیادی قسم کے ہیں جن کے بغیر ایمان قبول نہیں، قرآن کریم میں بھی متعدد موقعوں پر اس کا ذکر فرمایا گیا اور خود حدیثِ جبرئیل میں حضرت سیدنا جبرئیل علیہ السلام نے ایمان کے بارے میں سوال کیا تو جواب میں ان ہی چیزوں کی تصدیق کا ذکر فرمایا گیا کہ ان اُمور کی تصدیق کو ایمان کہا جاتا ہے۔

یہ کل چھ بنیادی عقائد ہیں، جن کو غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر بعض اوقات "اُصولِ دین" بھی کہا جاتا ہے، امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والإيمان هو الإيمان بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر والقدر خيره وشره وحلوه ومره من الله تعالىٰ-[ا]

ایمان باللہ

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی اس کائنات کو وجود بخشا، وہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں بالکل یکتا ہے، اس کا کوئی شریک

[ا] متن الطحاوية بتعليق الألباني،ص٦٤.

وسہیم نہیں۔ کمال کی تمام صفات اس میں جمع ہیں اور وہ ہر نقص وعیب سے بالکل پاک اور منزہ ہے۔

ایمان بالملائکہ

یہ عقیدہ اپنالینا کہ فرشتے ایک نورانی مخلوق ہیں، قرآن کریم میں جابجا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے اور احادیثِ مبارکہ میں تو اس کی بہت سی تفصیلات بھی موجود ہیں، تفصیلات کو اگر غیر قطعی بھی قرار دیا جائے تب بھی اتنا مسلم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک غیر مادی مخلوق ہے۔

ایمان بالکتب

اللہ تعالیٰ نے اپنے جن جن انبیاء کرام علیہم السلام پر اپنی کوئی آسمانی کتاب یا صحیفہ نازل فرمایا ہے، اس کی تصدیق بھی ایمان کے معتبر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اصلاً یہ کتابیں حق تھیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل فرمائی تھیں۔

ایمان بالانبیاء

انبیاء کرام ان عظیم اور مبارک شخصیات کو کہا جاتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں تک اپنے احکام پہنچانے کیلئے منتخب فرمایا، سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا، ان سب کی بالکل متعین تعداد تو یقینی طور پر معلوم نہیں، البتہ ایمان لانے کیلئے ضروری ہے کہ اتنا اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء کرام کو بھیجا وہ سب کے سب برحق تھے، اور انسانیت کی نہایت اعلیٰ صفات واخلاق سے مزین بندے تھے۔

متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا ہے، بلکہ سورۃ

البقرۃ کی آخری آیات میں حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم کی یہی صورتِ حال نقل فرمائی ہے کہ وہ سابقہ تمام انبیاء کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔

چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ-

ترجمہ: "اعتقاد رکھتے ہیں رسول ﷺ اس چیز کا جو اُن کے پاس اُن کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مؤمنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں، اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اسکی کتابوں کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے سب پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور خوشی سے مانا ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے۔" [۱]

لہٰذا مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کی جائے، اگر کوئی شخص کسی بھی ایسی شخصیت کی تکذیب کرے جس کی نبوت قطعی طور پر ثابت ہو یا (نعوذ باللہ) اس کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

---

[۱]البقرۃ: ۲۸۵

ایمان بالیوم الآخر

اس بات پر ایمان لانا ہے کہ اس دنیا نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی نہیں رہنا، بلکہ ایک دن ساری کائنات کو فناء ہونا ہے جس کو قیامت کہا جاتا ہے، اس میں ساری جاندار مخلوق پر موت طاری ہو گی اور مرنے کے بعد ایک دن ساری انسانیت نے زندہ ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دربارِ عالیہ میں حساب و کتاب کیلئے پیش ہونا ہے۔

ایمان بالقدر

اس سے مقصود یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم و ارادے کے موافق ہوتا ہے، ان سارے حالات و تغیرات کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا۔

شرائطِ ایمان

ایمان کی تعریف سے معلوم ہوا کہ یہ تصدیق بالقلب کا نام ہے، کسی چیز کو دل و جان سے مان لینا ایمان کہلاتا ہے، لیکن شریعت کی نگاہ میں یہ ایمان تب ہی معتبر ہو گا جب کہ اس میں مطلوبہ شرائط بھی پائی جائیں، جن کو شرائطِ ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو اس کے بغیر ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ سحر کے حکم کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

"إن كان ردّ ما لزمه في شرط الإيمان فهو كفر و إلّا فلا."

"(سحر علی الاطلاق کفر نہیں بلکہ یہ تفصیل ضروری ہے کہ) اگر اس کی وجہ سے

شرائطِ ایمان کے لوازم میں سے کوئی فوت ہو جائے تو کفر ہے ورنہ نہیں۔"[١]

امام ماتریدی رحمہ اللہ نے اگر چہ اس کے بعد شرائطِ ایمان کی تفصیل ذکر نہیں فرمائی، نہ ہی ان کی کسی اور تصنیف میں اس کی کوئی مزید وضاحت ملی، لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہی مندرجہ ذیل شرائط مراد ہوں گی، جیسا کہ آئندہ تفصیل سے ان شاء اللہ واضح ہو جائے گا۔

یہ کل پانچ شرائط ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

١۔اقرار باللسان

بعض حضرات نے ایمان کی تعریف میں ایک ضروری قید کے طور پر یہ بھی بیان کیا کہ تصدیق بالقلب کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی اس بات کا اقرار کرے، تب ہی ایمان ثابت ہو گا، اگر کسی نے صرف دل سے مان لیا لیکن زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا تو وہ شخص مسلمان نہیں ہو گا۔

چنانچہ محقق علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے "المسایرۃ" میں اس کو تفصیل سے ذکر کیا اوراس مؤقف کو امام صاحب کے حوالے سے بھی نقل فرمایا ہے، مگر جمہور اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک ایمان کی ماہیت کے لئے یہ کوئی ضروری قید نہیں، بلکہ صرف تصدیق بالقلب ہی ایمان ہے۔[٢]

یہ اختلاف اپنی جگہ ہے لیکن اس بات پر دونوں فریق کا اتفاق ہے کہ جب کبھی

---

[١]شرح الفقه الأكبر للعلامة ملا علي القاري، ص٢٤٩، قديمي كتب خانه، كراچي.

[٢]امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "تأويلات أهل السنة" ج٣ص٥٢٠ پر یہی مؤقف ذکر فرمایا ہے۔

تصدیق کرنے والے سے زبانی اقرار کا مطالبہ کیا جائے تو ضروری ہے کہ وہ اقرار کرے، اگر مطالبہ کے باوجود وہ بلاعذر اقرار نہ کرے تو اس پر مسلمانوں کے احکامات جاری نہیں ہوں گے، بلکہ اس کو کفر عناد کہا جائے گا۔

اس لئے کسی شخص کے مسلمان ہونے کیلئے تصدیق بالقلب کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اپنے اسلام کا اقرار کرے۔

علامہ ابو المعین نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فمن أتى بهذا التصديق فهو مؤمن فيما بينه وبين الله تعالىٰ والإقرار يحتاج اليه ليقف عليه الخلق فيجروا عليه أحكام الإسلام، هذا هو المروي عن أبي حنيفة رضي الله عنه وإليه ذهب الشيخ أبو منصور الماتريدي رحمه الله وهو أصح الروايتين عن أبي الحسن الأشعري -

"جو کوئی اس طرح تصدیق (بالقلب) کرے تو وہ اللہ کے نزدیک مسلمان قرار پائے گا، زبانی اقرار کی ضرورت تو اس لئے پیش آتی ہے کہ لوگوں کے اس کے مسلمان ہونے کا علم ہو جائے تا کہ پھر وہ اس کے ساتھ مسلمانوں والے احکام عمل میں لائیں، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے یہی منقول ہے امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور امام اشعری رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت زیادہ صحت کے ساتھ منقول ہے۔"[۱]

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱]التمهيد لقواعد التوحيد، ص : ۳۷۸.

اتفق القائلون بعدم اعتبار الإقرار على أن يعتقد أنه متى طولب به أتى به، فإن طولب به فلم يقر فهو كفر عناد.

"زبانی اقرار کا اعتبار نہ کرنے والے تمام متکلمین اس بات پر متفق ہیں کہ جب کبھی اس سے اقرار کا مطالبہ کیا جائے تو وہ اقرار کرے، اگر مطالبہ کئے جانے کے باوجود وہ اپنے مسلمان ہونے کا اقرار نہ کرے تو یہ کفر عناد ہو گا۔"[١]

۲۔ رضا و محبت

یعنی دینِ اسلام اور اس کی تمام ترضروریات کے ساتھ محبت رکھنا اور اس سے خوش رہنا۔

شریعت کی نظر میں ایمان کے معتبر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ مؤمن شریعت اور اس کے ثابت شدہ تمام یقینی احکام کو بنظرِ استحسان دیکھے، اس کے ساتھ محبت اور پسندیدگی کا رویہّ رکھے، اگر کوئی شخص دل سے شریعت کو تسلیم کرتا ہے اور زبان سے کھلم کھلا اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود وہ شریعت سے بغض وعداوت رکھے یا اس کے کسی ثابت شدہ حکم کو ناپسندیدہ سمجھے تو وہ مسلمان نہیں کہلائے گا، بلکہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ -

جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو اور فرشتوں کا (ہو) اور پیغمبروں کا (ہو)

---

[١]المسايرة، الخاتمة في بحث الإيمان، ص٢٧٩.

اور جبریل کا (ہو) اور میکائیل کا (ہو) تو اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔[۱]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ دشمنی کرنے والے کو کافر قرار دیا۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں ذکر کرتے ہیں کہ اصل عبارت یوں بنتی ہے کہ "فَإِنَّ اللهَ عَدُوٌّ لَهُمْ" لیکن اللہ تعالیٰ نے "کافرین" کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ دراصل ان کے ساتھ عداوت کی اصل وجہ ان کا کافر ہونا ہے اور نیز اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ فرشتوں کے ساتھ محبت رکھنا ضروری ہے، اگر کوئی محبت کی بجائے دشمنی کرے تو وہ کافر ہے۔[۲]

یہی حکم تمام ضروریاتِ دین اور دین کے قطعی احکام کا ہے کہ ان میں کسی ایک حکم کے ساتھ بھی نفرت کرنا دراصل خود شریعت سے نفرت ہے۔

۳۔ تعظیم واحترام

یہ بھی ایمان کے معتبر ہونے کے لئے ایک بنیادی شرط ہے، اگر کوئی شخص دین اسلام کو دل وجان سے درست تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کی تعظیم نہیں کرتا، بلکہ توہین کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج تصور ہوگا، کیونکہ تصدیق بالقلب اگرچہ پہلے موجود تھی، لیکن اس کی بنیادی شرط تعظیم ہے جس کی نقیض یعنی توہین کا ارتکاب کیا گیا، اس لئے یہ تصدیق بھی معتبر نہیں اور محض اس کی وجہ سے کسی کو مسلمان نہیں کہا جائے گا۔

---

[۱] البقرة: ۹۸

[۲] مدارك التنزيل وحقائق التأويل، تفسير الآية المذكورة، ج۱ ص۱۱٤.

۴۔ تسلیم وانقیاد

تسلیم کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی ایمان قبول کر کے جملہ شرائط بجالائے، تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شریعتِ مطہرہ کے تمام احکامات کو اجمالی یا تفصیلی طور پر قبول کرے اور ان پر عمل کرنے کا ارادہ کرے۔

قرآن کریم میں بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا کہ شریعت کے فیصلہ کو (بے چون وچرا) تسلیم کرنے اور قبول کے بغیر اسلام کا دعویٰ بے جا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا-

"پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہ ہونگے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان میں آپس میں جو جھگڑا واقع ہو، اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کروائیں، پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دِلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔"[۱]

اس آیتِ کریمہ میں عربی زبان کے لحاظ سے تاکید کے مختلف طریقوں کے ساتھ اس شخص سے ایمان کی نفی کی گئی جو شریعت کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے، یعنی کوئی شخص مسلمان اور مؤمن ہو ہی نہیں سکتا، جب تک کہ وہ شریعت کے فیصلے اور اس کے احکام کو دل وجان سے تسلیم نہ کرے۔

اس کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ ابو بکر جصاص رازی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱] النساء: ٦٥

في هذه الآية دلالة على أن من رد شيئا من أوامر الله تعالىٰ أو أوامر رسوله صلى الله عليه وسلم فهو خارج من الإسلام سواء رده من جهة الشك فيه أو من جهة ترك القبول والامتناع من التسليم- لأن الله تعالىٰ حكم بأن من لم يسلم للنبي صلى الله عليه وسلم قضاءه وحكمه فليس من أهل الإيمان.

"اس آیت میں اس بات کی رہنمائی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کے احکام میں سے کوئی حکم رد کردے تو وہ اسلام سے خارج ہے، چاہے شک کرنے کی وجہ سے رد کیا یا (یقین کرنے کے باوجود) قبول نہ کرنے کی وجہ سے رد کیا، کیونکہ جو لوگ حضور ﷺ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کو بے ایمان قرار دیا ہے۔"[۱]

امام اعظم رحمہ اللہ کی تصریح

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والإسلام هو التسليم والانقياد لأوامر الله تعالىٰ فمن طريق اللغة فرق بين الإسلام والإيمان ولكن لا يكون إيمان بلا إسلام ولا يوجد إسلام بلا إيمان-

"اسلام اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے جھکنے اور سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے، لغوی معنیٰ کے اعتبار سے تو ایمان و اسلام میں فرق ہے لیکن ایمان اسلام کے بغیر اور

[۱] أحكام القرآن للجصاص، تفسير سورة النساء، رقم الآية:٦٥،ج٢ ص ٢٦٨.

اسلام ایمان کے بغیر موجود نہیں ہو سکتا۔"[۱]

آیتِ تسلیم کی وضاحت پر ایک اشکال کا جواب

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کے معتبر ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ بیان فرمائی کہ شریعت کے فیصلہ اور حکم کو تسلیم کرے، اس کی تفسیر میں عام طور پر مفسرین کرام رحمہم اللہ علیہم نے لکھا کہ ظاہر وباطن سے اس فیصلہ کو قبول کرنا ضروری ہے، یعنی دل سے اس کو درست اور حق وسچ سمجھنا بھی ضروری ہے اور عملی زندگی میں بھی اس کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو جائے تو آیتِ کریمہ کے مطابق اس ایمان کا اعتبار نہیں ہو گا۔

اس پر بعض اوقات یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ اس کے مطابق تو شریعت کے کسی فیصلے کے خلاف عمل کرنا ہی منافی ایمان ہونا چاہئے، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اگر کوئی شخص شریعت کے کسی حکم کے خلاف کام کرے تو وہ کافر ہو جائے، یہی مذہب خوارج اور بعض دیگر مبتدعین کا ہے جو محض کسی گناہ کے ارتکاب کو موجبِ کفر سمجھتے ہیں اور اسی بناء پر اُمت کے اکثر طبقے کو کافر قرار دیتے ہیں، جبکہ اہلِ سنت کا ہرگز یہ مؤقف نہیں ہے۔

یہ اشکال بظاہر ایک حد تک وزنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر آیتِ مبارکہ کے سیاق و سباق پر غور کیا جائے تو مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ آیت باہمی اختلاف سے متعلق ہے، یعنی جب کبھی کسی معاملے میں باہمی تنازع ہو جائے تو حضور ﷺ کے عہد مبارک میں خود آپ ﷺ کی ذات مبارک کو اور آنحضور ﷺ کے دنیا سے

---

[۱]الفقه الأكبر بتحقيق العلامة الكوثري ضمن " العقيدة وعلم الكلام" ص:٦٢٢.

تشریف لے جانے کے بعد آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کو حکم بنانا ضروری ہے اور پھر اس کے فیصلے کو دل وجان سے قبول کرنا بھی لازم ہے۔

یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں: ایک تسلیم وانقیاد ہے یعنی فیصلہ کو قبول کرنا اور دوسری چیز اس پر پوری زندگی عمل کرنا ہے۔ یہ دو چیزیں آپس میں لازم وملزوم نہیں کہ اگر کسی نے فیصلے کے خلاف عمل کیا تو اس سے یہ لازم نہیں ہے کہ اس نے فیصلے کو تسلیم ہی نہیں کیا، بلکہ بعض اوقات تسلیم کرنے اور اس کو مکمل طور پر حق وسچ سمجھنے کے باوجود بھی عمل میں کوتاہی ہو جاتی ہے، مثلاً اگر پاکستان کا کوئی باشندہ ہے وہ حکومت کے قوانین کو مانتا ہے، اس کو درست تسلیم کرتا ہے لیکن بعض اوقات اپنے مفاد کی خاطر یا حرص ولالچ کی وجہ سے یا کبھی اپنی ناسمجھی کی وجہ سے خلافِ قانون کوئی کام کرتا ہے تو اس کے باوجود وہ پاکستانی ہی کہلاتا ہے، اس خلافِ قانون اقدام کی وجہ سے اس کو پاکستان کا دشمن نہیں کہا جاتا۔

اس کے مقابل اگر کوئی شخص اعلان کرے کہ میں پاکستان کا قانون نہیں مانتا، حکومت کے سامنے واضح کرے کہ میں اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا، تو اس کا اعلان حکومت کے خلاف بغاوت سمجھتا جاتا ہے۔

یہی حال آیتِ کریمہ میں ذکر کردہ تسلیم کا بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان شریعت کے حکم اور اس کے فیصلے کو دل وجان سے درست مانے اور عملی طور پر بھی اس کو رد نہ کرے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار اس کے خلاف گناہ کا ارتکاب کرے تو محض اس گناہ کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جاسکتا، ہاں اگر کوئی شخص عناد کے طور پر شریعت کے واضح فیصلے کو رد کرے یا اس کا مقابلہ کرے تو وہ یقیناً کافر ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ اس آیت "یسلموا تسلیما" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

الشرط الثالث: قوله تعالىٰ: ويسلموا تسليما واعلم أن من

عرف بقلبه كون ذلك الحكم حقا وصدقا قد يتمرد عن قبوله على سبيل العناد أو يتوقف في ذلك القبول، فبين تعالىٰ أنه كما لا بد في الإيمان من حصول ذلك اليقين في القلب. فلا بد أيضا من التسليم معه في الظاهر، فقوله: ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت المراد به الانقياد في الباطن، وقوله: ويسلموا تسليما المراد منه الانقياد في الظاهر والله أعلم.

"جو کوئی دل سے شرعی حکم کو حق و سچ جانے لیکن ضد و عناد کی وجہ سے اس کو قبول نہ کرے یا اس میں توقف کرے، تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ جس طرح ایمان کے حصول کے لئے دلی تصدیق و یقین ضروری ہے، اسی طرح ظاہر میں حکم کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے (لہٰذا عناد کی وجہ سے کسی حکم شرعی کو قبول نہ کرنا یا توقف کرنا کفر ہے)۔" [۱]

اس آیت کے بارے میں امام جصاص رازی رحمہ اللہ کی تفسیر سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

فأوعد على مخالفة أمر الرسول وجعل مخالف أمر الرسول والممتنع من تسليم ما جاء به والشاك فيه خارجا من الإيمان- - جائز أن يكون المراد التسليم من غير شك في وجوب تسليمه ولا ضيق صدر به بل بانشراح صدر وبصيرة ويقين وفي هذه الآية دلالة على أن من رد شيئا من أوامر الله تعالىٰ أو أوامر رسوله صلى

[۱]مفاتيح الغيب، سورة النساء، رقم الآية:٦٥،ج١٠ص١٢٨.

الله عليه وسلم فهو خارج من الإسلام سواء رده من جهة الشك فيه أو من جهة ترك القبول والامتناع من التسليم-

"قرآن کریم نے رسول کے حکم کی مخالفت پر وعید بیان فرمائی ہے اور حکمِ رسول کی مخالفت کرنے والے، اس کو قبول نہ کرنے والے اوراس میں شک کرنے والے کو ایمان سے خارج قرار دیاہے۔اس آیت میں اس بات کی رہنمائی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ یااس کے رسول ﷺ کے احکام میں سے کوئی حکم رد کر دے تو وہ اسلام سے خارج ہے، چاہے شک کرنے کی وجہ سے رد کیایا (یقین کرنے کے باوجود) قبول نہ کرنے کی وجہ سے رد کیا، کیونکہ جو لوگ حضور ﷺ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اُن کو بے ایمان قرار دیاہے۔"[۱]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شریعت کے فیصلہ کے خلاف عمل کرنا اگرچہ گناہ اور جرم ہے لیکن محض اس کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا، تاہم اگر کوئی اس فیصلے کو قبول ہی نہ کرے بلکہ عناد کی وجہ سے اس کو رد کرے یااس کے مقابلے اور معارضے پر اُتر آئے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

بالفاظِ دیگر

اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اعتقاد کی حد تک تسلیم ضروری ہے، لہٰذا اگر کوئی اعتقاد ہی میں شریعت کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے یعنی اس کو حق نہ سمجھے تو وہ کافر ہے اسی طرح اگر زبانی طور اس کو ناحق کہے، شریعت کے کسی مسلمہ حکم کو ظلم

---

[۱]أحكام القرآن للجصاص، سورة النساء، رقم الآية:٦٥ ج٣ص ١٨٠.

وبے انصافی کہے یا اس کے ساتھ استہزاء واستخفاف کی کوئی اور شکل اختیار کرے تو وہ بھی کافر ہے، اگر یہ دونوں اُمور مفقود ہوں کہ دل میں بھی اس کو حق وصواب سمجھتا ہے اور زبان وعمل سے بھی اس کے متعلق کسی موجب کفر امر کا ارتکاب نہیں کرتا، البتہ اپنے مفاد وغیرہ کی وجہ سے بعض اوقات شریعت کے کسی فیصلہ کے متعلق کوتاہی کرجاتا ہے، خدا اور سول کے برحق فیصلے اور منصفانہ حکم کے بعد اس طرح کوتاہی کرنا اگرچہ بالکل نامناسب ہے لیکن محض اس کی وجہ سے کوئی کافر بھی نہیں ہوتا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی جامع تفسیر

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اسی آیت کی تفسیر میں حسبِ معمول بڑی جامع مختصر اور مفید بات ذکر فرمائی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

> "تحکیم، عدم حرج اور تسلیم کے مراتب تین ہیں: اعتقاد سے اور زبان سے اور عمل سے۔ اعتقاد سے یہ کہ قانونِ شریعت کو حق اور موضوع التحکیم جانتا ہے اور اس میں مرتبہ عقل میں ضیق نہیں، اور اس مرتبہ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں، اور زبان سے یہ کہ ان اُمور کا اقرار کرتا ہوں کہ حق اسی طرح ہے اور عمل سے یہ مقدمہ لے بھی جاتا ہے اور طبعی ضیق بھی نہیں اور اس فیصلہ کے موافق کاروائی بھی کرلی۔
>
> سو اوّل مرتبہ تصدیق وایمان کا ہے اس کا نہ ہونا عند اللہ کفر ہے اور منافقین میں خود اسی کی کمی تھی، چنانچہ تنگی کے ساتھ لفظ انکار اسی کی توضیح کے لئے ظاہر کردیا ہے، اور دوسرا مرتبہ اقرار کا ہے اس کا نہ ہونا عند الناس کفر ہے، تیسرا مرتبہ تقویٰ

وصلاح ہے اس کا نہ ہونا فسق ہے اور طبعی تنگی معاف ہے۔ پس آیت میں بقرینہ ذکر منافقین مرتبہ اوّل مراد ہے۔[۱]

۵۔ مخالف ادیان ومذاہب سے بیزار ہونا

یہ بھی ایمان کے معتبر ہونے کے لئے ایک بنیادی شرط ہے جس کے بغیر اسلام کا اعتبار نہیں، اگر کوئی شخص دل سے اسلام کی حقانیت کا یقین کرے اور زبان سے بھی اس کا اقرار کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کے علاوہ دیگر ادیان مثلاً عیسائیت، یہودیت وغیرہ کے ساتھ بھی وابستہ رہے اور اس کو بھی مذہب کے طور پر باقی رکھے تو وہ بھی مسلمان نہیں کہلائے گا، کیونکہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اسلام ہی کو حق اور سچ مذہب تسلیم کرے اس کے علاوہ دیگر ادیان کو منسوخ تصور کرے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ

"بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔"[۲]

اسی بناء پر حضرات فقہاء کرام نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا کہ اگر کوئی عیسائی یا یہودی مسلمان ہونا چاہے تو صرف کلمہ طیبہ پڑھنے "یعنی توحید ورسالت کا اقرار کرنے" سے وہ مسلمان نہیں ہو گا بلکہ اپنے دین سے براءت بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن قاوان شافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۸۹ھ) تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱] بیان القرآن، سورۃ النساء، رقم الآیۃ: ٦٥، ج۱ ص۵۵۹.

[۲] آل عمران: ۱۹.

بل الإيمان هو التصديق الخاص ولكن لقبوله شرط هو التلفظ بالشهادتين عند القدرة وعدم الإتيان بما هو مكفر.

"ایمان تو خاص قسم کی تصدیق کا نام ہے (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے) لیکن قبولیتِ ایمان کے لئے ایک تو یہ شرط ہے کہ اگر قدرت ہو تو زبانی توحید ورسالت کا اقرار کرے، اور دوسری شرط یہ ہے کہ موجب کفر کوئی کام نہ کرے۔"[۱]

علامہ حصکفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

(وإسلامه أن يتبرأ عن الأديان) سوى الإسلام (أو عما انتقل إليه) بعد نطقه بالشهادتين، وتمامه في الفتح؛ ولو أتى بهما على وجه العادة لم ينفعه ما لم يتبرأ بزازية.

"مرتد کے اسلام لانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام کے علاوہ تمام ادیان سے یا جو دین اختیار کر رکھا ہے، خاص اس دین سے اپنی براءت کرے اور توحید ورسالت کا اقرار بھی کرے، اگر صرف عام معمول کے طور پر اقرار کرے گا تو اسکا فائدہ نہیں ہو گا جب تک باقی باطل ادیان سے اپنی براءت کا اظہار نہ کرے۔"[۲]

ان شرائط کو مقرر کرنے کی بنیادی وجہ

اس باب کے شروع میں تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ایمان وکفر آپس میں ضدین بلکہ نقیضین ہیں، شریعت نے ایمان کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے، اگر وہ مفہوم موجود ہو تو آدمی مسلمان کہلائے گا اور اگر کہیں خدانخواستہ وہ مفہوم برقرار نہ رہے تو اس کو

---

[۱]شرح العقائد العضدية، ص:۱۰۸.

[۲]الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ، كتاب الجهاد، باب المرتد، ج٤ ص٢٢٦.

کافر قرار دیا جائے گا، باہمی تناقض کی وجہ سے دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت نہیں ہے کہ جو نہ ایمان ہو نہ کفر کیونکہ ارتفاع نقیضین محال ہے۔

ایمان ہو یا کفر، ہر ایک دل کے خاص افعال وکیفیات سے عبارت ہے، دنیا جہاں کی دیگر تمام چیزوں کی طرح کفر کے پہچاننے کے بھی دو طریقے ہیں، ایک ذاتیات کے ذریعے پہچاننا ہے اور دوسرا طریقہ لوازم وخواص یا قرائن کی وجہ سے پہچاننے کا ہے مثلاً زید کو یا تو حیوان ناطق سے پہچانا جاتا ہے جو اس کی ذاتیات سے مرکب ہے یا اس کی شکل وشباہت، کردار وگفتار وغیرہ اُمور کے ذریعے اس کا علم ہوتا ہے جو کہ خواص وقرائن کے قبیل سے ہیں۔

ٹھیک یہی صورتِ حال کفر کی بھی ہے، کفر کی ذات " تکذیب النبی ﷺ فی شئی مما علم مجیئه به ضرورة" یا " عدم تصدیقه ﷺ فی شئی مما علم مجیئه به ضرورة" ہے، اگر کوئی بدبخت صراحۃً دینِ اسلام یا اس کی ضروریاتِ دین میں سے کسی کی تکذیب کرے یا ان میں سے کسی چیز کی تصدیق بالقلب نہ کرے تو ایسا شخص کافر ہے اور یہی کفر کی اپنی ذاتی شکل ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کفر اپنی ذاتیات کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ کچھ قرائن ولوازمات اس کی عکاسی کرتے ہیں لیکن جس طرح عام زندگی میں مطلق قرینہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا، اسی طرح یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے، بلکہ شریعتِ مطہرہ نے تو اس باب میں ظنّ غالب والے قرائن پر بھی اکتفاء نہیں فرمایا، اس سے بھی بڑھ کر درجہ یقین کو ضروری قرار دیا، یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کرام نے یہ متفقہ ضابطہ مقرر فرمایا ہے کہ امر محتمل کی وجہ سے کسی معین شخص کی حتمی تکفیر جائز نہیں، اگر کسی کلمہ میں تمام تر احتمالات موجبِ کفر بھی موجود ہوں لیکن اگر کوئی ایک ایسا احتمال بھی موجود ہو جو کفر کا موجب نہ بنتا ہو تو حتی الامکان اسی احتمال کو ترجیح دینی چاہیئے اور اس کے مطابق تکفیر کا حکم لگانے سے

احتراز کرلینا چاہئے۔

اگر مطلق قرینہ سے اندرونی کفر پر استدلال کرنا درست ہوتا تو صفحہ ہستی سے اسلام کب کا مٹ چکا ہوتا، اس لئے شریعتِ مطہرہ نے ہر قرینہ اور ہر دلالت کو اس باب میں کافی قرار نہیں دیا، بلکہ دلالتِ قطعی کو ضروری قرار دیا، لہٰذا ہر گناہ کا ارتکاب کفر نہیں بلکہ صرف اُنہی اُمور کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جاسکتی ہے جو دلی کفر پر قطعیت کے ساتھ دلالت کریں۔ اور فقہاء کرام کی تمام تر جزئیات کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اُمور چار ہیں جو لوزام / شرائط ایمان کے عنوان سے ذکر کئے جاچکے، اب ان اُمور کو ایمان کے اجزء قرار دیے جائیں یا شریعت کی نظر میں ایمان کے معتبر ہونے کی شرائط کا نام دیا جائے، لیکن بہر حال حقیقت وہی ہے جو تحریر کی گئی۔

علامہ ابو الیسر بزدوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

الشئي كما يدلّ على شكله يدلّ على خلافه وضدّه عند عامّة أهل السنّة والجماعة وعامّة من يجعل الاستدلال حجة-[۱]

"کوئی چیز جس طرح اپنی شکل پر دلالت کرتی ہے اسی طرح اپنے مخالف اور ضد پر بھی دلالت کرتی ہے، یہی مؤقف اکثر اہل سنت والجماعت اور ان لوگوں کا ہے جو استدلال کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔"

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی عبارت

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اپنی مفید کتاب "المسایرۃ" کے خاتمہ میں اس پر

[۱]أصول الدين للبزدوي، ص ۲۰.

عمیق بحث فرمائی ہے جو اس موضوع کے لئے کافی حد تک مناسب ہے۔

آپ لکھتے ہیں:

اعتبر فی ترتیب لازم الفعل وجود أمور عدمها مترتب ضده کتعظیم الله تعالیٰ وأنبیائه وکتبه وبیته وترك السجود للصنم ونحوه والانقیاد هو الاستسلام إلی قبول أوامره ونواهیه الذي هو معنی الإسلام، وقد اتفق أهل الحق وهما فریقا الأشاعرة والحنفیة عليٰ أنه لا إیمان بلا إسلام وعکسه، فیمکن اعتبار هذه الأمور أجزاء لمفهوم الإیمان فیکون انتفاء ذلك اللازم عند انتفائها لانتفاء الإیمان إن وجد التصدیق.

"اسلام نے ایمان کے احکام واثرات مرتب کرنے میں چند اُمور کا اعتبار کیا جو اگر موجود نہ ہوں تو ایمان کی ضد یعنی کفر کے احکام مرتب ہوں گے، مثلاً اللہ تعالیٰ، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، آسمانی کتابوں اور بیت اللہ کی تعظیم کرنا، بت وغیرہ کو سجدہ نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے قبول کرنے کی طرف جھکنا۔ اہلِ حق یعنی اشاعرہ اور حنفیہ (ماتریدیہ) کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایمان واسلام ایک دوسرے کے بغیر متحقق نہیں ہوسکتے، اس تفصیل کے مطابق ان اُمور کو ایمان کے مفہوم کے اجزاء کہنا بھی درست ہے، لہٰذا اگر تصدیق موجود بھی ہو، لیکن کہیں ان اُمور کی وجہ سے ایمان کے لوازمات واحکام جاری نہ ہوں تو خود ایمان منتفی ہوگا (کیونکہ اجزاء کے نہ ہونے کی وجہ سے گویا ایمان ہی موجود نہیں)۔ "[۱]

[۱] المسایرة، ص۲۸۱.

اس کے علاوہ علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "الفتح المبین" میں ایمان کے تقریباً ان ہی "لوازمات" کو ذکر فرمایا ہے۔[۱]

مشہور حنبلی متکلم علامہ شمس الدین سفارینی رحمہ اللہ نے بھی جمہور اشاعرہ وماتریدیہ کے حوالہ سے یہی نقل فرمایا ہے، آپ لکھتے ہیں:

قال جمهور الأشاعرة والماتريدية: الإيمان هو التصديق بالنبي صلى الله عليه وسلم وبكل ما علم مجيئه به من الدين بالضرورة أي الإذعان، والقبول مع الرضا، والتسليم وطمأنينة النفس لذلك؛ تفصيلا فيما علم تفصيلا، وإجمالا فيما علم إجمالا-[۲]

رہی یہ بات کہ خاص ان اُمور ہی کو ایمان معتبر ہونے کے لئے شرائط کے طور پر کیوں مقرر کیا گیا؟ شریعت کے تمام احکام وارکان میں سے انہی اُمور کا کیونکر انتخاب کیا گیا؟ تو یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے، یہاں مختصراً اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ یہ چاروں ایمان کے لوازم وشرائط ہیں، ایمان اور ان کے درمیان لزوم ذہنی ظاہر ہے، جس کے انتفاء سے ملزوم کا منتفی ہونا بدیہی امر ہے، نیز اگر ان لوازم کی ضد یا نقیض کا ارتکاب کیا جائے تو چونکہ اجتماع نقیضین محال ہے، اس لئے اس کا ارتکاب ہی اس بات کی یقینی دلیل ہے کہ یہ لوازم منتفی ہوگئے اور ان کے انتفاء سے ملزوم یعنی اصل ایمان کا انتفاء لازم ہے۔

---

[۱] الفتح المبين ، شرح حديث جبرئيل، ص١٥٦.

[۲] لوامع الأنوار البهية، فصل في الكلام على الإيمان واختلاف الناس فيه، تنبيهات، ج١ص٤٢٠.

حضرات فقہاءِ کرام کی ذکر کردہ جزئیات کو اگر خوب دقّتِ نظری کے ساتھ دیکھا اور سمجھا جائے تو اس سے اس بات کی پوری تائید حاصل ہو جاتی ہے، اس ناکارہ نے فقہی مباحث کی بعض مخطوط و مطبوع کتابوں کے اکثر بلکہ تقریباً تمام جزئیات کی تحقیق کی ہے اور سب کو اس ضابطہ کے مطابق پایا، اگر ربّ کریم کی توفیق شاملِ حال رہی تو اس کو مستقلاً تطبیقی انداز میں ذکر کر دیا جائے گا۔

کفر کی لغوی تحقیق

کفر کا اصل مادہ "ک ف ر" تین حروف ہیں اور یہ مادہ کلام عرب میں بنیادی طور پر کسی چیز کو چھپانے، ڈھانکنے اور غائب کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ جب سپاہی اپنا زرہ کسی کپڑے وغیرہ میں چھپائے تو عرب کہتے ہیں "کفر درعه" یعنی اس نے اپنا زرہ چھپایا، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں کاشتکار کو بھی کافر فرمایا گیا، کیونکہ وہ بھی تخم کو زمین کے اندر چھپاتا ہے۔

اس مادہ سے بنے ہوئے تقریباً اکثر الفاظ میں یہی "پوشیدگی اور مخفی ہونے" کا معنٰی کارفرما ہوتا ہے، چنانچہ مقاییس میں ہے:

(كفر) الكاف والفاء والراء أصل صحيح يدل على معنى واحد، وهو الستر والتغطية. يقال لمن غطى درعه بثوب: قد كفر درعه. والمكفر: الرجل المتغطي بسلاحه. [۱]

---

[۱] مقاييس اللغة، باب الكاف والفاء، ج٥ ص١٩١.

لغوی اور اصطلاحی معنٰی میں مناسبت

چونکہ اصطلاحی معنٰی میں لغوی معنٰی کا کافی حد تک لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لحاظ سے جس چیز کو شریعت کی اصطلاح میں کفر کہا جاتا ہے، تو اس میں بھی اصل لغوی معنٰی کی رعایت رکھی گئی ہے، اصطلاحی کفر کو بھی اسی لئے کفر کہا جاتا ہے کہ اس کا اختیار کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو چھپاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں منصف مزاج شخص پر بالکل واضح اور عیاں ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر عقلاً واجب ہے، اس کا وجوب صرف شریعت ہی پر موقوف نہیں۔

لہٰذا جب کوئی شخص اتنی واضح نعمتوں کے باوجود اس کی تکذیب کرے یا دین اسلام کی طرف دعوت دیئے جانے کے باجود اس کو قبول نہ کرے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی ان ساری نعمتوں کو چھپانے کی کوشش کی، اسی لئے اس کو بھی کفر کہا جانے لگا۔

علامہ ابو البقاء الکفوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

الكفر: كل شيء غطى شيئا فقد كفره، ومنه سمي الكافر لأنه يستر نعم الله۔

"کفر ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دوسری چیز کو ڈھانکے، اسی مناسبت سے کافر کو بھی یہ نام دیا گیا، کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں چھپاتا ہے۔"[۱]

[۱] الكليات،فصل الكاف، مادة "كفر"،ج١ص٧٤٢.

کفر کا اصطلاحی تعارف

پہلی تعریف

اہل سنت والجماعت میں سے امام ابو بکر الباقلانی المالکی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۰۳ھ) کفر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هو ضد الإيمان وهو الجهل بالله عز وجل والتكذيب به الساتر لقلب الإنسان عن العلم به-

"کفر ایمان کی ضد ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جہل اور اس کی تکذیب کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے بارے میں کچھ جاننے سے مستور رہے۔"[۱]

لیکن بعض متکلمین نے اس پر یہ اشکال کیا کہ یہ تعریف اپنے افراد کو جامع ہے نہ ہی دخول غیر سے مانع۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، وجود اور وحدانیت سے کسی بھی قسم کی ناواقفیت کو جہل قرار دیکر کفر کی تعریف میں داخل کیا جائے تو اس کی وجہ سے بہت سے مسلمان بھی کفر کے زُمرے میں داخل ہو جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا کامل اور محیط علم مخلوق کو کہاں میسر ہو سکتا ہے؟

اسی طرح بعض کفار بلکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی معرفت

[۱] تمهيد الأوائل وتلخيص الدلائل،باب القول في معنى الكفر،ص۳۹٤.

کسی نہ کسی درجہ میں حاصل ہے، جس کے ہوتے ہوئے ان کو کم از کم جاہل باللہ نہیں کہا جاسکتا، لیکن اس کے باوجود مختلف وجوہات کی بناء پر ان کو بالاتفاق کافر قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض متکلمین نے اس اعتراض کا دفاع بھی کیا، تاہم جمہور متکلمین نے اس تعریف کو قبول نہیں فرمایا۔

دوسری تعریف

امام غزالی رحمہ اللہ نے کفر کی اصطلاحی تعریف یہ لکھی کہ:

الكفر هو تكذيب الرسول صلى الله عليه وسلم فى شيء مما جاء به-[۱]

آپ نے کفر کی اسی تعریف کو معیار بنایا اور اس کے مطابق اپنی کتابوں میں مسئلہ تکفیر کے تمام پہلوؤں پر بحث فرمائی۔

تیسری تعریف

امام محمد بن مرتضی الیمانی رحمہ اللہ "ایثار الحق" میں فرماتے ہیں:

واعلم أن أصل الكفر هو التكذيب المتعمد لشيء من كتب الله تعالىٰ المعلومة أو لأحد من رسله عليهم السلام أو لشيء مما جاؤوا به إذا كان ذلك الأمر المكذب به معلوما بالضرورة من الدين.

"جان لو کہ کفر کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معلوم (ثابت شدہ) کتابوں میں

[۱] فيصل التفرقة بين الإسلام والزندقة، ص۲۵.

سے کسی کتاب کی یا اس کے کسی رسول کی یا ان حضرات انبیاء کرام کی لائی ہوئی تعلیمات کی تکذیب کی جائے، بشرطیکہ جس چیز کی تکذیب کی جارہی ہو، اس کا دینی حکم ہونا بداہۃً معلوم ہو۔"[۱]

دونوں تعریفات میں یہ بات مشترک ہے کہ کفر ایک وجودی چیز ہے جو کہ حضور ﷺ یا ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک حکم کی تکذیب کا نام ہے۔

لیکن اس پر بھی متکلمین نے اشکال کیا کہ کفر صرف تکذیب ہی کا نام نہیں، بلکہ عدم تصدیق کی شکل میں بھی کفر موجود ہو سکتا ہے، اگر کسی شخص نے حضور ﷺ کی تصدیق نہیں کی لیکن تکذیب بھی نہیں کی، بلکہ اس طرف تعرض ہی نہیں کیا، اب یہ شخص بالاتفاق کافر ہے، مگر اس تعریف کے مطابق چونکہ اس نے تکذیب نہیں کی، اس لئے اس کو کافر کہنا درست نہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات میں سے ایک ضروری حکم تصدیق بھی ہے کہ آپ کی تصدیق کی جائے، لہٰذا تصدیق نہ کرنا ہی تکذیب ہے جو کہ کفر ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں اگرچہ شخص مذکور کی صراحۃً تکذیب نہیں یعنی حضور ﷺ کی طرف کذب کی نسبت نہیں کی، لیکن چونکہ تصدیق ضروری تھی جو اس نے کی نہیں اس لئے یہ عدم تصدیق ہی تکذیب ہے۔[۲]

---

[۱] إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات إلى المذهب الحق. ص: ۳۷۶.

[۲] شرح المقاصد، المقصدالسادس، المبحث السادس فی تعریف الکفر، ج۳ص۴۵۸.

کفر کی راجح تعریف

لیکن متکلمین کا یہ اشکال بھی چونکہ ایک حد تک معقول تھا، اس لئے امام غزالی رحمہ اللہ کے بعد کے متکلمین نے کفر کی تعریف میں اس نکتے کا لحاظ رکھا اور اس کی تعریف یہ کی کہ:

عدم الإيمان عما من شانه-[۱]

"جس چیز پر ایمان لانا ضروری ہے اس پر ایمان نہ لانا کفر ہے۔"

قاضی عضد الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فهو عندنا عدم تصديق الرسول في بعض ما علم مجيئه به ضرورة-[۲]

آپ نے اپنی دوسری کتاب "العقائد العضدية" میں کفر کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

الكفر عدم الإيمان-[۳]

یعنی شریعت کی طرف سے بندوں کو جن باتوں پر ایمان لانے کا حکم ہے، ضروری ہے کہ ان تمام باتوں کی تصدیق کی جائے اور ان پر ایمان لایا جائے، ان اُمور پر ایمان نہ لانا کفر ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص حضور ﷺ کی تصدیق نہیں کرتا اور تکذیب کی بھی جرأت

---

[۱] شرح المقاصد، المقصد السادس، المبحث السادس فی تعریف الکفر، ج۳ص۴۵۷.
[۲] شرح المواقف، المرصد الثالث، المقصد الثالث: في الكفر، ج۸ص۳۶۱.
[۳] شرح العقائد العضدية، ص:۱۰۸.

نہیں کرتا تو اس تعریف کے مطابق وہ یقیناً کافر ہے، کیونکہ ایمان کا اصل دارومدار اس بات پر ہے کہ حضور ﷺ کی تصدیق کی جائے جو اُس نے کی نہیں، اس لئے وہ بلاتردد کافر کہلائے گا۔

ایمان اور کفر کے درمیان نسبت

جیسا کہ ابھی تحریر کیا جاچکا کہ کفر کی تعریف کرتے ہوئے حضرات متکلمین نے دو اسلوب اختیار فرمائے، بعض حضرات "حضور ﷺ کے لائے ہوئے یقینی احکام کے تکذیب وانکار" کو کفر قرار دیتے ہیں جبکہ بعض دیگر محقق متکلمین نے ایمان نہ لانے کو کفر کہا، اور ظاہر ہے کہ انکار وتکذیب تو چونکہ دونوں وجودی اُمور ہیں، اور ایمان بھی تصدیق ہی کا نام ہے جس کا "وجودی" ہونا بھی بالکل واضح ہے، اس لئے اس تعریف کے مطابق ایمان اور کفر کے درمیان "تقابل" کی چار نسبتوں میں سے "تضاد" کی نسبت ہے۔

اور دوسری تعریف کے مطابق جب خود ایمان نہ لانا ہی کفر ہے تو ایمان وکفر کے درمیان ان چار نسبتوں میں سے تقابل عدم والملکۃ کی نسبت ہے۔

فقہاء حنفیہ میں سے علامہ برکوی رحمہ اللہ نے کفر کی اسی دوسری تعریف کو ترجیح دی اور ساتھ یہ وضاحت بھی فرمائی کہ کفر کی تعریف انکار کے ساتھ کرنا اس لئے درست نہیں کہ کفر کی بہت سے اقسام پر یہ تعریف منطبق نہیں ہوتی، لہٰذا ایمان اور کفر کے درمیان یہی دوسری نسبت ہی درست ہے۔

آپ اپنی کتاب " الطریقة المحمدیة" میں تحریر فرماتے ہیں:

(الكفر) هو عدم الإيمان عمن من شأنه أن يكون مؤمنا والإيمان هو التصديق بالقلب بجميع ما جاء به محمد – صلى الله تعالى

عليه وسلم - من عند الله تعالىٰ والإقرار به عند عدم المانع حقيقة وحكما أو حكما فقط، وتفسير الكفر بالإنكار ليس بجامع لخروج الشك وخلو الذهن عنه، فعلى الأول بينهما تقابل العدم والملكة وعلى الثاني تقابل التضاد-

"کفر نام ہے ان باتوں کی تصدیق نہ کرنے کا جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہوں ، اور ایمان یہ ہے کہ دل سے ان تمام احکام کی تصدیق کی جائے جو حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے اور جب کہ کوئی مانع نہ ہو تو زبان سے اپنے اس تصدیق کا اقرار بھی کرے، کفر کی تعریف صرف انکار کے ساتھ کرنا اپنے تمام افراد کے لئے جامع نہیں ہے کیونکہ اس تعریف سے شک بھی نکل جائے گا اور اگر ذہن بالکل ایمان و کفر سے خالی ہو تو وہ بھی کفر کی اس تعریف سے نکل جائے گا، پہلی تعریف کے مطابق ایمان و کفر میں تقابل عدم والملکۃ ہے جبکہ دوسری تعریف کے مطابق تضاد کا تقابل ہے۔"[۱]

کفر کی مختلف قسمیں

کفر کی مختلف قسمیں ہیں، تمام اقسام میں قدر مشترک وہی ہے جو اُوپر "تعریف" کے عنوان سے واضح کیا جاچکا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تعلیمات لے کر آئے، ان میں آپ ﷺ کی تصدیق نہ کرنا کفر ہے، اس تصدیق نہ کرنے کی مختلف شکلیں ہیں جن کو کفر کی اقسام کہا جاتا ہے۔

---

[۱] الطريقة المحمدية، القسم الثاني في الأخلاق الذميمة،الأول الكفر بالله تعالىٰ، ص:۱٦٢.

اب اس بحث کو اگر مرتب انداز میں کوئی سمجھنا چاہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر انسان یا تو خالق کائنات کا اقرار کرے گا یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل نہیں تو وہ دہری کہلاتا ہے، اور اگر وجودِ خداوندی کا اعتراف کرتا ہے تو اس کے بعد یہ مرحلہ ہے کہ کیا کائنات کا یہ عظیم خالق اپنی ذات و صفات میں اکیلا ہے یا اس کا کوئی شریک و سہیم بھی موجود ہے؟ جو لوگ خدا تعالیٰ کے ساتھ دوسرے افراد یا اشیاء کو بھی شریکِ کار بتاتے ہیں ان کو مشرک کہا جاتا ہے۔

خالقِ کائنات کے وجود اور وحدانیت کے ماننے بعد اگلا نکتہ یہ ہے کہ آیا وہ سلسلہ نبوت کا قائل ہے یا نہیں؟ کیا وہ یہ مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اصلاح و ہدایت کے لئے اپنے کچھ برگزیدہ بندوں کا انتخاب کرتا ہے اور پھر ان کو نبی بنا کر بھیجتا ہے؟ براہمہ سرے سے نبوت کے ہی قائل نہیں ہیں، اسی طرح بعض فلاسفہ جو اپنی ناقص عقل کے بل بوتے پر معرفتِ خداوندی اور وصول الی اللہ کے مدعی ہیں، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں نبی کو واسطہ بنانے کو اپنی ذلت و توہین سمجھتے ہیں۔

جو افراد سلسلہ نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا، ان لوگوں کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم ان افراد کی ہے جو اس سلسلہ کے کئی شخصیات کی نبوت کا یقین رکھتے ہیں، لیکن سرورِ کائنات ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں کہ یا تو نعوذ باللہ، آپ کو نبی ہی تسلیم ہی نہیں کرتے یا نبی تو مانتے ہیں لیکن صرف عرب تک آپ ﷺ کی بعثت کو محدود تصور کرتے ہیں، اس قسم کے افراد بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے اور بعض پر ایمان نہ لانے کی بناء پر یہودی، عیسائی اور مجوسی وغیرہ ناموں کے ساتھ مشہور ہیں۔

اس کے مقابلے میں جو لوگ تمام حضرات انبیاء کرام کی نبوت کو تسلیم کرنے

کے ساتھ ساتھ حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کیلئے آپ کو رسول بنا کر بھیجا، ان کو مسلمان کہا جاتا ہے۔

ان مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص نعوذ باللہ کفر اختیار کرے یعنی ایک مرتبہ حلقہ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد دوبارہ کافر ہو جائے تو اس کو "مرتد" اور اس طرح کرنے کو "ارتداد" یا "ردّت" کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہلانے اور ظاہر کرنے کے باوجود غلط عقائد اور خلافِ اسلام نظریات کا پرچار کرے، اسلام و ایمان کے نام پر کفریہ عقائد وخیالات کی تبلیغ کرتا رہے تو اس کو "زندیق" اور اس جرم کو "الحاد" اور "زندقہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

محلِ انکار کے اعتبار سے کفر کی قسمیں

ایمان و کفر کا دار مدار چونکہ انکار و تصدیق پر ہے اور اس انکار کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بنیادی طور پر اس کی چار شکلیں ہیں، کیونکہ یہ انکار یا تو:

۱۔ دل و زبان دونوں سے ہو گا یعنی دل میں بھی دین اسلام کی تصدیق نہ کرے اور زبان سے بھی اس کا اقرار نہ کرے۔

۲۔ یا صرف زبان سے ہو گا۔

۳۔ اور یا یہ انکار صرف دل ہی دل میں پوشیدہ ہو گا۔

پہلی صورت میں اس کو "کفر انکار" کہا جاتا ہے جو کہ کفر کی اصل شکل ہے، اور دوسری صورت کو "کفر جحود" سے تعبیر کیا جاتا ہے، کفر کی اس قسم میں صرف زبانی انکار

ہوتا ہے، دل میں حضور ﷺ اور دین اسلام کی تصدیق موجود ہوتی ہے۔ تیسری صورت کو "کفر نفاق" کہا جاتا ہے۔

۴۔ انکار کی چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی دل میں بھی حضور ﷺ اور دین اسلام کی تصدیق کرے اور زبان سے بھی اس کی حقانیت کا اعتراف کرے، لیکن اس کے باوجود محض ہٹ دھرمی، ضد اور عناد کی وجہ سے اس کے قبول کرنے سے انکار کرے، اس کو "کفر عناد" کہا جاتا ہے۔[۱]

****

[۱] شرح المواقف، تذنیب فی أصناف الکفار قبیل المقصد الرابع ج۸ص ۳٦٤. وشرح المقاصد، المقصد السادس فی السمعیات قبیل المبحث الرابع فی حکم من مخالف الحق من أهل القبلة، ج۳ص ٤٦١. فتح الملهم، کتاب الإیمان، ج۱ص ٥١١.

بابِ دوم

- تکفیر کے باب میں احتیاط سے متعلق قرآنِ کریم اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعلیم وہدایت
- فقہاءِ کرام کا قدم بقدم اس کا اہتمام اور سلفِ صالحین کا تعامل
- لزوم اور التزامِ کفر کا مسئلہ
- مختلف نصوص میں لفظ "کفر" کے متعلق اہلِ سنت کا مؤقف
- بروقت تکفیر نہ کرنے کے نقصانات اور اسکے متعلق حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کا اجتماعی تعامل
- اہل قبلہ کی تکفیر کا مسئلہ
- حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ الفاظِ کفر کی حیثیت

باب دوم

اسلام اور کفر دو ایسے حقائق ہیں جن پر دین حق کے بہت سے احکام متفرع ہوتے ہیں، شریعتِ مطہرہ نے مسلمان اور کافر کے درمیان بہت سے احکامات میں فرق برقرار رکھا ہے، دینی اور دنیوی بیسیوں اُمور میں دونوں مختلف ہیں اوراحکام کے اس اختلاف کی ایک بڑی بنیاد ایمان وکفر ہے۔

دنیامیں کسی کافر کو سلام کرنا، اس کے ساتھ رشتہ ناطہ کرنا، مودت ومحبت کی فضا قائم کرنا، اس کی نماز جنازہ پڑھنا، اس کو کسی مسلمان کی میراث دینایااس کاترکہ میراث میں سے لینا، اس کے حق میں دعائے مغفرت کرناوغیرہ وغیرہ شرعاً جائز نہیں، جبکہ یہی اُمور کسی مسلمان کے بارے میں بالکل جائز، بلکہ ان میں سے بعض تواس کے حقوق ہیں، جن کی ادائیگی کاشریعت نے حکم دیا۔

یہ تودنیوی زندگی کے اندر فرق تھااورآخرت کامعاملہ توبالکل واضح ہے کہ ایمان وکفرکے اصل نتیجہ کااعلان وہیں جاکر ہو گا، ایمان کے بنیادی ثمرات وبرکات اور کفر کے اصل انجام وعاقبت کانظارہ بھی وہیں ہوناہے، وہاں تواسلام اور کفر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مختلف ہو جائیں گے۔

جب ان جیسے بنیادی اُمور میں تفریق کاواحد مداراسلام وکفرہی ہے توکسی کوکافر کہنے کامطلب یہ ہواکہ وہ ان تمام حقوق سے محروم ہے، اسلامی معاشرے کے اندراس کے ساتھ ان تمام اُمورمیں امتیازی سلوک کیاجائےاورآخرت میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمت سے نکل کر جہنم کاایندھن بنے گا، اس کے ساتھ کسی مسلمان کارشتہ وناطہ جائز

نہیں رہے، مسلمان کی مودت ومحبت اور دوستانہ تعلقات سے وہ یکسر محروم رہے گا، نمازِ جنازہ پڑھے جانے کی سعادت سے وہ محروم رہے گا اور دعائے مغفرت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق نہیں بن سکتا۔

اگر ان تمام احکامات کی اصل اساس اور بنیاد پر غور کیا جائے تو وہ یہی "تکفیر" ہی ہے، کافر ہونے یا قرار دینے کی وجہ سے شریعت کے ان تمام احکامات میں تبدیلی آئی، اس لئے شریعتِ مطہرہ میں اس بات پر انتہائی زور دیا گیا کہ تکفیر کے سلسلہ میں انتہائی رعایت برتی جائے، حتی الامکان کسی مسلمان کو کافر کہنے سے قطعی گریز کیا جائے، تاکہ ایک لمحہ کی غلطی صدیوں کی سزا کا سبب نہ بنے۔

اس باب میں شریعتِ مطہرہ کے اسی احتیاطی پہلو اوراس کے مختلف مظاہر بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تکفیر میں افراط کرنا

کسی کو کافر کہنے کے بارے میں قرآن کریم کی ہدایت

قرآن کریم میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب تک پوری طرح تحقیق نہ کی جائے تب تک کسی کو بلاوجہ کافر / غیر مسلم نہ کہا کریں، بلکہ اوّلاً پوری طرح تحقیق کر لیا کریں، اس کے نتیجہ میں اگر واقعۃً ایسے شواہد ملیں جن سے واضح طور پر اس کا کفر معلوم ہو جاتا ہو تو پھر اس کے مطابق عمل کریں۔

ارشادِ خداوندی ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

فَعِنْدَ اللهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا-

"اے ایمان والو، جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے۔ دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش میں یوں مت کہدیا کرو کہ تو مسلمان نہیں، کیونکہ خدا کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں، پہلے تم بھی ایسے ہی تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا، سو غور کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔"[۱]

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "تحقیق" کرنے کا حکم دیا کہ کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں "سفر" کی قید اتفاقی ہے، جس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عام طور پر اس قسم کے واقعات سفر ہی میں پیش آجاتے ہیں۔

اگلے جملہ میں یہ ہدایت کی گئی کہ جو کوئی بھی آپ کو سلام کرے یا مسلمانوں کے سامنے اپنی اطاعت ظاہر کرے تو اگرچہ سلام کرنے کے علاوہ اس کے مسلمان ہونے کی کوئی اور دلیل موجود نہ ہو، لیکن اس کے باوجود اس کو کافر مت کہو، بلکہ پہلے خوب تحقیق کرو، کیونکہ سلام کرنا یا مسلمانوں کی اطاعت میں داخل ہونا بظاہر اس بات کی علامت ہے کہ ایسا کرنے والا مسلمان ہے اور ایمان و کفر کا دارومدار ظاہر ہی پر ہوتا ہے، لہٰذا جب تک اس ظاہر کے خلاف کوئی یقینی دلیل نہ ملے تب تک اس کو کافر کہنے کا حق حاصل نہیں۔

---

[۱] النساء : ٩٤

امام جصاص رازی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا کہ اگرچہ قرآن کریم کے ظاہری اُسلوب سے یہ واضح نہیں ہو رہا کہ ایسے شخص کو مسلمان کہا جائے، بلکہ صرف غیر مسلم کہنے سے ممانعت کی گئی اور مزید تحقیق کرنے کا حکم دیا، لیکن متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مسلمان ہی کہا جائے گا، چنانچہ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں ایک شخص کو قتل کیا تو حضور ﷺ نے اس پر سخت عتاب کیا اور ارشاد فرمایا: " أقتلت مسلما؟" گویا آپ ﷺ نے اس کو مسلمان قرار دیا[۱]۔

تکفیر میں نہایت احتیاط سے متعلق حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیم

آپ ﷺ نے متعدد احادیث میں بے جا کسی کو کافر کہنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، متعدد روایات سے ثابت ہے کہ جو کوئی شخص کسی مسلمان کو کافر کہتا ہے تو اگر واقعۃً اس سے کوئی کفریہ قول و فعل سرزد ہوا ہو، تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر اس سے اس طرح کسی عمل کا صدور نہیں ہوا جو موجب کفر ہو اور اس کے باوجود کسی نے اس کو کافر کہا تو یہ کفر خود کہنے والے کی طرف لوٹتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا قال الرجل لأخيه يا كافر، فقد باء به أحدهما-

"جب کوئی مسلمان اپنے (مسلمان) بھائی کو کافر کہہ کر پکارتا ہے تو یقیناً یہ لفظ دونوں میں کسی ایک کے لئے ثابت ہوا۔ (یعنی دونوں میں سے کوئی ایک ضرور

---

[۱] أحكام القرآن للجصاص الرازی، سور النساء، ج۲ ص ۳۵۰، دارالكتاب، كوئٹه.

کافر ہوا)۔" [۱]

مسند احمد کی روایت سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے، چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ:

حدثنا نافع، أن عبد الله بن عمر أخبره، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: " إذا قال الرجل لصاحبه: يا كافر، فإنها تجب على أحدهما، فإن كان الذي قيل له كافرفهو كافر، وإلا رجع إليه ما قال-[۲]

حضور ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے مسلمان ساتھی کو کافر کہہ کر پکارتا ہے تو یہ (کافر بننے کی بات) ان دونوں میں سے کسی کے حق میں ضرور ثابت ہو جاتی ہے، جس شخص کو کافر کہا گیا ہے، اگر وہ حقیقت میں بھی کافر تھا، تب تو وہی کافر ہے ورنہ تو کہنے والے کی طرف یہ بات واپس لوٹتی ہے (اور اس کی وجہ سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔)

امام طحاوی رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے کہ:

عن أبي ذر قال: سمعت النبي عليه السلام يقول: لا يرمي رجل رجلا بالفسق، أو الكفر إلا ردت عليه إن لم يكن صاحبه كذلك-

---

[۱] صحيح البخاري،كتاب الأدب، باب من كفرأخاه بغيرتأويل فهو كماقال، رقم الحديث: ٦١٠٤.

[۲] مسند أحمد ،مسند عبد الله بن عمررقم الحديث: ٥٨٢٤،ج١٠ص ٨٤،مؤسسة الرسالة.

کوئی شخص دوسرے پر فسق یا کفر کی تہمت لگاتا ہے تو اگر مخاطب اس تہمت کا مستحق نہ ہو تو یہ کلمہ کہنے والے ہی پر واپس لوٹتا ہے۔"[۱]

ان احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو کافر کہنے میں انتہائی احتیاط برتنی ضروری ہے، اگر اس میں ذرا سی بے احتیاطی کی جائے اور کسی ایسے شخص کو کافر کہا جائے جو واقعۃً کافر نہ ہو تو خود کہنے والا ہی کافر بن جاتا ہے، بعض حضرات محدثین کرام نے اس کی یہ توجیہ فرمائی ہے کہ کہنے والے کی طرف کفر نہیں لوٹتا، بلکہ اس کہنے کا وبال اور گناہ اس کے سر آجاتا ہے، لیکن امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس کے بعد جو روایت نقل فرمائی اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ توجیہ صحیح نہیں۔

چنانچہ آپ اپنی سند کے ساتھ مزید روایت نقل کرتے ہیں:

قال النبي عليه السلام: ما شهد رجل على رجل بالكفر إلا باء بها أحدهما إن كان كافرا فهو كما قال، وإن لم يكن كافرا فقد كفر بتكفيره إياه-

"حضور ﷺ نے فرمایا: جب بھی کوئی شخص دوسرے کے کافر ہونے کی گواہی دیتا ہے تو دونوں میں سے کوئی ایک ضرور اس کا مستحق ٹھہرتا ہے، اگر مخاطب حقیقت میں کافر تھا تب تو وہی کافر ہے اور اگر وہ کافر نہ تھا تو خود کہنے والا (مسلمان کو) کافر کہنے کی وجہ سے کافر ہو چکا۔"[۲]

---

[۱] شرح مشكل الآثار ،باب بيان مشكل ما روي عنه عليه السلام فيمن قال لأخيه: يا كافر،ج۲ص۳۲۲.

[۲] نفس المصدر.

معلوم ہوا کہ تکفیر کے باب میں ذرا سی بے احتیاطی انسان کو کفر کی حدود تک لے جاسکتی ہے، اور کسی مسلمان کو ذرا ذرا سی بات پر کافر کہنے کی وجہ سے خود کہنے والا اسلام سے نکل سکتا ہے، وجہ اس کی ظاہر ہے، کیونکہ کسی مسلمان کو کافر کہنے کا مقصد یہی ہے کہ وہ جس دین و نظریہ کا حامل ہے وہ کفر ہے، اور جب وہ مسلمان ہو، کوئی کفریہ بات اس سے صادر نہیں ہوئی تو گویا اس کے اسلام و ایمان ہی کو کفر کہا جارہا ہے، اور یہ یقیناً کفر ہے۔

امام طحاوی کی ذکر کردہ توجیہ

امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی اس قسم کی تمام احادیث کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

فتأملنا ما في هذا الحديث طلبا منا للمراد به ما هو؟ فوجدنا من قال لصاحبه: يا كافر معناه أنه كافر لأن الذي هو عليه الكفر فإذا كان الذي عليه ليس بكفر، وكان إيمانا كان جاعله كافرا جاعل الإيمان كفرا، وكان بذلك كافرا بالله تعالىٰ؛ لأن من كفر بإيمان الله تعالىٰ فقد كفر بالله، ومنه قول الله: ومن يكفر بالإيمان فقد حبط عمله، وهو في الآخرة من الخاسرين- فهذا أحسن ما وقفنا عليه من تأويل هذا الحديث والله نسأله التوفيق. [۱]

"ہم نے اس حدیث کے اصل مقصود کو جاننے کے لئے غور کیا تو یہ بات واضح

[۱] نفس المصدر.

ہوئی کہ کسی کو کافر کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس دین پر وہ قائم ہے وہ کفر ہے، لہٰذا اگر کسی کا دین کفر نہ ہو بلکہ ایمان ہو تو اس کو کافر قرار دینے والا گویا خود ہی ایمان کو کفر قرار دے رہا ہے، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کا منکر ہوا، کیونکہ جو کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا انکار کرے تو اس نے خود اللہ ہی کا انکار کیا۔۔

۔۔ہماری معلومات کے مطابق یہ اس حدیث کی سب سے بہتر توجیہ ہے۔"

بلا تحقیق کفر کا حکم جاری کرنے پر حضور ﷺ کی طرف سے سخت سرزنش

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں جنگ کے دوران کسی کافر سے لڑنے لگوں اور وہ تلوار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے، پھر کسی درخت وغیرہ کی اوٹ میں مجھ سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرے اور یہ کہے کہ میں اسلام لایا یا کلمہ پڑھے، تو کیا ایسی سنگین صورتِ حال میں اس کو قتل کر سکتا ہوں؟ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: کہ نہیں، آپ اس کو قتل نہ کریں، حضرت مقداد نے دوبارہ استفسار کیا کہ حضور ﷺ: اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کے بعد ہی یہ کلمہ کہا (اسلام میں واقعی رغبت رکھنے کی وجہ سے نہیں کہا بلکہ جان بچانے کا ایک حیلہ ہے) حضور ﷺ نے فرمایا:

لا تقتله فإن قتلته فإنه بمنزلتك قبل أن تقتله، وإنك بمنزلته قبل أن يقول كلمته التي قال.

"اس کو قتل نہ کرو، کیونکہ اگر تم نے اس کو قتل کیا تو وہ اس درجہ پر ہو گا جس پر آپ قتل کرنے سے پہلے تھے اور تم اس درجہ پر ہو جاؤ گے جس پر وہ اس کلمہ کے کہنے سے پہلے تھا۔"[۱]

[۱] صحیح مسلم، کتاب الإيمان، باب تحريم قتل الكافر بعد أن قال: لا إله إلا

بظاہر تو یہاں قتل کرنے کی ممانعت ہے مگر چونکہ یہ قتل کا جواز اور عدم جواز ایمان کا دعویٰ قبول ہونے اور نہ ہونے پر ہے، اگر اس کہنے سے وہ مسلمان بنا تو اس کو قتل کرنا ناجائز ہے اور اگر محض اس کہنے کی وجہ سے اس کو مسلمان قرار نہ دیا جائے، بلکہ بدستور کافر ہی کہا جائے تو اس کو قتل کرنا جائز ہے۔ اس لئے اس حدیث شریف میں ایمان و کفر کا حکم لگانے سے متعلق احتیاط کی ضرورت بھی واضح ہے کہ اگر کسی شخص میں اسلام کا کوئی قرینہ موجود ہو تو وہاں کافر قرار دینے اور اس کے احکامات جاری کرنے میں جلد بازی سے کام لینا جائز نہیں۔

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے اس کی مزید تاکید ثابت ہو جاتی ہے، جو اسی روایت کے بعد امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جہینہ سے لڑائی کے دوران میرا ایک کافر سے مقابلہ ہوا، جب میں نے اس کو بالکل قابو کر لیا تو اس نے جھٹ سے "لا إله إلا الله" کہا میں نے یہ سمجھ کر نیزہ مارا کہ یہ اسلام لانے کے لئے کلمہ نہیں پڑھ رہا بلکہ جان بچانے کی ایک جنگی سازش کرتا ہے اس لئے اس کہنے کی پرواہ نہیں کی بلکہ نیزہ مار کر قتل کر دیا، وہ نیزہ لگنے سے مرا لیکن میرے دل میں خلش باقی رہی۔ واپسی کے بعد حضور ﷺ کے دربار عالیہ میں یہی کچھ عرض کر دیا تو حضور ﷺ نے انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں فرمایا:

أ قال لا إله إلا الله وقتلته؟ قال: قلت: يا رسول الله، إنما قالها خوفا من السلاح، قال: أفلا شققت عن قلبه حتى تعلم أقالها

الله، رقم الحديث: ١٥٥.

أم لا؟

"کیا اس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے پھر بھی اس کو قتل کر دیا؟ (حضرت اُسامہ نے عرض کیا کہ) اس نے یہ کلمہ اسلحہ کے ڈر سے کہا تھا (دل سے ایمان لانا مقصود نہ تھا) تو حضور ﷺ نے فرمایا: تو تم نے اس کا دل کیوں نہیں چیرا کہ تم جان لیتے کہ اس نے یہ کلمہ (دل سے) کہا تھا یا نہیں؟

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے یہ وجہ بھی بیان کر دی تھی کہ یہ شخص کوئی معمولی کافر نہ تھا، بلکہ کئی ایک مسلمانوں کو اس نے قتل کر دیا اور کفر کی خاطر بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ لڑا، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ اس پر نہایت غمگین ہوئے اور حضرت اُسامہ کو بار بار ملامت کرتے رہے۔

کئی بار تنبیہ اور عتاب کی وجہ سے خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا یہ حال ہو گیا کہ وہ یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش، میں آج ہی حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا، تا کہ اسلام لانے کی وجہ سے یہ گناہ مٹ جاتا۔

اس روایت سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ کفر اور کافر کہنے میں اور کفر کے احکامات جاری کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، مسلمان قرار دینے کے لئے تو اتنا کہنا کافی تھا کہ اس نے لا الہ الا اللہ پڑھا، لیکن کافر قرار دینے کے متعلق ٹھوس دلیل کی ضرورت تھی، صرف یہ احتمال ہرگز کافی نہ تھا کہ یہ جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا ہے، کیونکہ ایمان و کفر کا دار مدار اگرچہ اصلاً نیت پر ہے لیکن دنیا میں چونکہ دل کی حقیقی صورت حال اور تصدیق و تکذیب ہم کو یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی، اس لئے شریعتِ مطہرہ نے زبانی اقرار و اظہار پر اس کی بنیاد رکھی، لہٰذا جو کوئی بھی اپنے مسلمان ہونے کا مدعی ہو یا زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرے تو اس کو بلاوجہ کافر کہنا سخت جرم ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت اُسامہ سے یہ بھی فرمایا تھا:

فكيف تصنع بلا إله إلا الله إذا جاءت يوم القيامة؟ قال: يا رسول الله، استغفر لي، قال: كيف تصنع بلا إله إلا الله إذا جاءت يوم القيامة؟

" قیامت کے دن جب لا الہ الا اللہ آئے گا تو آپ اس کے ساتھ کیا کروگے؟ اُسامہ نے عرض کیا کہ میرے لئے استغفار فرمائیں، حضور ﷺ نے (پھر) فرمایا کہ قیامت کے دن جب لا الہ الا اللہ آئے گا تو آپ اس کے ساتھ کیا کروگے؟"[۱]

حضور ﷺ کے ان کلمات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے "لا الہ الا اللہ" کہنے کا اعتبار فرمایا، تبھی بار بار کہہ کر اُسامہ رضی اللہ عنہ پر عتاب فرماتے رہے۔

دربارِ نبوت کی طرف سے خصوصی ہدایت

بعض احادیث میں حضور ﷺ نے خصوصی ہدایت فرمائی کہ کسی گناہ کی وجہ سے مسلمان کی تکفیر ہر گز نہ کی جائے، امام ابوداؤد رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ روایت نقل فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " ثلاث من أصل الإيمان: الكف عمن قال: لا إله إلا الله، ولا نكفره بذنب، ولا نخرجه من الإسلام بعمل-

---

[۱] نفس المصدر.

" تین چیزیں اصل ایمان میں سے ہیں، جو کوئی لا الہ الا اللہ کہے، اس سے رُکنا (یعنی) اس کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار نہ دینا اور نہ ہی کسی (غلط یا ناجائز) کام کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج سمجھنا۔ "[۱]

اس حدیث میں یہ بنیادی سبق دیا گیا کہ کلمہ گو مسلمانوں کی تکفیر سے حتی الامکان بچنا ضروری ہے، کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر قرار دینا یا کسی غلطی کی بنیاد پر اس کو دائرہ اسلام سے نکالنا، مسلمانوں کے حقوق سے محروم کرنا ہر گز جائز نہیں، تکفیر مسلم کے حوالہ سے احتیاط و اعتدال ہی ایمان کے بنیادی احکام میں سے ہے۔

ایک اور حدیث مبارک میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے کہ جو شخص اپنے اسلام و ایمان کا دعوی کرے، اس کو بلا وجہ کافر نہ کہا جائے، جو کوئی اس طرح کرے گا، اس کی وجہ سے مخاطب تو کافر نہیں بنے گا لیکن خود یہ کہنے والا کفر کے کنارے تک پہنچ جائے گا۔

امام طبرانی رحمہ اللہ اپنی سند کیساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ:

عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كفوا عن أهل لا إله إلا الله لا تكفروهم بذنب، فمن أكفر أهل لا إله إلا الله فهو إلى الكفر أقرب.

" لا الہ الا اللہ (کہنے) والوں سے رُکو، ان کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو، کیونکہ جس کسی نے اسکو کافر کہا وہ خود مخاطب سے زیادہ کفر کے قریب ہے۔ "[۲]

---

[۱] سنن أبي داود، باب في الغزو مع أئمة الجور، رقم الحديث: ۲۵۳۲ .

[۲] المعجم الكبير للطبراني،باب العين، سعيد بن المسيب عن عبدالله بن عمر، رقم

ان ہی جیسی متعدد احادیث کی وجہ سے حضرات سلف صالحین نے اس معاملہ میں انتہائی حزم واحتیاط سے کام لیا، اورجب تک کسی کا کفر بالکل واضح نہ ہوا، توان کو مختلف گمراہیوں اور منکرات کے ارتکاب کی وجہ سے اگرچہ فاسق وگمراہ سمجھتے رہے، لیکن کافر کہنے سے ہمیشہ احتراز ہی کیا۔

بے بنیاد تکفیرِ مسلم کے ناجائز ہونے سے متعلق متواتر احادیث

علامہ محمد بن المرتضی الیمانی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۴۰ھ) نے ان جیسی تمام احادیث پر بڑی تفصیل کے ساتھ محققانہ بحث فرمائی ہے اور یہ ثابت فرمایاہے کہ "تکفیرِ مسلم" انتہائی خطرناک جرم ہے، بہت سی احادیث میں اس سے سختی کے ساتھ منع فرماگیا، بلکہ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے حضور ﷺ سے نقل فرمایاہے کہ کسی دلیل واستحقاق کے بغیر کسی کوکافر قرار دیناخود موجبِ کفر ہے اوراس طرح کرنے سے کسی کو کافر قرار دینے والا ہی کافر بن جاتاہے۔

صحابہ کرام میں سے حضرت سیدناابوذر غفاری، ابوہریرہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر بن الخطاب، ابوسعید خدری رضوان اللہ علیہم وغیرہ حضرات نے یہ روایت نقل فرمائی ہے اوراس روایت کے اتنے طرق اورمؤیدات ہیں جن کی وجہ سے یہ حدیث محققین کے نزدیک درجہ تواتر تک پہنچ جاتی ہے۔[١]

الحديث:١٣٠٨٩.

[١] راجع للتفصيل كتابه: إيثار الحق علي الخلق في رد الخلافات إلى المذهب الحق من أصول التوحيد، ص٤٢٠ تا٤٢٧.

تکفیرِ مسلم میں احتیاط ایک بنیادی فقہی اُصول کی روشنی میں

اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ جب کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر احکام اسلام کو قبول کرلیتا ہے تو وہ یقیناً دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے، اس کے بعد اس پر مسلمانوں ہی کے احکامات جاری ہوتے ہیں، لہٰذا جب تک اس سے اسلام کے خلاف کوئی امر سرزد نہ ہو، تب تک استصحابِ حال کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو مسلمان ہی کہا جائے گا، اگر خدانخواستہ اس سے کوئی ایسا قول و فعل صادر ہو جائے جس میں کفر اور اسلام دونوں کا احتمال ہو، تب بھی محض اس کی بنیاد پر اس کو کافر قرار دینا درست نہیں، کیونکہ اس قول و فعل سے پہلے وہ یقیناً مسلمان تھا اور اس کے بعد اس کے اسلام میں شک ہو گیا کہ آیا وہ مسلمان رہا یا نہیں؟

اور یہ اُصول تمام حضرات فقہاء کرام کے درمیان مسلم ہے کہ "الیقین لایزول بالشك" لہٰذا اس محتمل عمل کے صدور کی وجہ سے اس کو کافر قرار دینا جائز نہیں۔

مشہور حنفی فقیہ علامہ محمود بن اسرائیل بن قاضی سماوہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "جامع الفصولین" میں کفریہ کلمات وافعال کے متعلق ایک مستقل باب باندھا ہے، جس میں متقدمین اور متاخرین تقریباً اکثر فقہاءِ احناف کے ذکر کردہ الفاظ نقل کئے، اس باب کے شروع میں بطورِ میزان کے یہی اُصول ذکر فرمایا ہے:

آپ تحریر فرماتے ہیں:

روى الطحاوي عن "ح" رحمه الله وأصحابنا أنه لا يخرج الرجل من الإيمان إلا جحود ما أدخله فيه ثم ما يتقين بأنه ردة يحكم بها له وما يشك بأنه ردة لا يحكم بها إذ الإسلام الثابت لا يزول بشك مع أن الإسلام يعلو.

"امام طحاوی رحمہ اللہ امام ابو حنیفہ اور ہمارے دیگر ائمہ احناف سے نقل کیا ہے کہ انسان ایمان سے اُنہی چیزوں کے انکار کی وجہ سے نکلتا ہے جن (پر ایمان لانے) کی وجہ سے وہ ایمان میں داخل ہوا تھا، پھر (تکفیر کا ضابطہ یہ ہے کہ) جن چیزوں کے کفر وارتداد ہونے کا یقین ہو، اس پر کفر کا حکم لگایا جائے گا اور جن اُمور کے بارے میں شک ہو تو اسکو بنیاد بنا کر کفر کا فیصلہ نہ کیا جائے، کیونکہ ثابت شدہ اسلام شک کی وجہ سے ختم نہیں ہوتا، ساتھ یہ بھی ہے کہ اسلام ہی غالب ہوتا ہے۔"[۱]

امام طحاوی رحمہ اللہ نے خود بھی اپنے رسالہ" العقيدة الطحاوية" میں اہل سنت والجماعت کے ضروری عقیدے کے طور پر یہ عبارت ذکر فرمائی ہے۔

فقہاءِ کرام کا تکفیر سے متعلق نہایت درجہ احتیاط برتنا

تکفیر کے بیسوں احتمالات کے باوجود کسی کو کافر نہ قرار دینا اور اسی وجہ سے ان ہی مذکور بالا روایات واُصول کی روشنی میں حضرات فقہاءِ کرام نے بھی اس باب میں خصوصی احتیاط کا اہتمام کیا کہ جب تک کسی شخص کا کفر بالکل واضح نہیں ہوا، تب تک اس کو کافر کہنے سے گریز ہی کرتے رہے، اور متعدد فقہی جزئیات کا مدار ہی اس احتیاط پر رکھا۔

چنانچہ اکثر فقہاءِ حنفیہ نے یہ مسئلہ ذکر فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جائے جس میں اکثر ممکنہ احتمالات کفر ہی کا تقاضا کرتے ہوں، اور صرف ایک احتمال اس کے مسلمان باقی رہنے کا موجود ہو تو مفتی کے لئے ضروری ہے کہ جب تک اس کا واضح

---

[۱] جامع الفصولين، الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية. ج ۲ ص ۱٦۳.

مؤقف سامنے نہ آئے، اس وقت تک اسی ایک احتمال ہی کو ترجیح دے اور اس کو کافر نہ کہے۔

علامہ ابنِ قاضی سماوہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اعلم أنه لو كان في المسألة وجوه توجب الكفر ووجه واحد يمنع التكفير فعلى المفتى أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير تحسيناً للظن بالمسلم ثم لو كانت نية القائل ذلك فهو مسلم ولو كانت نيته الوجه الذي يوجب الكفر لا ينفعه حمل المفتي كلامه فيؤمر بالتوبة وتجديد النكاح-

"یاد رکھو کہ اگر کسی مسئلہ میں ایسے متعدد احتمال ہوں جو موجبِ کفر ہوں اور ایک احتمال تکفیر سے بچنے کا بھی موجود ہو تو مفتی کی ذمہ داری ہے کہ مسلمان پر اچھا گمان کرتے ہوئے اسی احتمال کی طرف جھکے جو تکفیر سے مانع ہے، اگر کہنے والے کی نیت بھی یہی احتمال ہو تو اس کے مطابق وہ حقیقت میں بھی مسلمان رہے گا اور اگر اس کا ارادہ اسی احتمال کا ہو جو موجبِ کفر ہے تو مفتی کی توجیہ اس کے حق میں مفید نہیں ہوگی، بلکہ اس کو توبہ کرنا اور نکاح کی تجدید کرنے کا حکم دیا جائے گا۔"[۱]

فقہاءِ کرام کے نزدیک کفر اور تکفیر میں فرق کی رعایت

اس سے معلوم ہوا کہ کفر اور چیز ہے اور تکفیر اس سے بالکل الگ چیز ہے، اگر کہنے والا کا مقصود وہی کفریہ توجیہ تھی اور اسی مقصد کے لئے اس نے یہ کلمہ کہا تھا تو کہتے ہی وہ کافر ہوا، لیکن مفتی ظاہر کا مکلف ہے، وہ محض احتمال کی بنیاد پر اس کو کافر نہیں قرار دے سکتا،

[۱] نفس المصدر.

کیونکہ اس کلمہ کہنے سے پہلے اس کا اسلام یقینی تھا اور اس پر تلفظ کرنے کے بعد اس میں شک پیدا ہو گیا جو یقین کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں، لہٰذا جب تک خود متکلم کسی کفریہ احتمال کا التزام نہ کرے، تب تک مفتی اس کو حتمی طور پر کافر نہیں قرار دے سکتا۔

لزوم کفر اور التزام کفر کی تفریق: احتیاط کا ایک مظہر

اسی سے ملتا جلتا لزوم کفر اور التزامِ کفر کا مسئلہ بھی ہے جو فقہاءِ کرام کا اس باب میں انتہائی احتیاط سے کام لینے کا ایک مظہر ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسا کلمہ صادر ہو جائے جو بذاتِ خود تو موجبِ کفر نہ ہو، لیکن اس سے کفر لازم آ رہا ہو یا کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے تو کسی شخص کو کافر قرار نہ دیا جا سکتا ہو، لیکن اس فعل کا لازمی نتیجہ کفر ہے تو کیا اس لازم کو دیکھتے ہوئے اس شخص کی تکفیر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

اگر اس پہلو پر نظر رکھی جائے کہ جب کوئی شخص کسی کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے لوازمات پر بھی عام طور پر نظر ہوتی ہے، کام کرنے کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کرنے والے نے اس کام کو کرتے ہوئے اس کے تمام لوازمات بھی اپنے اختیار سے سرانجام دیئے ہیں، اور جب کوئی بات لازم کفر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جس قول و عمل کے ساتھ یہ لازم متعلق ہے اس کا مرتکب بھی کافر ہو کیونکہ "إذا ثبت الشئی ثبت بلوازمه" کا قاعدہ مسلم ہے، اب کیا اس قاعدہ کے مطابق اس کو کافر قرار دیا جائے یا نہیں؟

محققین فقہاءِ کرام اور اُصولیین حضرات کا مؤقف یہ ہے کہ یہ شخص کافر نہیں ہو گا، جب تک خود اس کفر کا التزام نہ کرے تب تک محض لزوم کی وجہ سے اس کو کافر قرار دینا درست نہیں، مثلاً معتزلہ کا مشہور مؤقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صفتِ علم قائم نہیں، جب کہ یہ بات بے شمار نصوص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خالقِ کائنات ہے وہ عالم ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اس صفتِ علم کے انکار کرنے کا لازم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی

موجود نہیں (نعوذ باللہ تعالیٰ) کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اسی ہستی کا نام ہے جو دیگر صفاتِ کمال کے ساتھ ساتھ صفتِ علم سے بھی متصف ہے، غیر عالم تو خدا ہے نہیں، لہٰذا جب کوئی اس صفت کے قیام بذاتہ تعالیٰ کا منکر ہے تو گویا وہ وجودِ خداوندی ہی کا منکر ہے جو کہ کھلم کھلا کفر ہے۔

اسی طرح بعض متقدمین اور متعدد معاصرین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جہت ثابت ہے، خود امام ذہبی اور علامہ ابن قدامہ نے اس پر پوری پوری کتابیں لکھی ہیں اور اس بات کے بڑے شد و مد سے دلائل پیش کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کم از کم جہتِ علو ثابت ہے، جب کہ یہ قاعدہ اتفاقی ہے کہ جہت کا ثبوت جسمیت اور تحدید کو مستلزم ہے، جو چیز کسی طرف یا جہت میں ہوتا ہے وہ لازماً چیز (جسم) ہی ہوتا ہے اور اس کے طول و عرض عمق بالکل متعین اور محدود ہوتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ان نارَوا خیالات کا اثبات یقیناً ایسا کفر ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن ان تمام لوازم کے باوجود اُمت کے معتمد فقہاءِ کرام اور اُصولیین نے معتزلہ کی تکفیر کی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کیلئے جہت کو زور و شور سے ثابت کرنے والے افراد کو کافر قرار دیا، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ جو حضرات ان نظریات کے قائل ہیں، وہ ان کو لوازمات ماننے سے انکار کرتے ہیں، جب ان لوگوں کے سامنے ان کو لوازم کے طور پر پیش کئے جاتا ہے تو وہ اس سے برملا براءت کا اظہار کرتے ہیں۔

مثلاً اگر کسی معتزلی سے کہا جائے کہ جب آپ صفت علم کے منکر ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ تو انکارِ خدا ہے تو وہ قطعاً اس سے انکار کرتا ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے جہتِ فوق کے قائل ہیں، جب ان کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ اس سے تو اللہ تعالیٰ کا جسم ہونا ثابت ہو جاتا ہے جو کہ احتیاج کو مستلزم ہے اور یہ یقیناً کفر ہے تو وہ پوری قوت کے ساتھ اس لازم کا انکار کرتے ہیں، اس لئے اُمت کے مستند فقہاء کرام اور معتمد متکلمین ہمیشہ انکی تکفیر سے باز رہے۔

فقہاءِ کرام کے اس احتیاط کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ یہاں دو الگ الگ چیزیں ہیں، ایک کسی عمل سے کفر کا لازم ہونا اور دوسرا خود اس شخص کا کسی کفریہ قول و عمل کا التزام کرنا۔ ان دونوں میں واضح فرق ہے، لزومِ کفر کو یہ حضرات موجبِ کفر نہیں قرار دیتے، کیونکہ یہ ایک احتمال ہی کے درجہ میں ہے، اس سے یقینی استدلال نہیں کیا جاسکتا، جب کہ سابقہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ یہ بات گزر چکی کہ تکفیر کے لئے کسی واضح اور یقینی بنیاد کا ہونا ضروری ہے، احتمالی اُمور کو بنیاد بنا کر تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

اور دوسری صورت بالاتفاق کفر ہے، کیونکہ جب کوئی شخص اَز خود کسی کفریہ قول و عمل کا التزام کرتا ہے تو یہ اس بات کی واضح دلیل اور یقینی قرینہ ہے کہ اس کے دل میں تصدیق موجود نہیں ہے۔

لزومِ کفر اور التزامِ کفر میں فرق امام عزالدین کی نظر میں

امام عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فإن قيل: يلزم من الاختلاف في كونه سبحانه في جهة أن يكون حادثا؟ قلنا: لازم المذهب ليس بمذهب، لأن المجسمة جازمون بأنه في جهة وجازمون بأنه قديم أزلي ليس بمحدث فلا يجوز أن ينسب إلى مذهب من يصرح بخلافه وإن كان لازما من قوله.

"اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جہت ثابت کرنے اور اس متفقہ مسئلہ میں اختلاف کرنے سے تو لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حادث ہے (جو کہ یقیناً موجبِ کفر ہے) ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کسی مذہب سے جو لازم آرہا ہو وہ

اصل مذہب کی طرح نہیں ہے، کیونکہ مجسمہ جہت میں ہونے پر یقین رکھتے ہیں اور ساتھ قدیم اور ازلی غیر حادث ہونے کا بھی یقین رکھتے ہیں، لہٰذا کسی کی طرف ایسا قول منسوب کرنا درست نہیں جس کے خلاف وہ خود صراحت کر رہا ہو، اگرچہ اس کی بات سے غلط قول لازم بھی آ رہا ہو۔"[۱]

امام شاطبی رحمہ اللہ کا مؤقف

امام ابو اسحاق شاطبی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

الذي كنا نسمعه من الشيوخ أن مذهب المحققين من أهل الأصول أن الكفر بالمآل، ليس بكفر في الحال، كيف والكافر ينكر ذلك المآل أشد الإنكار ويرمي مخالفه به، ولوتبين له وجه لزوم الكفر من مقالته لم يقل بها على حال.

"ہم شیوخ سے یہی سنتے رہے ہیں کہ محققین اُصولیین کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی قول کا مآل یعنی لازم کفر ہو تو ابھی اس کو کفر کہنا درست نہیں، اس کو کفر کیونکر کہا جا سکتا ہے حالانکہ وہ اس لازم کا شدید انکار بھی کرتا ہے اور اگر اس کو واضح ہو جائے کہ اس قول سے کفر لازم آ رہا ہے تو کبھی ایسا قول اختیار نہ کر لیتا۔"[۲]

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[۱] قواعد الأحكام في مصالح الأنام، قاعدة في بيان متعلقات الأحكام، ج۱ ص ۲۰۳.

[۲] الاعتصام للشاطبي،مسائل في حديث افتراق الأمة على ثلاث وسبعين فرقة، ج۲ ص۷۰۸.

لا يلزم إذا كان القول كفرا أن يكفر كل من قاله مع الجهل والتأويل ; فإن ثبوت الكفر في حق الشخص المعين، كثبوت الوعيد في الآخرة في حقه، وذلك له شروط وموانع.

"کسی قول کے کفریہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے ہر کہنے والے کو کافر بھی قرار دیا جائے، اگرچہ وہ اس سے ناواقف ہو یا تاویل کر رہا ہو، کیونکہ کسی خاص آدمی کے حق میں کفر کا ثابت ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ آخرت میں اس کے لئے سزا ثابت کرنا، ان دونوں باتوں کے لئے کچھ شرائط اور کچھ موانع ہیں۔"[۱]

علامہ شامی رحمہ اللہ کی نظر میں لزوم اورالتزام کا فرق

علامہ محمد امین ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے بھی اہلِ کتاب کے ساتھ نکاح کے مسئلہ میں ضمناً اس کی مختصر سی وضاحت فرمائی، آپ لکھتے ہیں:

أما المعتزلة فمقتضى الوجه حل مناكحتهم؛ لأن الحق عدم تكفير أهل القبلة، وإن وقع إلزاما في المباحث اه- وقوله: وإن وقع إلزاما في المباحث معناه، وإن وقع التصريح بكفر المعتزلة ونحوهم عند البحث معهم في رد مذهبهم بأنه كفر أي يلزم من قولهم بكذا الكفر، ولا يقتضي ذلك كفرهم؛ لأن لازم المذهب ليس بمذهبهم.

"دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ معتزلہ کے ساتھ نکاح حلال ہو، کیونکہ حق مسلک یہی

---

[۱] منهاج السنة النبوية، فصل كلام الرافضي على دلالة العقل عنده على الأفعال الاختيارية والرد عليه، ج٥ ص٢٤٠.

ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے، اگر چہ (بعض اوقات) مباحث میں الزاماً تکفیر کی گئی ہے یعنی اگر معتزلہ وغیرہ کے ساتھ بحث و مناظرہ کے دوران ان کے مذہب کی تردید کرتے ہوئے بعض اوقات ایسا کہا گیا ہے کہ یہ بات تو کفریہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے مؤقف سے کفر لازم آرہا ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوں گے، کیونکہ لازمِ مذہب اصلِ مذہب کی طرح نہیں ہوتا (کہ اس کی بنیاد پر تکفیر کی جا سکے)۔[۱]

لزوم بیّن التزام کی طرح ہے

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ لزومِ کفر اور التزامِ کفر کے درمیان بڑا فرق ہے، کسی شخص کو التزامِ کفر کی بنیاد پر ہی کافر قرار دیا جا سکتا ہے، لزومِ کفر کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا جمہور اُمت کے نزدیک خلافِ احتیاط ہے، جیسا کہ امام ابن عبد السلام، امام شاطبی، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ شامی رحمہم اللہ علیہم کے حوالے سے ابھی ذکر ہوا۔

لیکن یہ ساری تفصیل تب ہے جب یہ لزوم پوری طرح یقینی نہ ہو اور اس کے نتیجے میں جو کفریہ احتمال لازم آتا ہے، وہ بھی مکمل طور پر واضح اور معلوم نہ ہو، تبھی اس کی بنیاد پر تکفیر سے بچے رہنا ضروری ہے، لیکن اگر لزوم بالکل یقینی اور لازم بالکل واضح اور معلوم ہو تو وہ لزوم بھی التزام کے حکم میں ہے، جس طرح کفریہ قول و عمل کا التزام کفر ہے، اسی طرح ایسے عمل کا ارتکاب بھی کفر ہے جس کے ساتھ کفریہ احتمال اس درجہ لازم ہو کہ اس کا لزوم ہر عقل مند کو معلوم ہو۔

علامہ ابو البقاء کفوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۹۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱] حاشية ابن عابدين على الدر المختار كتاب النكاح، فصل فی المحرمات، ج۳ص ۴۵.

لزوم الكفر المعلوم كفر، لأن اللزوم إذا كان بينا فهو في الالتزام لا اللزوم مع عدم العلم به.

"اگر کفر کا کوئی لازم معلوم ہو تو اس لازم چیز کا ارتکاب بھی کفر ہے، کیونکہ جب لازم بالکل واضح ہو تو وہ بھی التزام کے حکم میں ہے، البتہ اگر لزوم کا علم نہ ہو تو وہ التزام کی مانند موجبِ کفر نہیں۔"[۱]

سلفِ صالحین کا تعامل اور طریقہ کار

سابقہ نُصوص اور فقہاءِ اُمت کی تصریحات سے شریعتِ مطہرہ کا عمومی مزاج واضح ہو جاتا ہے کہ تکفیر مسلم میں نہایت احتیاط مطلوب ہے، سلف صالحین کو بھی مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کا خوب خوب احساس تھا، اس لئے ان حضرات نے بھی اس باب میں نہایت حزم واحتیاط کا ثبوت دیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق صحیح روایات میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ آپ سے مؤمن ہی محبت کرے گا اور منافق شخص ہی آپ سے بغض رکھے گا، یہ روایت سنن ابن ماجہ میں بھی مذکور ہے، لیکن اس کے باوجود جب خوارج نے آپ کے خلاف بغاوت کی، اور یہ لوگ آپ کے ساتھ نہایت بغض و نفرت کرتے تھے، بلکہ سب و شتم پر اُتر آئے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر آپ کو صاف صاف الفاظ میں کافر کہا کرتے تھے، اس حدیث کے مطابق ان کو منافق قرار دینا بظاہر کوئی مشکل نہ تھا، کیونکہ حدیث کے الفاظ اس مفہوم میں بالکل واضح تھے، لیکن اس کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے نہایت فقاہت

---

[۱] الكليات، فصل الكاف، الكفر، ص: ۷٦٦.

اور احتیاط کا ثبوت دیا۔

خوارج کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دلچسپ جواب

چنانچہ جب آپ سے خوارج کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے بڑا عجیب جواب دیا، حافظ عبدالرزاق صنعانی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ یہ پورا مکالمہ نقل فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

لما قاتل علي رضي الله عنه الحرورية قالوا: من هؤلاء يا أمير المؤمنين أكفارهم؟ قال: من الكفر فروا، قيل: فمنافقون؟ قال: إن المنافقين لا يذكرون الله إلا قليلا وهؤلاء يذكرون الله كثيرا، قيل: فمن هم؟ قال:قوم أصابتهم فتنة عموا فيها وصموا.

"جب حضرت علی رضی اللہ عنہ حروریہ (خوارج) سے قتال کر رہے تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کیا یہ کافر ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کفر ہی سے تو یہ بھاگ نکلے ہیں؟ کہا گیا کہ پھر منافق ہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ منافقین تو اللہ تعالیٰ کو تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں، جبکہ یہ لوگ اللہ کو زیادہ یاد کرتے ہیں (لہٰذا منافقین بھی نہیں ہیں)۔ کہا گیا کہ پھر (آخر) ہیں کون؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ کچھ لوگ ہیں جو فتنے میں مبتلا ہوئے اور اس میں اندھے و بہرے ہو گئے ہیں"۔

آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اس حکیمانہ جواب سے اُمت کو یہ عظیم سبق دیا کہ ذاتی دشمنی اور آپس کی رنجشوں کی بنیاد پر شریعت کی حدود پامال نہ کریں ، اور کسی کو کافر قرار دینے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے۔

علامہ محمد بن المرتضی رحمہ اللہ کا ذکر کردہ ایک عجیب نکتہ

علامہ محمد بن المرتضی الوزیر الیمانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "إيثار الحق على الخلق" میں ایک بڑا ہی عجیب و غریب اشکال کیا ہے۔

اشکال یہ ہے کہ جیسا کہ سابقہ ابحاث میں تفصیل سے ذکر کیا جاچکا کہ متعدد احادیث میں حضور ﷺ نے کسی مسلمان کو کافر قرار دینے سے سختی سے منع فرمایا، بلکہ یہاں تک ارشاد فرمایا کہ اس کی وجہ سے خود تکفیر کرنے والے کی طرف کفر واپس لوٹتا ہے اور یہ روایات درجہ تواتر تک بھی پہنچی ہیں، تو ان احادیث کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے تو اس کو ایسا کافر قرار دیا جائے کہ جس کے کفر میں کوئی اختلاف نہ ہو، لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء کرام ایسے شخص کی تکفیر نہیں کرتے اور محض اس جرم بے احتیاطی کی وجہ سے اس کو دائرہ اسلام سے خارج تسلیم نہیں کرتے۔

ایک علمی اشکال اور اس کا جواب

تو اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ان متواتر احادیث کے باوجود فقہاءِ کرام ایسے شخص کی تکفیر کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ متواتر احادیث بھی کفر کے ثابت کرنے سے قاصر ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر اسے کافر نہ کہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

متواتر احادیث کے باوجود تکفیر نہ کرنے کی تین بنیادی وجوہات

اس اشکال کی طرف متوجہ کرنے کے بعد علامہ مرتضی یمانی رحمہ اللہ نے خود ہی اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور تقریباً بیس پچیس صفحات میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات کی وجوہات ذکر فرمائی ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلف صالحین اور فقہاء کرام مندرجہ ذیل چند وجوہات کی وجہ سے ایسے شخص کی تکفیر میں احتیاط کرتے رہے ہیں۔

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم نے ان جیسے لوگوں کی تکفیر نہیں کی۔ لیکن اس پر یہ اشکال عائد ہوتا ہے کہ متواتر احادیث کی موجودگی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم نے کیوں خاموشی اختیار کی؟ ان صاف احادیث کی موجودگی میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم نے کیوں ان جیسے لوگوں کو کھلم کھلا کافر نہیں کہا؟

حقیقت یہ ہے کہ عمومی تکفیر اور شخص معین کی تکفیر میں بڑا فرق ہے، کسی خاص قول و عمل کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ کفریہ کام ہے، اور چیز ہے اور خاص زید و بکر کو اس کی بنیاد پر کافر قرار دینا اس سے بالکل مختلف ایک اور معاملہ ہے، خود صاحب شریعت ﷺ سے ان دونوں معاملوں کے درمیان فرق ثابت ہے جو تیسرے باب میں انشاء اللہ ذکر کیا جائے گا۔

۲۔ حضور ﷺ کے طرزِ عمل کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف گناہوں کے کرنے والوں کو کافر قرار دینے کا یہ حکم ہر حال میں جاری نہیں ہوتا، بلکہ کسی مسلمان کے بارے میں یہ حکم تب ہی متوجہ ہوگا، جب بلا تاویل قصداً کسی مسلمان کی تکفیر کی جائے، جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ کی کتاب "مشکل الآثار" کے حوالہ سے پہلے ذکر کیا جا چکا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو منافق کہا، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے لمبی نماز پڑھانے والے ایک شخص کو منافق کہا، دونوں واقعات حضور ﷺ کے رُوبرو ہوئے، آپ ﷺ مشاہدہ فرمارہے تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تجدیدِ ایمان کا حکم دیا، نہ ہی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو کلمہ پڑھ کر دوبارہ اسلام میں داخل ہونے کا ارشاد فرمایا۔

۳۔ ان احادیث میں تکفیر مسلم پر کفر کا اطلاق بالکل بجا ہے، لیکن لفظ "کفر" شریعت کی اصطلاح اور قرآن و سنت کے استعمال میں ہمیشہ دائرہ اسلام سے خروج کے معنیٰ

میں نہیں آتا، بلکہ متعدد مواقع پر "کفر دون کفر" (نامکمل کفر) کیلئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے، اس لئے حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں اس پر تفصیل سے بحث فرمائی ہے، تو ممکن ہے کہ یہاں بھی لفظ کفر کا یہی استعمال مراد ہو۔[۱]

مختلف نصوص میں لفظ "کفر" کے استعمال سے متعلق اہلِ سنت کا مؤقف

قرآن وسنت میں مختلف اعمال کے لئے لفظ کفر کا استعمال ہوا، متعدد گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کو "کافر" فرمایا گیا، مثلاً اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ.

"جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے، سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔"[۲]

کسی مسلمان کے ساتھ قتل وقتال کو حضور ﷺ نے کفر کہا:

سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر-

مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے جبکہ اس کے ساتھ لڑنا کفر ہے"[۳]

جو شخص غیر اللہ کی قسم اُٹھائے، اس کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: إيثار الحق على الخلق، ص ٤٢٩ تا ٤٥٢.

[۲] المائدة: ٤٤

[۳] صحيح البخاري، باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله وهو لا يشعر، رقم الحديث: ٤٨.

من حلف بغير الله فقد كفر أو أشرك.

"جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی وہ یقیناً کافر ہوگیا، ایک روایت میں ہے کہ مشرک ہوگیا۔"[۱]

بلاوجہ نماز چھوڑنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:العهد الذي بيننا وبينهم الصلاة، فمن تركها فقد كفر.

"ہمارے اور ان کے درمیان عہد نماز ہے، لہٰذا جو کوئی اس کو چھوڑے تو وہ کافر ہوگیا"۔[۲]

یہ اُن گناہوں کا ایک نمونہ ہے جن کے متعلق قرآن وسنت میں کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔[۳] اب ان نصوص کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان اُمور کا ارتکاب کرے تو وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے، نصوص کے اس ظاہری تقاضا کو دیکھ کر بعض لوگوں نے یہ مؤقف اپنایا بھی تھا۔

لیکن جمہورِ اُمت نے ان کے ساتھ اتفاق نہیں کیا، بلکہ یہاں بھی خاص احتیاط کا دامن تھامے رکھا، جس سے تکفیر مسلم کے باب میں احتیاط کے نئے دروازے کھلتے ہیں، اُمتِ مسلمہ کے مستند حضرات متکلمین اور فقہاءِ کرام نے ان چند نصوص کی بناء پر کسی کی

---

[۱] سنن الترمذي ت شاكر، باب ما جاء في كراهية الحلف بغير الله، رقم الحديث: ١٥٣٥

[۲] سنن ابن ماجه، باب ما جاء فيمن ترك الصلاة، رقم الحديث: ١٠٧٩

[۳] علامہ ابن ابی زمنین مالکی رحمہ اللہ نے اس قسم کی احادیث کو کافی تفصیل ووضاحت کے ساتھ جمع فرمایا، ملاحظہ فرمائیں: أصول السنة لابن أبي زمنين ، باب في الأحاديث التي فيها نفي الإيمان بالذنوب،ص: ٢٢٧ تا ٢٥٢-

تکفیر کا فیصلہ نہیں کیا، بلکہ تمام نصوص کو مجموعی طور پر دیکھا گیا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بہت سے نصوص میں متعدد کبائر کے ارتکاب کرنے والوں کو مسلمان قرار دیا گیا ہے، مثلاً قتلِ مسلم ایک عظیم جرم ہے مگر قرآن کریم میں خطاب کرتے ہوئے قاتل کو کافر نہیں کہا بلکہ " یاایھاالذین اٰمنوا" کے ساتھ خطاب کیا اور پھر اسی آیت کریمہ میں قاتل اور مقتول کے ورثاء کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا۔

مسلمانوں کا آپس میں جنگ و قتال کرنا نہایت عظیم گناہ ہے، لیکن قرآن کریم میں لڑنے والے دونوں فریقوں کو مؤمن فرمایا گیا، زنا اور چوری کرنا دونوں کبیرہ گناہ ہیں، لیکن اس کے باوجود دونوں کے ارتکاب کرنے والے کے متعلق حضور ﷺ نے بالآخر جنت میں جانے کی خوشخبری دی ہے، جس پر سیدنا حضرت ابوذر غِفاری رضی اللہ عنہ کو کافی حیرت بھی ہوئی۔

اسی طرح زنا، لواطت، قتل، چوری، کسی پر بہتان لگانا، شراب نوشی اور ڈاکہ زنی کرنا وغیرہ وغیرہ بڑے بڑے گناہ ہیں، لیکن صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور آج تک اُمت مسلمہ کے مستند علماء اور فقہاء کرام کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان شخص ان گناہوں کا ارتکاب کرے تو اس کی وجہ سے اس کو ارتداد کے جرم کی پاداش میں قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ شریعتِ مطہرہ میں اس کے متعلق جو سزائیں مقرر فرمائی گئی ہیں، وہی سزا دی جائے گی۔

اُمت مسلمہ کے اندر عہد نبوی سے لے کر آج تک ایسے لوگ ضرور رہے جن سے دانستہ یا نادانستہ بعض بڑے بڑے گناہ کا صدور ہوا، لیکن پوری اُمت نے آج تک ان جیسے لوگوں کے لئے جدا قبرستان کا انتظام نہیں فرمایا، حالانکہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عام حالات میں مرتد کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔

اب اگر ان چند نصوص کے ظاہر کو دیکھا جائے تو ان اعمال کے ارتکاب کرنے

والوں کو کافر کہنا چاہئے، لیکن دوسری طرف شریعت کے یہ مندرجہ بالا احکام اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم سے لے کر آج تک اُمت مسلمہ کے اس اجتماعی تعامل وتوارث کا تقاضایہ ہے کہ ایسے لوگ اگرچہ گناہ گار ضرور ہیں جن کو قانون کے مطابق سزا ملے گی، لیکن محض اس عمل کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوئے، نہ ہی ان جیسے لوگوں پر کفر اور کافروں کے احکام جاری کرنا درست ہے۔

اہل سنت والجماعت کا مؤقف

اہل سنت والجماعت نے ان دونوں اُمور پر پورے اخلاص اور مکمل دیانتداری کے ساتھ گہرے غور و فکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیاہے کہ محض گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر اور ارتداد نہیں، اس کی وجہ سے کسی شخص کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا درست نہیں۔

مختلف نصوص میں تطبیق کی صورتیں

اور تمام نصوص و دلائل میں تطبیق دینے کے لئے ان حضرات نے یہ راہ اختیار فرمائی کہ جن نصوص میں بعض گناہوں کو کفر فرمایا گیایا کسی گناہ کے کرنے والے کو کافر قرار دیا گیا، ان نصوص میں لفظ "کفر" سے عام متبادر معنیٰ مراد نہیں یعنی دین اسلام سے نکلنا مقصود نہیں بلکہ لغوی معنیٰ یعنی ناشکری مراد ہے، کہ اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لانے کا شکریہ، یہ تھا کہ ان کے تمام احکام پر عمل کیا جاتا جب کہ اس شخص نے گناہ کا ارتکاب کر کے ناشکری کی ہے۔

بعض حضرات نے تمام نصوص میں تطبیق کی دوسری صورت یہ اختیار فرمائی کہ ان نصوص میں کفر کا عام متبادر معنیٰ ہی مراد ہے لیکن یہ سارے نصوص استحلال پر محمول ہے یعنی اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کرے تو واقعتاً وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا،

لیکن صرف گناہ کرنے کی وجہ سے کفر لازم نہیں ہو گا، بلکہ اگر کرنے والا اس گناہ کرنے کو جائز سمجھے تب یہ حکم ہو گا۔

اور ظاہر ہے کہ جب ایک عمل کی ممانعت قرآن و سنت میں صراحت کے ساتھ موجود ہے تو اس کو جائز سمجھنا در حقیقت ان نصوص کی تکذیب ہی ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

تطبیق کی تمام صورتوں کا خلاصہ

بعض حضرات نے تطبیق کے اسی مقصد کے پیش نظر دوسری تاویلات بھی کی ہیں، علامہ شوکانی رحمہ اللہ جمہورِ اُمت کی ان جیسی تمام تاویلات کو بڑے اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وسائر أحاديث الباب على أنه مستحق بترك الصلاة عقوبة الكافر وهي القتل، أو أنه محمول على المستحل، أو على أنه قد يئول به إلى الكفر، أو على أن فعله فعل الكفار.

"اس باب کی تمام احادیث اس پر محمول ہیں کہ نماز چھوڑنے کی وجہ سے کافر جیسی سزا کا مستحق ہے (نہ یہ کہ وہ کافر ہے) یا جو کوئی اس (نماز چھوڑنے) کو حلال سمجھے، یا اس پر محمول ہیں کہ یہ عادت اس کو کفر کی حدود تک لے جائے گی (یعنی فی الحال صرف اس عمل کی وجہ سے کافر نہیں) یا یہ توجیہ کی جائے کہ یہ کام مسلمانوں کا نہیں ہو سکتا بلکہ کفار جیسا ہے۔"[۱]

[۱] نيل الأوطار، كتاب الصلاة، باب حجة من كفر تارك الصلاة، ج١ ص٣٦١.

واضح رہے کہ خود علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اگرچہ جمہور متقدمین اور متاخرین کے اس مؤقف کے ساتھ اتفاق نہیں کیا بلکہ اسی مبحث کے آخر میں اپنا یہ نکتۂ نظر بیان کیا ہے کہ بلا عذر نماز نہ پڑھنے والا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، لیکن دیگر ائمہ کرام کے مذاہب ذکر کرتے ہوئے اسی سابقہ مؤقف کو جمہور سلف و خلف کا مسلک کہا۔

نیز یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ جمہور کی بات بھی صرف نماز وغیرہ ایک دو مسائل کی حد تک ہے، ورنہ ان چند مسائل کے علاوہ باقی احکام میں یہ صرف جمہور ہی کا مؤقف نہیں بلکہ اہل سنت والجماعت کا اتفاقی مسلک ہے جیسا کہ آئندہ ابواب میں اس کی وضاحت کر دی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

گناہ کبیرہ سے تکفیر کے متعلق ایک مفید تحقیق

امام ابو عبید قاسم بن سلاّم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب " الإیمان " میں اس پر بڑی تحقیق و تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے، آپ نے پہلے توان روایات کو جمع کیا جن میں کسی گناہ پر کفر اور شرک کا اطلاق کیا گیا ہو یا حضور ﷺ نے کسی عمل کرنے والے کے بارے میں فرمایا ہو کہ ایسا کام کرنے والا ہم میں سے نہیں ہے، ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ ان احادیث کے متعلق اُمت کے اندر پانچ مؤقف ہیں:

پہلا مؤقف

ان روایات میں کفر سے اصطلاحی معنیٰ میں کفر مراد نہیں بلکہ کفرانِ نعمت یعنی ناشکری مقصود ہے، یعنی جس نے فلان فلاں کام کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا ناشکرا ہے۔

لیکن یہ مؤقف درست نہیں، کیونکہ اہلِ عرب کفر سے ہر جگہ کفرانِ نعمت مراد نہیں لیتے تھے، اگر کہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے سیاق وسباق میں یہ لفظ استعمال ہو جائے وہاں تو یہ تاویل کرنا بالکل درست ہے، مگر اس کے علاوہ ہر جگہ کفر سے ناشکری کا معنیٰ مراد لینا اہلِ عرب کے نزدیک معروف نہیں۔

دوسرا مؤقف

یہ تمام نصوص تغلیظ وترہیب پر محمول ہیں۔

لیکن یہ مؤقف بھی غلط ہے کیونکہ اس سے حقیقی معنیٰ کی نفی کرنا مقصود ہے یعنی گویا حقیقت میں یہ اعمال کفر نہیں، اور ان کی وجہ سے کوئی کافر نہیں ہوتا بلکہ صرف لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے ایسا کہا گیا، حضور ﷺ کی شان اقدس سے یہ احتمال بعید ہے خصوصاً کفر واسلام جیسے اہم اور بنیادی مسائل میں۔

تیسرا موٴقف

ان نصوص کا ظاہری اور حقیقی معنیٰ ہی مقصود ہے یعنی جو شخص بھی ایسا کوئی کام کرے تو وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، یہی موٴقف خوارج نے اپنایا تھا۔

لیکن یہ موٴقف بھی بالکل غلط ہے، ذخیرہ احادیث میں ایسی بہت سی روایات موجود ہیں جس میں قتل، زنا اور شرب خمر سے کم تر گناہوں پر بھی کفر وشرک وغیرہ کا اطلاق فرمایا گیا ہے، اگر ہر جگہ حقیقی کفر ہی مراد لیا جائے تو ایک بڑا اشکال یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ جب ان نصوص کے مطابق قتل اور زنا وغیرہ جرائم کفر ہیں تو اگر کوئی مسلمان شخص ان اُمور کا ارتکاب کرے تو اس پر ارتداد کی شرعی سزا جاری کرنا کیوں جائز بلکہ لازم نہیں ہے؟

ارتداد کی سزا مرتد کو قتل کرنا ہے لیکن اس کے باوجود زانی غیر محصن کے قتل کرنے کو شریعت نے حرام قرار دیا، مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں حالانکہ ارتداد کی سزا حتمی ہے جس میں اس طرح اختیار نہیں، شراب خور کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ صرف کوڑے لگوانے ہی پر اکتفاء فرمایا گیا، اگر سچ مچ یہ سارے اُمور کفریہ ہیں اور ان کی وجہ سے ایمان بر قرار نہیں رہتا تو پھر حدود وتعزیرات کو مقرر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ یہ تو ان متواتر نصوص کے خلاف ہونگے جن میں ارتداد کی سزا قتل قرار دی گئی ہے۔

چوتھا موٴقف

ان نصوص کے متعلق اُمت کے اندر ایک خاص طبقہ نے یہ موٴقف اختیار کیا کہ ان سارے نصوص کو رد کر دیا جائے۔

لیکن اس موٴقف کے غلط ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ اُمت کے مستند اسلاف

واخلاف میں سے کسی نے اس اعتراض کو قبول نہیں فرمایا بلکہ بعض اہل بدع ہی اس کو اختیار کرتے رہے ہیں جن کو حدیث اور علم حدیث کے باب میں کوئی خاص مناسبت حاصل نہیں تھی۔

پانچواں مؤقف

علامہ ابن سلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان اعمال کی وجہ سے کسی مسلمان کا ایمان بالکلیہ زائل ہوتا ہے، نہ ہی محض ان اُمور کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے، البتہ ان گناہوں کی وجہ سے ایمان کی حقیقت واخلاص اور اس کے ثمرات وبرکات کے اندر کمی آجاتی ہے، شریعت کی نظر میں گناہوں کی صغر و کبر اور ثقل وخفت کے بقدر ایمان کی برکات سے محرومی ہوجاتی ہے، جس کا ایک بڑا قرینہ یہ بھی ہے کہ خود قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر ایمان کے فوائد و ثمرات کے لئے عمل صالح کی قید لگائی گئی ہے۔[۱]

حضرات صحابہ کرام کا طرزِ عمل

جو لوگ دین اسلام اوراس کے تمام تر "ضروریات" کے قائل اور معترف ہوں، ان کو "اہل قبلہ" کہاجاتاہے، اسی باب کے شروع میں کئی روایات ذکر ہوئیں جن میں ایسے لوگوں کو کافر کہنے سے ممانعت کی گئی تھی، اُنہی روایات کی روشنی میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ معمول تھا کہ وہ تکفیر کے باب میں خاصی احتیاط سے کام لیا کرتے تھے اور حتی الامکان کسی مسلمان کو کافر اور مشرک کہنے سے گریز کیا کرتے تھے۔

---

[۱] الإيمان للقاسم بن سلام ،باب الخروج من الإيمان بالمعاصي، من ص: ۳٦ إلى ص٤٨- المكتب الاسلامي.

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے اسی مسئلہ کے متعلق سوال کیا کہ کیا آپ لوگ (یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم) اہلِ قبلہ میں کسی شخص کو کافر بھی کہتے تھے؟ آپ نے معاذاللہ کہہ کر نفی میں جواب دیا، علامہ ابن زمنین رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

> عن أبي سفیان قال: سأل رجل جابر بن عبد الله هل کنتم تسمون أحدا من أهل القبلة کافرا؟ قال: معاذ الله، قال: فهل تسمونه مشرکا؟ قال: لا.
>
> "ایک شخص نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ لوگ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر کہتے تھے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی پناہ (یعنی ہم نے کبھی ایسا جرم نہیں کیا)، سائل نے کہا کہ کیا مشرک کہتے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔"[۱]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اس جواب سے حضرات صحابہ کرام کی احتیاط معلوم ہوئی کہ وہ بلاوجہ کسی کی تکفیر نہیں کرتے تھے، حالانکہ ان حضرات کے آپس میں اختلافات بھی واقع ہوئے، بعض سیاسی اور مذہبی مسائل میں ایک دوسرے کے خلاف رائے رکھنے کا بھی ان حضرات کو سامنا ہوا، بعض حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے درمیان یہ اختلافات باہمی جنگ کی صورت بھی اختیار کرگئے، چنانچہ "مشاجراتِ صحابہ" کی ایک پوری تاریخ موجود ہے۔

لیکن ان سب کچھ کے باوجود ایک دوسرے کے لئے یا کسی بھی مسلمان کے حق میں

---

[۱] أصول السنة لابن أبي زمنین (ص: ۲۲۰).

لفظ "کفر" استعمال کرنے سے حتی الامکان گریز ہی کرتے رہے، جب تک کوئی شخص دین اسلام کے قطعی اور یقینی دلائل کا انکار نہ کرتا، اس وقت تک اس کو مسلمان ہی سمجھا جاتا رہا۔

اور یہ صرف حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ہی معمول نہ تھا، بلکہ اُمت محمدیہ نے ہمیشہ رشد وہدایت کے ان تابندہ ستاروں سے رہنمائی لی اور ان ہی کے نقش قدم پر چلے ہیں، علامہ عضد الدین اِیجی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جمهور المتكلمين والفقهاء على أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة.

"اکثر متکلمین اور فقہاء کرام کا مسلک یہ ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہا جائے۔"[۱]

---

[۱]شرح المواقف، المرصد الثالث، المقصد الخامس في أن المخالف للحق من أهل القبلة هل يكفر أم لا، ج۸ص۳۷۰.

تکفیر کے باب میں تفریط کرنا

کسی کافر کو مسلمان قرار دینے سے متعلق احتیاط کا پہلو

یہاں تک یہ بیان کیا گیا کہ کسی کو کافر قرار دینے میں خاصی احتیاط کی ضرورت ہے، تکفیر کے معاملے میں جلد بازی اور جذباتیت سے بچنا اور بچے رہنا ضروری ہے، جب تک کسی کے قول و فعل میں ایمان و اسلام کا پہلو موجود ہو تب تک اس کی تکفیر سے گریز کر لینا چاہئے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تکفیر کا دروازہ بالکل بند ہے، کسی کو کافر قرار دینا ناجائز ہے، نہ ہی اس کا یہ مقصد ہے کہ کفر کی شرائط اگر موجود بھی ہو جائیں، تب بھی کافر نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ بے دھڑک کسی مسلمان کو کافر کہنا اور کفر کی تمام تر شرائط کی موجودگی کے باوجود کسی کو مسلمان کہنے پر اصرار کرنا، یہ دونوں افراط و تفریط کے مظاہر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں معاملے انتہائی خطرناک اور بہت ہی غور و فکر کے متقاضی ہیں، کیونکہ اسلام و کفر کی بنیاد پر دنیا اور آخرت کے بیسیوں احکام مبنی ہیں، کسی مسلمان کو کافر کہنے کا معنٰی یہ ہے کہ اس پر دنیا میں بھی کفر ہی کے احکام جاری ہوں اور آخرت میں بھی اس کا حشر و نشر کفار کے ساتھ ہو۔

اسی طرح اگر مسلمان شخص سے کوئی ایسا قول و فعل سرزد ہو جائے جو واقعی کفر و ارتداد کا موجب ہو اور کسی قسم کے موانع وغیرہ بھی موجود نہ ہوں بلکہ خود ہی کفریہ پہلو کا التزام کرے جس کی وجہ سے وہ یقینی طور پر کافر ہو جائے، اس کے باوجود اگر اس کو "بے جا احتیاط" کے نام پر مسلمان ہی کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس پر دنیا اور آخرت دونوں میں مسلمانوں کے احکام جاری ہوں، التزامِ کفر کے باوجود دنیا میں بھی اس کے ساتھ

مسلمانوں جیسا سلوک کیا جائے اور آخرت میں بھی مسلمانوں کی فہرست میں اس کا نام درج ہونے کا عقیدہ ہو۔

تکفیر کے متعلق اہل سنت والجماعت کا راہ اعتدال

ان وجوہات کی بناء پر اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ اولاً تو کسی مسلمان کو کافر کہنے سے گریز کرنا ضروری ہے، اگر کوئی ایسا کام اس سے سرزد ہو جائے جس میں اکثر پہلو کفر کے موجب ہوں لیکن کوئی ایسا پہلو موجود ہے جو اس کے ایمان کا متقاضی ہے تو حتی الامکان کافر قرار دینے سے احتراز ہی ضروری ہے، البتہ اگر وہ خود کسی کفریہ احتمال کا التزام کرے یا کوئی مسلمان شخص کوئی ایسا قول و فعل اختیار کرے جو یقینی طور پر موجب کفر ہو اور شخص مذکور کے حق میں اس کے کوئی موانع وغیرہ بھی موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں اس کی تکفیر کرنی ضروری ہے، تاکہ ایمان واسلام کی حدود بالکل واضح اور متعین ہوں اور دونوں کے احکام جاری کرنے میں عوام الناس کو کوئی دِقت نہ پیش آئے۔

بروقت تکفیر نہ کرنے کا نقصان

کفر کے التزام کے باوجود کسی کو کافر نہ کہنے میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص کفر اختیار کرے تو اس کو مسلمان کہنے کا مطلب اس کے دین و نظریہ کو اسلام کے مطابق کہنا ہے اور جب اس کا موجودہ نظریہ کفر ہے تو اس کو اسلام کہنا گویا کفر کو اسلام کہنا ہے جس کی شناعت محتاج بیان نہیں، اور جس طرح امام طحاوی رحمہ اللہ نے کسی مسلمان کو کافر کہنے کے "کفر ہونے" کی یہی توجیہ لکھی ہے کہ اسلام کے باوجود اس کو کافر کہنا در حقیقت اسلام کو کفر کہنا ہے جو کہ کفر ہے۔ یہی صورت حال یہاں بھی ہے کہ اگر کسی کا کفر یقینی طور پر ثابت ہو تو اس کو مسلمان کہنے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس کا نظریہ و مذہب اسلام کے مطابق ہے اور ظاہر ہے کہ کفر کو اسلام کہنا خود موجبِ کفر ہے۔

امام الحرمین کا ایک زریں ملفوظ

علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ (المتوفی ۵۴۴ھ) نے نقل فرمایا ہے کہ کسی نے امام الحرمین رحمہ اللہ سے اسی قسم کے ایک مسئلہ کے متعلق دریافت کیا جس میں اسلام و کفر دونوں کا پہلو موجود تھا تو آپ نے سائل کو اس بنا پر جواب دینے سے معذرت کر دی کہ ان جیسے مسائل میں معمولی غلطی بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ:

لأن إدخال كافر في الملة وإخراج مسلم عنها عظيم في الدين.

"کسی کافر کو ملت اسلام میں داخل کرنا اور کسی مسلمان کو اس سے نکالنا دینی لحاظ سے بڑا (اور نہایت نازک) معاملہ ہے"[۱]

تکفیر کی ذمہ داری بروقت ادا کرنے سے متعلق حضرات صحابہ کرام کا طرزِ عمل

رسول اللہ ﷺ جب دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ ﷺ کی جگہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند خلافت کے لئے حضرات صحابہ کرام کے باہمی اتفاق سے نامزد ہوئے، تو اس وقت عرب دنیا کے اندر شیطان نے ایک انقلاب برپا کیا جس میں دیکھتے ہی دیکھتے بستیوں کی بستیاں مرتد ہوتی چلی گئی، کوئی اپنے آبائی دین کی طرف لوٹنے لگے، کوئی مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کی نبوت پر ایمان لانے کی وجہ سے ختمِ نبوت کے

---

[۱]الشفاء بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، فصل فى تحقيق القول فى إكفار المتأولين، ج۲ ص۲۷۷.

منکر ہوئے اور حضور نبی کریم ﷺ کے بعد نئے نبی پر ایمان لانے کی وجہ سے مرتد ہوئے۔

ارتداد کی ان مختلف شکلوں میں ہزاروں افراد دینِ اسلام سے نکل گئے، ایک گروہ ان لوگوں میں سے ان افراد کا بھی تھا جو نماز اور زکوۃ میں تفریق کرتے تھے اور بعض نصوص کے ظاہر کی وجہ سے زکوۃ کے حکم کو حضور ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص سمجھتے تھے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فوراً ان سب افراد کے خلاف فیصلہ کیا اور ان کے خلاف مجاہدین کے لشکر بھیجے جن میں ہزاروں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم شریک ہوئے، تقریباً تمام صحابہ کرام بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کے ساتھ بالکل متفق تھے، صرف منکرین زکوٰۃ کے متعلق سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ابتداء میں اشکال پیش آیا لیکن مختصر سی بحث و تمحیص سے وہ اشکال بھی کافور ہو گیا اور انجام کار صحابہ کرام کے اتفاق سے مرتدین کے خلاف جہاد کیا گیا۔

حضرات شیخین کا باہمی مکالمہ

حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا باہمی مکالمہ مختلف کتب میں اجمال اور تفصیل کے ساتھ درج ہے، ایک روایت کے مطابق حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے نرمی برتنے کا مشورہ دیا جس پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو رہتی دنیا تک آبِ زر سے لکھا جائے گا، آپ نے فرمایا:

إنه قد انقطع الوحي، وتم الدين، أينقص الدين وأنا حي؟.

"یقیناً وحی کا سلسلہ ختم ہوا اور دین پورا ہو چکا ہے، تو کیا دین میں سے کچھ کمی جائے

گی اور میں زندہ ہوں گا۔"[۱]

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اس طرز عمل اور فوری اقدام سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کہیں کسی فرد یا جماعت سے اسلام و ایمان کے خلاف کوئی ایسا عمل وجود میں آئے جو شریعت کی نظر میں موجبِ کفر ہو تو علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ بروقت اس کی تشخیص کریں اور اُمت کو اس فتنے سے آگاہ کریں، تا کہ عام مسلمانوں کا دین وایمان محفوظ رہے۔

حضرات شیخین کے اس مکالمہ سے یہ رہنمائی بھی مل جاتی ہے کہ کسی شخص یا کسی قوم کو کافر قرار دینے یا کفر کے احکام جاری کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، اگر اس حوالے سے اہل علم کو ذرا بھی شبہ ہو تو مل بیٹھ کر شرعی اُصول کی روشنی میں اس کا حل نکالنا چاہئے۔

ایک مسلمہ ضابطہ

تکفیر کی تمام تر شرائط موجود ہونے اور پوری طرح تحقیق کرنے کے بعد بھی تکفیر نہ کرنا متعدد مفاسد کا ذریعہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر متکلمین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں متحقق ہو جائے کہ وہ کسی کفریہ عقیدہ کا حامل ہے اور تکفیر کے لئے متکلمین وفقہاء کرام نے جو ضروری شرائط لکھی ہیں (جو اسی کتاب کے باب سوم میں تفصیل وترتیب سے مذکور ہیں) وہ بھی مکمل طور پر موجود ہوں، تو ان تمام اُمور کے بعد ایسے شخص کو کافر سمجھنا ہی ضروری ہے، اس کو مسلمان کہنا حرام ہے، بلکہ قاضی عیاض رحمہ اللہ

[۱]صحيح البخاري، كتاب الصلاة،باب فضل استقبال القبلة، رقم الحديث:۳۹۱.

ایک ایسے ہی مسئلہ کے بارے میں اجماع نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (یقینی) کافر کی تکفیر نہ کرنا کفر ہے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

قال محمد بن سحنون أجمع العلماء أن شاتم النبي صلى الله عليه وسلم المتنقص له كافر والوعيد جار عليه بعذاب الله له وحكمه عند الأمة قتل ومن شك في كفره وعذابه فقد كفر.

"فقیہ محمد بن سحنون (مالکی) فرماتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی اور تنقیص کرنے والا کافر ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وعید (جو قرآن کریم میں مذکور ہے) ثابت ہے اور اُمت مسلمہ کے نزدیک ایسے شخص کا حکم قتل کرنا ہے، اور جو کوئی اس کے کفر اور عذاب میں تردد کرے وہ بھی کافر ہے۔"[۱]

کسی کا اسلام و کفر دونوں مشکوک ہو تو؟

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہو جاتا ہے کہ کسی کا مسلمان یا کافر ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے، مشتبہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ واقع میں نہ مسلمان ہے نہ کافر، بلکہ اشتباہ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً اس سے کفریہ حرکت کا ثبوت متیقن نہ ہو، یا اس نے جو اعتقاد و عمل اختیار کیا ہے اس کے موجب کفر ہونے میں کسی معتد بہ وجہ سے تردد ہو، ایسی صورت حال میں کیا حکم

[۱] الشفاء بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، القسم الرابع، الباب الأول في بيان ما هو في حقه صلى الله عليه وسلم سب أو نقص من تعريض أو نص، ج۲ ص۲۱۵.

ہے؟ کیا ایسے شخص کو بھی کافر کہا جائے یا مسلمان ہی قرار دیا جائے؟ اس پر کفر کے احکام جاری ہوں گے یا اسلام کے؟

اُصول و قواعد کو دیکھتے ہوئے بظاہر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مشتبہ آدمی کی اصل حالت معلوم کی جائے، اگر پہلے سے وہ مسلمان تھا اور اب اس سے کسی کفریہ حرکت کے صادر ہونے میں شبہ ہو تب تو اس کو مسلمان ہی کہنا اور سمجھنا چاہئے اور اگر اس اشتباہ کی حالت سے پہلے وہ کافر تھا اور اب مسلمان ہونے میں اشتباہ پیدا ہوا ہو تو تحقیق سے پہلے اس کو مسلمان قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا بلکہ کافر ہی کہنا چاہئے۔ اور چونکہ کسی کے مسلمان یا کافر ہونے کے ساتھ دینِ اسلام کے متعدد ضروری احکام متعلق ہیں، اس لئے ضرورت کے وقت اپنی حد تک تحقیق کرنا لازم ہے، خصوصاً جب مسئلہ کسی خاص فرد تک محدود نہ ہو بلکہ پوری جماعت کے متعلق ایسا مسئلہ درپیش ہو کیونکہ اگر بروقت ایسا فیصلہ نہ کیا جائے تو اس پر متفرع ہونے والے احکام و مسائل پر پوری طرح کیونکر عمل کیا جا سکتا ہے!

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے تردّد کے وقت تحقیق کر کے کسی قولِ فیصل تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے اور اس دوران اگر متعلقہ گروہ کو کافر قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ تحقیق سے پہلے ایسا فیصلہ بے احتیاطی کا مظاہرہ کرنا ہے اور وہ بھی تکفیر جیسے اہم اور نازک مسائل میں۔ اور اگر ان کو مسلمان کہلوایا جائے تو خطرہ ہوتا ہے کہ عام مسلمان لوگ ان کو بھی اپنی طرح مسلمان سمجھ کر تعلقات رکھیں گے جو ان کے دین و ایمان کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتا ہے۔ ایسے موقع پر احتیاط کی صورت وہی ہے جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

> "تحقیق یہ ہے کہ اگر کسی خاص شخص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردد ہو خواہ تردد کے اسباب علماء کا اختلاف ہو خواہ قرائن کا تعارض ہو یا اُصول

کا غموض ہو، تو اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جاوے نہ اسلام کا۔ حکم اول میں تو خود اس کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے اور حکم ثانی میں دوسرے مسلمانوں کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے، پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا۔ یعنی نہ اس سے عقدِ مناکحت کی اجازت دیں گے، نہ اس کی اقتداء کریں گے، نہ اس کا ذبیحہ کھائیں گے اور نہ اس پر سیاستِ کافرانہ جاری کریں گے، اگر تحقیق کی قدرت ہو اس کے عقائد کی تفتیش کریں گے اور اس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے احکام جاری کریں گے اور اگر تحقیق کی قدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے۔ اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے۔ اسکی نظیر وہ حکم ہے جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے:

لاتصدقوا أهل الكتاب ولاتكذبوهم وقولوا: اٰمنّا باللّٰہ وماأنزل إلينا۔ الاٰية رواه‌البخاری-

دوسری فقہی نظیر احکام خنثیٰ کی ہیں:

یوخذ فيه بالأحوط والأوثق في أمور الدين وأن لايحكم بثبوت حكم وقع الشك في ثبوته، وإذا وقف خلفا لإمام قام بين صف الرجال والنساء ويصلي بقناع ويجلس في صلاته جلوس المرأة و يكره له في حياته لبس الحلي، والحرير- وأن يخلو به غير محرم من رجل أو امرأة أو يسافر مع غير محرم من الرجال والأناث، ولم يغسله رجل ولا امرأة ويتيمّم بالصعيد ويكفن كما تكفن الجارية۔"[۱]

---

[۱] امداد الفتاوی، جلد ۱۰ صفحہ نمبر: ۴۱۶

بعض حضرات نے اس کو" اعتزال"، "بدعت فی الاصول""احتیاط کے نام پر بے احتیاطی اور اُصول کا اختراع" قرار دیتے ہوئے اس کی شدید مذمت فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ "اہلِ قبلہ میں اس کا قائل ہی اِن کے سوا کوئی اور نہیں ہے"۔[۱]ناقد کی پوری تحریر دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اُنہوں نے امداد الفتاویٰ کی اس عبارت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ایسا شخص نہ کافر ہے نہ مسلمان، بلکہ بین بین ہے۔ حالانکہ انصاف کے ساتھ اسی درجِ بالا عبارت کو پڑھا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہاں اعتقادی و نظریاتی طور پر کسی کو مسلمان اور کافر نہ قرار دینے کی بات نہیں ہو رہی، بلکہ اس کے کافر یا مسلمان ہونے کے اظہار واعلان سے ممانعت مقصود ہے۔ اور وہ ممانعت بھی اسی حکمت پر مبنی ہے کہ مسلمان مشہور کرنے میں بھی ایک دینی مفسدہ ہے اور کفر کے اعلان کرنے میں بھی فساد کا اندیشہ ہے۔

یہ ایک احتیاط کی صورت ہے جس کو خود درج بالا فتویٰ میں بھی احوط واسلم ہی قرار دیا گیا اور ظاہر ہے کہ احتیاط کی ہر صورت کا متفق علیہ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، نہ ہی منصوص ہونا لازم ہے، نئے حالات اور واقعات میں احتیاط کی نت نئ صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ صرف حضرت تھانوی صاحب کا اختراع نہیں ہے، بلکہ کئی اہل علم کا یہی رویہ رہا

---

[۱] ملاحظہ ہو "اصول تکفیر" از مولانا پیر محمد چشتی صاحب مرحوم، ص۲۹ تا ۳۲

ہمیں پیر صاحب مرحوم سے بجاطور پر یہی شکایت رہتی ہے کہ وہ موقع بے موقع تعصب چھوڑنے، انصاف پسندی کا رویہ اپنانے اور اُمت کے اتحاد واتفاق کی دعوت وتاکید فرماتے رہتے ہیں، بے جا تعصب و تحزب کے نقصانات ذکر کر کے اس کی مذمت کرتے رہتے ہیں، لیکن بسا اوقات بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود اس کا التزام نہیں کرپاتے، کسی کی جرح وتنقید کے وقت یا کسی کے کلام پر تبصرہ وتنقیح کے وقت بھی اگر وہ اپنی دعوت کے مطابق احتیاط وانصاف سے کام لیتے اور تعصب و تحزب کو دور پھینکتے تو کتنا ہی اچھا ہوتا اور اُمت کو کس قدر فائدہ پہنچتا! لیکن کیا کہئے! کم حسرات فی بطون المقابر

ہے، مثال کے طور پر علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کی تفصیل میں، کہ جو لوگ کسی تاویل کی وجہ سے بدعات کے مرتکب ہوں ان کا حکم کیا ہے؟ آیا ان کو کافر قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ اس مسئلہ کے ضمن میں آپ نے متعدد اقوال نقل فرمائے اور اسی کے ضمن میں لکھا:

واضْطَرب آخرُون فِي ذَلِك وَوَقَفُوا عَن القَوْل بالتَّكْفِير أَو ضِدَّه وَاختلاف قولي مَالِك فِي ذَلِك وتَوَقُّفُه عَن إعَادَة الصَّلَاة خَلْفَهُم مِنْه وَإِلَى نَحْو من هَذَا ذهب الْقَاضِي أَبُو بَكْر إمام أَهْل التّحْقِيق وَالْحَقّ وَقَال إنَّهَا من الْمُعْوصات.[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ امام مالک رحمہ اللہ کے ایک قول سے بھی ان کا یہی مؤقف معلوم ہوتا ہے اور امام قاضی ابو بکر باقلانی رحمہ اللہ کا مؤقف بھی اسی کے قریب ہے، لیکن یہ اہلِ اعتزال کی طرح منزلہ بین المنزلتین کا مؤقف نہیں ہے، بلکہ دونوں میں واضح فرق ہے، چنانچہ "شفاء" کے مشہور شارح علامہ شہاب الدین خفاجی مصری رحمہ اللہ اسی اشکال کو دور کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

لايلزم مِن توقّفهم إثبات منزلة بين المنزلتين كالمعتزلة كما توهّم...وكمْ توقّف المجتهدون في مسائل من اُمور الدين لمْ تضرّهم ولا غيرهم.[۲]

[۱] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني،فصل فِي تحقيق القَوْل فِي إكفَار المُتَأوّلِين، ج۲ص۲۷٦.

[۲] نسيم الرياض في شرح الشفاء للقاضي عياض، ج٦ص۳۲٦.

اگر یہ توقف معتزلہ کے منزلہ بین المنزلتین کے مترادف ہوتا تو امام باقلانی جیسا فہیم متکلم اس کے قریب بھی نہ جاتا۔ اس احتیاطی توقف اور معتزلہ کے مؤقف میں فرق واضح ہے کہ ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل جاتا ہے، اس کے بعد وہ نہ مسلمان باقی رہتا ہے، نہ ہی اس کو کافر کہا جاسکتا ہے، جبکہ اس احتیاطی توقف کی صورت میں ارتکاب کبیرہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تردد کفر کی صورت ہے اور اس صورت میں بھی اعتقادی و نظریاتی لحاظ سے کفر واسلام کے حدود میں کوئی توقف نہیں ہے، نہ ہی دونوں کے درمیان کسی خلیج موجود ہونے کی بات ہے، بلکہ اعتقادی حد تک بات بالکل صاف اور طے شدہ ہے کہ متعلقہ شخص / جماعت یا کافر ہے یا مسلمان؟ لیکن کچھ عناصر کی پیچیدگی یا پوشیدگی کی وجہ سے عملی طور پر تنقیح کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو فیصلہ ہو جانے تک عبوری طور پر اس کے کافر یا مسلمان ہونے کا اعلان واشتہار نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح بسا اوقات اہل سنت کی کتابوں میں کسی شخص کے متعلق یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ فلاں کام کے ارتکاب کرنے کی وجہ سے نہ پورا مسلمان باقی رہا اور نہ کافر۔ تو اس کا مقصود معتزلہ کی طرح کفر واسلام کے درمیان کوئی اور منزلہ ثابت کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہاں بھی سیاق وسباق کے لحاظ سے غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، عموماً ان جیسے جملوں سے کسی کے مسلمان ہونے کی نفی مقصود نہیں ہوتی بلکہ یہ بتانا منظور ہوتا ہے کہ وہ خالص اور عملی طور پر پکا مسلمان باقی نہ رہا۔

مثال کے طور پر امام طحاوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وَلَا تَثْبُتُ قَدَمُ الْإِسْلَامِ إِلَّا عَلَى ظَهْرِ التسليم والاستسلام فَمَنْ رَامَ عِلْمَ مَا حُظِرَ عَنْهُ عِلْمُهُ وَلَمْ يَقْنَعْ بِالتَّسْلِيمِ فَهْمُهُ حَجَبَهُ مَرَامُهُ عَنْ خالص التوحيد وصافي المعرفة وصحيح الإيمان فَيَتَذَبْذَبُ

بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ وَالتَّصْدِيقِ وَالتَّكْذِيبِ وَالْإِقْرَارِ والإنكار موسوسا تائها شاكا لا مؤمنا مصدقا ولا جاحدا مكذبا.[۱]

حاصلِ ترجمہ: "اسلام کا قدم تسلیم وانقیاد ہی پر ثابت وراسخ ہو سکتا ہے، جو شخص اس چیز کو معلوم کرنا چاہے جس کے جاننے سے اس کو روکا گیاہو اور تسلیم کرنے پر قناعت اختیار نہ کرے تو اس کا یہ مقصد اسے خالص توحید، صاف معرفت، اور درست ایمان سے محجوب بنائے گی اور وہ ایمان وکفر، تصدیق و تکذیب اور اقرار وانکار کے درمیان تذبذب کا شکار ہو گا، وسوسہ کرنے والا اور شک کرنے والا ہو گا، نہ تصدیق کرنے والا مسلمان باقی رہ جائے گا نہ تکذیب وانکار کرنے والا۔"

اب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص متشابہات کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے وہ نہ مسلمان رہتا ہے نہ کافر، بلکہ کفر واسلام کے درمیان لٹکتا رہتا ہے جس طرح مرتکب کبیرہ کے متعلق معتزلہ کا مؤقف ہے، بلکہ عام متبادر معنٰی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص نہ خالص مسلمان رہے گا اور نہ کافر، کیونکہ یہ عمل تقاضائے اسلام کے موافق نہیں ہے، لیکن موجب کفر بھی نہیں ہے، اس لئے ایسا شخص کامل مسلمان نہیں رہتا۔ "بہار شریعت" میں ایک جگہ لکھا ہے:

"ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم بوجہ شبہ کے کسی کو نہ مسلمان کہیں اور نہ کافر، جیسے یزید پلید اور اسماعیل دہلوی۔"۲

---

[۱] العقيدة الطحاوية، ص۱۰.

۲ بہار شریعت، ص۵۰۔ مطبوعہ ممتاز اکیڈمی، لاہور۔

اہلِ قبلہ کی تکفیر کا مسئلہ

یہاں تک جو تفصیلات ذکر کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تکفیر کے باب میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، کسی مسلمان کو کافر کہنا بھی گناہ کبیرہ اور اُمتِ مسلمہ کے حق میں عظیم جرم ہے اور جس شخص کا کفر یقینی دلائل سے ثابت ہو، اس کو مسلمان کہنے کا بھی یہی حکم ہے کہ ایک طرف کہنے والے کے حق میں بلا دلیل ایسا کہنا گناہ کبیرہ ہے اور دوسری طرف عام مسلمانوں کے دین وایمان کی سلامتی کو بھی اس سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، اس لئے جس طرح تکفیر میں پیشگی احتیاط کی ضرورت ہے، اسی طرح بروقت اقدام بھی ضروری ہے، بلاوجہ خاموش بنے رہنا خود خلاف احتیاط ہے۔

بعض اوقات اس پر یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر سے احادیث میں منع فرمایا گیا، چنانچہ سنن ابوداؤد کی روایت ہے:

> عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا، وأكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذي له ذمة الله وذمة رسوله، فلا تخفروا الله في ذمته.
>
> "حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی ہماری جیسی نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کا ذمہ حاصل ہے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں بدعہدی نہ کرو۔"[۱]

---

[۱]سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، رقم الحديث: ٢٥٣٢.

اہل سنت والجماعت کے حضرات متکلمین نے اس حدیث کی روشنی میں متفقہ قاعدہ ذکر فرمایا کہ " لانکفّر أحدامن أهل القبلة"۔

امام اعظم ابو حنیفہ ،امام طحاوی، امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہی اُصول بیان فرمائے ہیں، اس لئے جب تک کوئی شخص رخ قبلہ نماز پڑھتا رہے اور کلمہ وغیرہ کہتا رہے تو اس وقت تک اس کو کافر کہنا بے احتیاطی ہے۔

لیکن یہ شبہ انتہائی سطحی ہے، محققین کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں، حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے" إکفار الملحدین "میں اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "ایمان وکفر قرآن وسنت کی روشنی میں" میں اس کی تفصیلی ذکر بحث فرمائی ہے جس کو اُنہی کتابوں میں ملاحظہ کرنا مفید ہے، یہاں ان حضرات اکابر کی تحقیق کے خلاصہ کے طور پر اتنا سمجھ لیناضروری ہے کہ اس باب میں دو باتیں ہیں، جن کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے اس قسم کے اشکالات پیدا ہو جاتے ہیں:

۱۔ اہل قبلہ کا مفہوم

۲۔ اہل قبلہ کو کافر نہ قرار دینے کی اصل وجہ

اہلِ قبلہ کا مفہوم

ایک اس لفظ کا لغوی معنٰی ہے اور دوسرا اس کا اصطلاحی مفہوم۔

لغوی اعتبار سے اس سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، یا جو خانہ کعبہ کو قبلہ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن یہاں "اہلِ قبلہ " سے یہ ظاہری معنٰی مراد نہیں کہ جو بھی شخص قبلہ کی طرف منہ کرے وہ اہل قبلہ ہے، بلکہ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے جو اہل اسلام کے معنٰی کے مترادف ہے۔

حضرات متکلمین اس اصطلاح میں ان ہی لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو دینِ اسلام اوراس کی تمام ضروریات کی تصدیق کرتے ہوں اوراس کی حقانیت کے معترف ہوں، اگر کوئی شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک حکم کا بھی انکار کرے تو متکلمین حضرات اس کو اہلِ قبلہ میں سے شمار نہیں کرتے۔

علامہ فرہاروی کی تشریح

علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ رقم طراز ہیں:

معناه اللغوي من يصلي إلى الكعبة أو يعتقدها قبلة، و في اصطلاح المتكلمين من يصدق بضروريات الدين أي الأمور التي علم ثبوتها في الشرع واشتهر فمن أنكر شيئا من الضروريات كحدوث العالم وعلم الله سبحانه بالجزئيات لم يكن من أهل القبلة ولو كان مجاهدا في الطاعات، وكذلك من باشر شيئا من أمارات التكذيب كسجود الصنم و الإهانة بأمر شرعي والاستهزاء عليه فليس من أهل القبلة.

"اہل قبلہ لغوی اعتبار سے وہ لوگ ہیں جو قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں یا اس کو قبلہ خیال کریں، اور متکلمین کی اصطلاح میں یہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ضروریاتِ دین کی تصدیق کرتے ہیں یعنی ان تمام باتوں کی جو شریعت میں ثابت (اور لوگوں میں) مشہور ہوں، لہٰذا جو کوئی ان ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک چیز کا انکار کرے گا مثلاً عالم کے حادث ہونے کا انکار کرے یا اللہ تعالیٰ

کے جزئیات جاننے کا انکار کرے تو وہ اہلِ قبلہ میں سے نہیں، اگرچہ عبادات میں محنت بھی کرتا ہو۔[۱]

امام مزنی کی تصریح

امام مزنی رحمہ اللہ اہل سنت والجماعت کے عقائد ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

الإمساك عن تكفير أهل القبلة والبراءة منهم فيما أحدثوا ما لم يبتدعوا ضلالا فمن ابتدع منهم ضلالا كان عن أهل القبلة خارجا ومن الدين مارقا ويتقرب إلى الله عز وجل بالبراءة منه ويهجر ويحتقر وتجتنب غدته فهي أعدى من غدة الجرب.

"اہل قبلہ کی تکفیر سے رُکے رہنا اور جو گمراہی وہ ایجاد کریں، اسے براءت کرنا (ضروری ہے) ان میں سے جو کوئی بھی گمراہی ایجاد کرے گا وہ اہلِ قبلہ ہونے سے اور دین اسلام سے نکلے گا، ایسی صورت میں اس سے براءت اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے، ایسے آدمی کے ساتھ تعلقات بھی ختم کئے جائیں اور اس کی حقارت کی جائے اور اس سے بالکل پرہیز کیا جائے۔"[۲]

علامہ تفتازانی کی وضاحت

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ومعناه أن الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الإسلام

---

[۱] النبراس، ص۳٤١.

[۲] شرح السنة للمزني ص: ٨٤.

كحدوث العالم وحشر الأجساد وما أشبه ذلك واختلفوا في أصول سواها كمسألة الصفات -- وإلا فلا نزاع في كفر أهل القبلة المواظب طول العمر على الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفي الحشر ونفي العلم بالجزئيات ونحو ذلك وكذا بصدور شيء من موجبات الكفر عنه.

"اہل قبلہ سے مقصود وہ لوگ ہیں جو ضروریاتِ اسلام پر متفق ہیں جیسے عالم کا حادث ہونا، اور قیامت وغیرہ۔ ورنہ اگر کوئی اہل قبلہ میں سے پوری عمر عبادات کی پابندی بھی کرے اور اس کے باوجود عالم کے قدیم ہونے، قیامت قائم نہ ہونے یا اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہ ہونے کا عقیدہ رکھے تو اس کے کفر میں کوئی اختلاف نہیں، اسی طرح اگر دیگر موجب کفر کاموں کا ارتکاب کرے۔"[۱]

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ "اہل قبلہ" سے مراد وہ لوگ نہیں جو قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی اہل قبلہ کی تکفیر سے ممانعت کا یہ معنیٰ ہے کہ ہر قبلہ رخ ہو کر عبادت کرنے والے کی تکفیر ممنوع ہے بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے جس کا درست مفہوم وہی ہے جو اس اصطلاح کو استعمال کرنے والے حضرات متکلمین کے حوالے سے تحریر کیا جا چکا۔

اہلِ قبلہ کو کافر قرار نہ دینے کی اصل وجہ

دوسری بات جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات غلط فہمی پیش آتی ہے، وہ

[۱] شرح المقاصد في علم الكلام، المبحث السابع في حكم مخالف الحق من أهل القبلة في باب الكفر والإيمان، ج٢ص٢٦٩.

اس مسئلہ کی اصل بنیاد ہے یعنی اہل قبلہ کی تکفیر کیوں ممنوع ہے؟

جن احادیث مبارکہ سے متکلمین حضرات میں اس اصطلاح کا فروغ ہوا، وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل دو روایات ہیں:

عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا، وأكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذي له ذمة الله وذمة رسوله، فلا تخفروا الله في ذمته.

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو ہماری طرح نماز پڑھے ہمارے قبلہ کی طرف رُخ (کرکے نماز پڑھا) کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے۔"[۱]

سنن ابی داؤد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت نقل کی گئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

ثلاث من أصل الإيمان: الكف عمن قال: لا إله إلا الله، ولا نكفره بذنب، ولا نخرجه من الإسلام بعمل، والجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر، ولا عدل عادل، والإيمان بالأقدار-

"تین چیزیں ایمان کی بنیاد میں سے ہیں۔ ۱: لا الہ الا اللہ کہنے والے (کو کافر کہنے) سے اپنے آپ کو باز رکھنا، ہم کسی گناہ کی وجہ سے اس کی تکفیر نہیں کرتے

[۱]صحيح البخاري، كتاب الصلاة،باب فضل استقبال القبلة، رقم الحديث:۳۹۱.

نہ ہی کسی ناجائز عمل کی وجہ اس کو دائرہ اسلام سے نکالتے ہیں۔۔۔[۱]

انہی دو روایات کی وجہ سے علم کلام میں اس اصطلاح کو رواج ملا، اگر ان دونوں روایات کے مفہوم پر غور کیا جائے تو اس سے یہ نکتہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر کی ممانعت کیوں ہے؟

لفظِ "بذنب" کی قید

اس دوسری روایت میں جہاں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ کلمہ طیبہ پڑھنے والے اور توحید ورسالت کا اقرار کرنے والے کو کافر نہ کہا جائے، وہاں ساتھ یہ لفظ بھی ارشاد فرمایا گیا "بذنب" یعنی "لاإله إلاالله" پڑھنے والوں کو جو کافر کہنا ممنوع ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہا جائے، اگر کوئی شخص مسلمان ہے اور ایمان ورسالت کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس کے باوجود بشری تقاضے کے تحت اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس حدیث میں محض اس گناہ کی وجہ سے اس کو کافر کہنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے اور اس کو اصل ایمان قرار دیا گیا۔

اس روایت میں لفظ " بذنب" کی قید سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دو احادیث میں مسلمانوں کی جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں، اگر کسی شخص میں یہ نشانیاں موجود بھی ہوں مگر اس کے باوجود وہ کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرے جس سے یقینی طور پر کفر لازم آتا ہو تو ان روایات کا ایسے شخص کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، شرعی دلائل کی روشنی میں اگر وہ عمل واقعہ میں کفر کا موجب ہو اور اُمت کے ذمہ دار فقہاء کرام اور مفتیان عظام ایسے شخص کی تکفیر کا فیصلہ کریں تو کسی کو اس اصطلاح کی آڑ لے کر اس شوشہ چھوڑنے کا کوئی حق نہیں کہ یہ تو

[۱] سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، رقم الحديث: ۲۵۳۲.

باقاعدہ قبلہ کی طرف نماز پڑھنے کی وجہ سے اہل قبلہ میں داخل ہے جس کو کافر قرار دینا ناجائز ہے۔

فقہاء اور متکلمین کے تصریحات

حضرات متکلمین نے بھی اس بات کی پوری پوری وضاحت کی ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مسئلہ تب ہی کارآمد ہے جب اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، اگر کسی نے صرف گناہ ہی نہیں بلکہ اپنے اختیار اور رضامندی سے کسی کفریہ قول و عمل کا ارتکاب کیا تو ایسا شخص یقیناً کافر قرار پائے گا۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا يكفر أحد من أهل القبلة إلا بجحود ما أدخله فيه.

"اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں کہا جا سکتا مگر انہی چیزوں کے انکار کرنے کی وجہ سے جن کی وجہ سے وہ اسلام میں داخل ہوا تھا (یعنی ضروریاتِ دین)"[۱]

ملا علی قاری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

إن المراد بعدم تكفير أحد من أهل القبلة عند أهل السنة أنه لايكفر أحد ما لم يوجد شيء من أمارات الكفر وعلاماته ولم يصدر عنه شيء من موجباته.

"اہل سنت کے نزدیک اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب تک

[۱]الأشباه والنظائر لابن نجيم،كتاب السير،باب الردة (ص: ۱۵۹).

کفر کی کوئی (یقینی) علامت ونشانی نہ پائی جائے اور کوئی موجب کفر اقدام صادر نہ ہو تو اس وقت تک تکفیر نہ کی جائے۔"[۱]

علامہ فرہاروی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ومعنیٰ عدم تکفير أهل القبلة أن لايكفر بارتكاب المعاصي ولا بإنكار الأمور الخفية غير المشهورة، هذا ما حققه المحققون فاحفظه-

"اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں کے ارتکاب یا غیر مشہور دقیق باتوں کے انکار کرنے کی وجہ سے کسی (کلمہ گو) کی تکفیر نہ کی جائے، محققین کی یہی تحقیق ہے۔"[۲]

بروقت تکفیر کرنا اہلِ علم کی ذمہ داری ہے

حنبلی متکلم علامہ حسن بن علی بربہاری رحمہ اللہ نے بھی یہی مسئلہ لکھا کہ عام حالات میں اہلِ قبلہ کی تکفیر جائز نہیں، لیکن اگر رسمی طور پر اہلِ قبلہ ہونے کے باوجود کوئی شخص کسی ایسے قول و عمل کا ارتکاب کرے جو موجبِ کفر ہو تو اس صورت میں اس کی تکفیر صرف جائز ہی نہیں بلکہ اہل علم کی ذمہ داری اور ان کا فرض منصبی ہے کہ اس کو کافر قرار دیں۔

چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

لا نخرج أحدا من أهل القبلة من الإسلام حتى يرد آية من كتاب الله، أو يرد شيئا من آثار رسول الله صلى الله عليه وسلم، أو يذبح لغير الله، أو يصلي لغير الله، فإذا فعل شيئا من ذلك

---

[۱] شرح الفقه الأكبر لملا علي القاري، ص۲۵۸. قديمي كتب خانه، كراچي.

[۲] النبراس شرح شرح العقائد،ص۵٤۹.

فقد وجب عليك أن تخرجه من الإسلام، وإذا لم يفعل شيئا من ذلك فهو مؤمن مسلم بالاسم لا بالحقيقة.

"ہم اہلِ قبلہ میں کسی شخص کو دائرہ اسلام سے نہیں نکالتے، الاّیہ کہ قرآن کریم کی کوئی آیت یا حضور ﷺ (سے ثابت شدہ) کسی حدیث کو رد کر دے یا غیر اللہ کے نام ذبح کرے، غیر اللہ کے لئے نماز پڑھے، اگر ایسا کوئی کام کرے گا تو اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا ضروری ہے اور اگر ایسا کوئی اقدام نہ کرے تو وہ مسلمان ہے۔[۱] (نام کا مسلمان تو ہے حقیقی نہیں)

امام ابن دقیق العید کی تصریح

امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عام حالات میں تو اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس وصف کے باوجود دینِ اسلام کے کسی قطعی اور یقینی حکم کا انکار کر بیٹھے تو اس صورت میں چونکہ وہ شریعت کی تکذیب کر رہا ہے، اس لئے کافر ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

الحق أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة، إلا بإنكار متواتر من الشريعة عن صاحبها، فإنه حينئذ يكون مكذبا للشرع.

"حق بات یہ ہے کہ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کی جائے مگر ایسے حکم کے انکار کی وجہ سے جو تواتر کے ساتھ صاحبِ شریعت ﷺ سے ثابت ہو، کیونکہ اس حکم کے انکار کی وجہ سے وہ مکذب ہوا۔[۲]

---

[۱] شرح السنة للبربهاري ص: ٦٤.

[۲] إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام، كتاب اللعان، من وصف غيره بالكفر ج ٢ ص ٢١٠.

امام رازی رحمہ اللہ بھی ذکر فرماتے ہیں کہ اہلِ قبلہ میں سے اگر کسی شخص کے متعلق کفر کی کوئی مستقل دلیل ملے (اور وہ تسلی بخش بھی ہو) تو اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی۔

المسألة العشرون المختار عندنا أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة إلا بدليل منفصل ويدل عليه النص والمعقول-

"ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ اہلِ قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کی جائے، مگر کسی مستقل دلیل کی بنیاد پر، عقل و نقل سے یہ بات ثابت ہے۔"[۱]

خلاصہ کلام

ان تمام عبارات کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی مستقل اور یقینی دلیل کفر کی مل جائے تو اس کے مطابق حکم جاری ہو جائے گا، صرف اہلِ قبلہ ہونے کی وجہ سے تکفیر کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔

حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ الفاظِ کفر کی فقہی حیثیت

ہمارے فقہی ذخیرہ کتب کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ "کتاب السیر" میں ارتداد کے متعلق ایک باب باندھتے ہیں، جس میں اس موضوع سے متعلق مختلف مسائل ذکر ہوتے ہیں، دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ ان ابواب کا اکثر حصہ کلمات الکفر اور الفاظ الکفر پر مشتمل ہوتا ہے جس میں عربی اور فارسی زبان کے مختلف الفاظ ہوتے ہیں اور اس کا حکم ذکر کیا جاتا ہے کہ آیا یہ لفظ بولنا موجب کفر ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص ان کلمات میں

---

[۱] معالم أصول الدين (ص: ۱۳۷)

سے کسی کلمہ کا تلفظ کرے تو اس کی وجہ سے اس کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

ہمارے فقہ حنفی کے مصادر میں ان الفاظ کو کافی توجہ دی جاتی ہے اور تقریباً ہر کتاب میں اس قسم کے بیسیوں الفاظ اور ان کا حکم مذکور ہوتا ہے بلکہ بعض مفصل کتابوں میں تو ان جیسے الفاظ کی تعداد بہت ہی بڑھ جاتی ہے، اگر ایک فتاوٰی ہندیہ میں ذکر کردہ الفاظ کو ٹھیک ٹھیک شمار کئے جائیں تو شاید تین چار سو سے یہ تعداد کسی طرح کم نہ ہو۔

پہلا مؤقف

ان الفاظ کے حوالے سے لوگوں کے مختلف نقطہ نظر ہیں۔ بعض حضرات اس کو بالکل قطعی تصور کرتے ہیں اور اس تصور کے نتیجہ میں اگر کسی شخص سے کوئی ایسا کلمہ صادر ہو جائے جس کے موجب کفر ہونے اور نہ ہونے کا سوال زیر غور ہو تو یہ حضرات علم کلام اور فقہ کے اُصول و قواعد کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتے بلکہ ان ہی کلمات الکفر میں اس جملہ کی نظیر تلاش کرتے ہیں اور جو قریب تر نظیر ملے، اس کے مطابق حکم بیان کرتے ہیں۔

گویا ان حضرات کے نزدیک جس طرح طلاق کے کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے فقہاء کرام کے ذکر کردہ کلمات میں سے اس جیسی نظیر تلاش کرنی ضروری ہے اسی طرح کفریہ کلمات کے حکم جاننے کے لئے بھی کلمات الکفر میں سے کوئی نظیر ڈھونڈنا کافی ہے۔

دوسرا مؤقف

اس کے بالکل برعکس بعض حضرات کا مؤقف یہ ہے کہ فقہی کتابوں کا یہ باب سرے سے قابل توجہ ہے ہی نہیں، یہ حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ ان تحقیقات کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور جب کبھی ان کلمات کے متعلق سوال اُٹھتا ہے تو اس مؤقف کے حامل حضرات کی طرف سے فقہاءِ کرام کے اس ذکر کردہ تفصیلات کے متعلق یہ توجیہ

پیش کی جاتی ہے کہ ان الفاظ سے کوئی حقیقتاً کافر نہیں ہوتا، فقہاء کرام نے اس باب میں جو احکام ذکر کئے وہ تغلیظ پر محمول ہیں۔

علامہ بزازی رحمہ اللہ کا مؤقف

مشہور حنفی فقیہ علامہ بزازی رحمہ اللہ نے اس دوسرے مؤقف کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ تغلیظ یا تشدید پر ہرگز محمول نہیں ہیں، بلکہ مجتہد نے جس کلمہ کو بھی موجبِ کفر کہا، اس سے حقیقتاً کافر ہونا اور دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہی مراد ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

يحكى عن بعض من لاسلف له أنه كان يقول: ما ذكر في الفتاوى أنه يكفر بكذا وكذا فذلك للتخويف والتهويل لا لحقيقة الكفر، وهذا كلام باطل وحاشا أن يلعب أمناء الله أعني علماء الأحكام بالحلال والحرام والكفر والإسلام بل لايقولون إلا الحق الثابت عن سيد الأنام عليه الصلاة والسلام وما أدى اجتهاد الإمام أخذا من نص القران- وما حررته هو مختار مشائخ الشافين لداء العقام - وكل من أتى بعدهم من علماء الدهر والأيام ما بقي دين الإسلام.

"بعض لوگوں سے منقول ہے جن کے پاس (اپنی اس بات کی تائید میں) کوئی سلف نہیں، کہ کتب فتاویٰ میں جو کلمات کفر ذکر کئے جاتے ہیں وہ ڈرانے دھمکانے کے لئے ہوتے ہیں، حقیقتاً کفر کے لئے نہیں ہوتے، یہ بات بالکل غلط ہے علماء کے حق میں بالکل بعید ہے کہ وہ حلال و حرام اور کفر و اسلام کے الفاظ کو کھیل کا ذریعہ بنائیں، وہ تو حق بات ہی کرتے ہیں جو حضور ﷺ سے ثابت ہو یا

امام نے اپنے اجتہاد کے ساتھ قرآن کریم سے اخذ کیا ہو، میں نے یہ جو کچھ ذکر کیا یہ تمام مشائخ اور ہر زمانے کے تمام علماء کا پسندیدہ قول ہے۔"[۱]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ مجتہد نے جس کلمہ کے بارے میں یہ کہا کہ یہ کفریہ کلمہ ہے تو اس سے حقیقی معنیٰ میں کفر ہی مقصود ہوتا ہے۔

لیکن کلمات الکفر کے مطالعے کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان تمام کلمات کے احکام مجتہدین سے ثابت نہیں بلکہ ان الفاظ میں ایک بڑی تعداد ان الفاظ کی بھی ہے جس میں غیر مجتہدین نے کفر کا فیصلہ فرمایا، نیز ان تمام الفاظ الکفر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہوں میں ایک لفظ کو صرف اس لئے کفر کہا گیا کہ اس میں کفریہ معانی کے احتمالات موجود تھے، لیکن ظاہر ہے کہ صرف کسی کفریہ احتمال کی وجہ سے کسی مسلمان شخص کو کافر قرار دینا اُصول کے خلاف ہے۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کا فیصلہ

شاید اُنہی وجوہات کی بناء پر علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنا یہ فیصلہ بیان کیا کہ میں ان الفاظ کی بنیاد پر کسی کے کفر کا فتویٰ نہیں دیتا، آپ نے اوّلاً فقہاء کرام کے عام معمول کے مطابق بہت سے کلمات کفر بیان فرمائے، اور پھر ان کے شرعی حکم کی مکمل تفصیل ذکر فرمائی ہے، ان تمام تفصیلات سے فارغ ہونے کے بعد بالکل آخر میں تکفیر کے متعلق احتیاط برتنے کے لئے چند اقوال نقل کئے ہیں۔

---

[۱] الفتاوي البزازية علي هامش الهندية، فصل في المتفرقات، قبيل كتاب الكراهية، ج٦ ص ٣٥٠.

اس کے بعد فرمایا:

فعلى هذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتى بالتكفير بها ولقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها.

"فقہاء کرام کے ذکر کردہ الفاظ کفر ایسے ہیں کہ ان میں سے اکثر کی بنیاد پر فتویٰ نہیں دیا جاتا، میں نے اپنے اُوپر لازم کیا ہے کہ ان میں کسی لفظ کی بنیاد پر فتویٰ نہ دوں۔"[۱]

اسی طرح بہت سے مقامات پر لزوم کفر کی وجہ سے بھی کفر کا اطلاق کیا گیا حالانکہ جمہور کے نزدیک لزومِ کفر اور التزامِ کفر میں فرق ہے اور محض لزوم کفر کی وجہ سے کسی کی تکفیر درست نہیں۔

اعتدال پسندانہ مؤقف

اس لئے زیادہ معتدل اور درست مؤقف وہی ہے جو محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ ان کلمات کی دو قسمیں ہیں:

الف: وہ کلمات جن کا حکم صراحۃً مجتہدین سے ثابت ہے، اس میں تو کفر کا حکم بیان کیا جائے۔

ب: جن کلمات کا حکم صراحۃً حضرات مجتہدین سے ثابت نہیں، ان میں احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھیں۔

علامہ فرماتے ہیں:

---

[۱]البحر الرائق مع منحة الخالق ،كتاب السير، باب أحكام المرتدين،ج٥ص ١٣٥.

نعم يقع في كلام أهل المذاهب تكفير كثير ولكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون بل من غيرهم، ولا عبرة بغير الفقهاء، والمنقول عن المجتهدين ما ذكرنا.

"اہل مذہب کے کلام میں بہت تکفیر موجود ہیں، لیکن یہ مجتہد فقہاء کرام کا قول نہیں ہے، بلکہ دیگر لوگوں کی طرف سے جبکہ دوسروں کا اعتبار نہیں ہے اور مجتہدین کا وہی مسلک ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔"[۱]

لیکن واضح رہے کہ احتیاط کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جن کلمات کا حکم مجتہدین سے ثابت نہیں، اس کو کفر قرار دینا جرم ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان جیسے کلمات کے بارے میں فوراً فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ اُصول و قواعد کی روشنی میں اس پر غور وخوض کیا جائے، اگر کہیں اُصول کے تحت تکفیر سے کوئی مانع موجود ہو تو بلاوجہ کسی کو کافر قرار دینے میں احتیاط برتی جائے اور اگر کسی کا کفر بالکل یقینی ہو تو اس کے کفر کا فتوی دیا جائے۔

****

[۱] فتح القدير ، كتاب السير، باب البغاة، ج٦ ص١٠٠.

باب سوم

- ❖ تکفیر کا رکن اعظم اور اس کی شرائط
- ❖ جس شخص کی تکفیر کی جارہی ہے، اس کے اعتبار سے شرائط
- ❖ کفریہ قول و عمل کے اعتبار سے شرائط
- ❖ تکفیر مطلق اور معین میں فرق اور اس کی وضاحت
- ❖ موانع تکفیر اور اس کی مکمل وضاحت
- ❖ تاویل کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق
- ❖ تاویل کے معتبر ہونے کی شرائط اور اس کا شرعی حکم

بابِ سوم

پچھلے باب میں کفر کی تعریف وتوضیح اور اس کے متعلق چند ضروری مباحث ذکر کئے گئے، اب اس باب میں تکفیر کا رکن اعظم، اس کا شرعی حکم، شرائط اور اس کے متعلق چند آداب ذکر کئے جائیں گے، پھر شرائط کی مختلف نوعیتیں ہیں، ایک قسم ان شرائط کی ہے جن کا مکفِّر میں موجود ہونا ضروری ہے، مکفِّر سے مراد وہ شخص ہے جو کسی کے کافر ہونے کا فتویٰ جاری کرتا ہے، دوسری قسم وہ شرائط ہیں جس کا مکفَّر میں پایا جانا ضروری ہے یعنی جس شخص کو کافر قرار دیا جارہاہے، اور تیسری قسم شرائط کا تعلق خود اس قول وعمل کے متعلق ہے جس کی بنیاد پر کسی کو کافر قرار دیا جاتا ہے۔

کفر کا حکم

چونکہ کفر وتکفیر دو الگ الگ اُمور ہیں، اس لئے دونوں کا حکم بھی جدا جدا ہے، کفر کا حکم تو واضح ہے کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے سر فہرست وہ عظیم جرم ہے جس کے اُوپر کوئی گناہ نہیں، اس کا انجام جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے، اس لئے دین ودنیا اور آخرت کی حفاظت کے لئے اس جرم کے قریب پھٹکنے سے بھی گریز کرتے رہنا لازم ہے۔

تکفیر کا حکم

دنیا اور آخرت سے متعلق شریعت کے احکام میں سے بیسیوں احکام ایسے ہیں جن میں مسلمان اور کافر کے درمیان فرق رکھا گیا ہے، یہ احکام مختلف نوعیتوں کے ہیں بعض فرض وواجب کے درجہ میں ہیں اور بعض سنت ومستحب ہیں، ان تمام احکام میں فرق کا

اصل دار و مدار ایمان و کفر ہی ہے، اگر کوئی شخص ایمان کا حامل ہے تو اس کے متعلق شریعت کا حکم الگ ہے اور اگر کوئی اس نعمت سے محروم اور کافر ہے تو اس کے متعلق حکم کچھ اور ہے، شریعت مطہرہ میں جن احکام پر عمل کرنے کو فرض یا واجب قرار دیا ہے، جس طرح ان پر عمل کرنا مکلف کی ذمہ داری ہے اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ جن مقدمات پر یہ فرض موقوف ہے ان کو بھی عمل میں لایا جائے، کیونکہ واجب کا مقدمہ واجب اور حرام کا مقدمہ حرام ہوتا ہے۔

لہٰذا ایمان و کفر پر مبنی ان احکام پر عمل کرنے سے پہلے ایمان یا کفر کا فیصلہ کرنا لازم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکفیر بھی دیگر فرائض کی طرح ایک فرضِ کفایہ ہے، اگر خدا نخواستہ کوئی شخص حقیقت میں کافر ہو جائے اور تکفیر کی تمام تر شرائط موجود ہوں تو پوری اُمت کا اس سے تغافل برتنا درست نہیں، بلکہ یہ علماء اُمت کا فرضِ منصبی ہے۔

تکفیر کا فیصلہ کون کرے؟

قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے بیسیوں نصوص میں اہلِ علم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ دین کے احکام و مسائل کی تبلیغ کیا کریں اور شریعت کی حدود و قیود کی حفاظت کریں، کبھی صاف الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا گیا، کبھی اہلِ کتاب کے علماء کے کرتوت اور اُن کے انجام بد ذکر کر کے اس جانب اشارہ کیا گیا، کہیں کتمانِ علم پر سخت وعیدیں سنائی گئی تو کہیں دین کی نشر و اشاعت کے فضائل بتائے گئے، الغرض مختلف اسالیب کے ساتھ علماء کے سر پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ دینی احکام کی تبلیغ و تبیین کریں اور دین اسلام کی حدود و قیود کی حفاظت کریں، تاکہ قیامت تک آنے والی تمام نسل انسانی کو دین اپنی اصلی صورت میں مکمل ملے۔

ایمان و اسلام اور کفر و انکار کا حکم بھی شریعتِ اسلامیہ کے دائرہ کار سے خارج

نہیں ہے، بلکہ یہی تو بنیادی اُمور ہیں اور کسی کے کفر یا اسلام کا فتوی بھی شریعت کے احکام کے ذیل میں داخل ہے۔ اس لئے جہاں عام مسائل میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز بیان کرنا اہل علم کے ذمہ لازم ہے، بالکل اسی طرح شریعت کے مقرر کردہ اُصول وضوابط کی رعایت رکھتے ہوئے کسی کی تکفیر کرنا بھی ان کا فرض منصبی ہے، بلکہ بعض پہلو کے اعتبار سے دیگر احکام کی بنسبت اس ذمہ داری کی اہمیت اور ضرورت کہیں زیادہ ہے، اگر ضرورت کے باوجود اہل علم اس ذمہ داری کو نبھانے میں سستی یا غفلت سے کام لیں تو عند اللہ یہ خطرناک جرم شمار ہو گا۔

علامہ آجُرّی رحمہ اللہ ایک روایت نقل کرتے ہے کہ:

عن معاذ بن جبل قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا حدث في أمتي البدع وشتم أصحابي فليظهر العالم علمه فمن لم يفعل ذلك منهم فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين. [۱]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب میری اُمت میں بدعات پیدا ہو جائیں اور میرے صحابہ کو گالیاں دی جائیں تو عالم کو چاہیئے کہ اپنے علم کا اظہار کرے جس نے (اس وقت میں بھی) ایسا نہیں کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔"

البتہ جہاں اس کی اہمیت زیادہ ہے وہاں اس مسئلہ کی نزاکت بھی کچھ کم نہیں، اس لئے تکفیر کا فتوی دینے سے پہلے ان تمام اُمور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو شریعت نے اس کے

[۱] الشريعة للآجري ،باب عقوبة الإمام والأمير لأهل الأهواء، رقم الحديث: ۲۰۷۵،ج۵ ص ۲۵٦۲.

لئے مقرر فرمائے ہیں، ورنہ تو اس باب میں معمولی غلطی اور بے احتیاطی بھی نہایت سنگینی اختیار کر سکتی ہے، لہٰذا اس باب میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ارتدادو کفر کا رُکنِ اعظم

جو شخص ایک بار دائرہ اسلام میں داخل ہو اور اس کے بعد وہ کفر کو اختیار کرے تو اس کو مرتد اور اس جرم کو ارتداد کہا جاتا ہے، مرتد کہنا تو چونکہ کافر قرار دینا ہے جس سے عام حالات میں شریعتِ مطہرہ نے منع فرمایا ہے جیسا کہ بابِ دوم میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا، اس لئے کسی شخص کو تبھی مرتد کہا جا سکتا ہے جب اس میں ارتداد کی تمام شرائط پوری ہو جائیں، جس کے بعد وہ بالکل مسلمان نہ رہے، بلکہ کفر کی حدود میں داخل ہو جائے۔

ارتداد دینِ حق کو قبول کرنے کے بعد اس سے پھرنے کا نام ہے اور چونکہ جمہور کے نزدیک ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اس لئے ارتداد اسی تصدیق بالقلب سے اعراض کرنے کو کہا جاتا ہے، یعنی ایمان متحقق ہونے کے لئے جن اُمور کی تصدیق ضروری ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کی تکذیب کرنا یا پوری شریعت کے انکار کرنے کی جسارت کرنا دونوں ارتداد اور کفر ہیں، بسا اوقات ایک شخص صراحت کے ساتھ تو اس طرح انکار نہیں کرتا لیکن کوئی ایسا اقدام کرتا ہے جو اس انکار کی واضح اور صریح عکاسی کرے، ایسا اقدام بھی موجبِ کفر ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ کفر کا رُکن اعظم مندرجہ بالا اُمور کی تصدیق نہ کرنا ہے اور ارتداد کی اصل جڑ اور رُکن ان اُمور کی تصدیق کے بعد تکذیب وانکار ہے جو یا تو اس شخص کی صراحت سے معلوم ہو جائے اور یا کوئی ایسا اقدام کر بیٹھے جس سے پوری وضاحت اور مکمل قطعیت کے ساتھ اس کا انکار معلوم ہو جائے اور اس میں مزید کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

شرائط

تکفیر متحقق ہونے کے لئے تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں، مکفِّر یعنی کسی کے کافر ہونے کا فتوی دینے والا۔ مکفَّر جس شخص کے کافر ہونے کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔ تیسری چیز وہ اقدام ہے جس کو بنیاد بنا کر کسی کو کافر کہا جاتا ہے، تکفیر کے لئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق اس پہلی جانب کے ساتھ ہے جبکہ بعض کا تعلق باقی دو اُمور کے ساتھ ہے، یہاں آسانی کے لئے ان کو ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

مکفِّر کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

کسی مسلمان کو کافر قرار دینا محض ایک زبانی کلامی بات نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ دنیا وآخرت کے بیسیوں مسائل کا تعلق ہے، ایسے مسائل کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں مسلمان اور کافر کے درمیان فرق ہے، لہٰذا کافر قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کا حکم ان تمام مسائل میں مسلمانوں کے برخلاف ہے اوراس پر کفار کے احکام جاری ہوں گے، اس لئے کسی کے کافر ہونے کا فیصلہ کرنا درحقیقت نازک اور حساس مسئلہ ہے جس میں معمولی سی غلطی اور جذباتیت کی وجہ سے وہ تمام احکام بے محل ثابت ہوں گے جو اس فیصلہ کے بعد مرتب ہوں گے۔

چونکہ کسی کی تکفیر بھی افتاء ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے کسی کی تکفیر کے فیصلہ کرنے والے میں ان تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو حضرات فقہاء کرام نے مفتی کے لئے ضروری قرار دی ہیں، یہاں اختصار کے ساتھ ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔

مکلف ہونا

جو شخص کسی کے کفر کا فیصلہ کررہا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ خود مکلف ہو،

یعنی عاقل، بالغ اور مسلمان ہو، بے وقوف اور نابالغ شخص کی بات کا یہاں کوئی اعتبار نہیں، اسی طرح غیر مسلم شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو لیکن تکفیر کے باب میں اس کے فیصلہ کی کوئی قیمت نہیں، محض اس کے فیصلہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر قرار دینا درست نہیں۔

عدالت

بہت سے ائمہ کرام کے نزدیک مفتی کے لئے یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ وہ عادل ہو، لہٰذا ان کے نزدیک فاسق شخص کے فتویٰ کی کوئی حیثیت نہیں، ہمارے بعض فقہاء احناف کے نزدیک مفتی کے لئے عادل ہونا تو نہایت مناسب بلکہ منصب افتاء میں کمال پیدا کرنے کے لئے اس صفت کو اپنانا ضروری ہے، تاہم فی نفسہٖ مفتی ہونے کے لئے یہ کوئی شرط لازم نہیں، بلکہ اگر فاسق شخص بھی اُصول افتاء کے مطابق کوئی فتویٰ دے تو اس کا بھی اعتبار ہو گا۔

یہ تو ایک اُصولی اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی "مفتی" تکفیر کے باب میں بھی فسق کا مظاہرہ کرے تو اس کا فتوی بالکل نا قابل قبول ہے، بلکہ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ وغیرہ اُصولیین نے لکھا ہے کہ ایسے فاسق شخص سے استفتاء بھی جائز نہیں، خصوصاً کفر واسلام جیسے نازک مسائل میں۔

تیقظ

بہت سے حضرات نے منصبِ افتاء کے لئے یہ شرط بھی ذکر فرمائی ہے کہ وہ متیقظ اور بیدار مغز ہو، غلطی و غفلت جس شخص کی عادت ہو وہ اس منصب کا اہل نہیں، موجودہ حالات کے لحاظ سے اس شرط کی رعایت رکھنا کافی مفید اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> "بعض حضرات نے مفتی کے لئے تیقظ کی شرط بھی ذکر کی ہے۔۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں یہ شرط لازم ہے، کیونکہ لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جس کو

بھی فتویٰ دیا جاتا ہے وہ اپنے خصم پر چڑھائی کرنا شروع کرتا ہے اور صرف اس دلیل پر اس کو مجبور کرتا ہے کہ مجھے مفتی نے فتویٰ دیا ہے کہ میں حق پر ہوں، مخاطب (اس کی بات سے مجبور ہو کر بات مان لیتا ہے حالانکہ) اس کو اس بات کا کوئی پتہ نہیں کہ فتویٰ میں لکھا کیا ہے، لہٰذا مفتی کا ایسا متیقظ ہونا ضروری ہے جو لوگوں کے حیلہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں سے واقف ہو۔۔۔"[۱]

زمانے کے عرف سے واقفیت

تکفیر کے بہت سے اُمور کا تعلق لوگوں کے عرف وعادت کے ساتھ بھی ہے، خصوصا یہ بحث کہ کونسے کلمات کفریہ ہیں جن کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے اور کونسے ایسے کلمات ہیں جن کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرنا درست نہیں، اس کا بڑی حد تک دار مدار ماحول ومعاشرے کے ساتھ ہے، حضرات فقہاء کرام خصوصا فقہاء احناف نے ان جیسے کلمات کی ایک طویل فہرست مرتب فرمائی ہے لیکن ان میں بھی بہت سے الفاظ کے موجب کفر ہونے کا دار مدار لوگوں کے استعمال اوران کے عرف وعادت پر ہی ہے، اس لئے مفتی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ماحول و معاشرہ، زمانے، لوگوں کے عرف وعادت اور ان جیسے کلمات کے محل استعمال سے پوری طرح واقف ہو، ان اُمور سے ناواقفیت کی وجہ سے کئی ایسی خامیاں پیدا ہو سکتی ہیں جس کی وجہ سے اصل حکم شرعی تک رسائی یقینی نہیں ہو سکتی۔

زمانہ کے عرف وعادت سے واقفیت کی اہمیت ایک مثال کی روشنی میں

عبادت اور نماز وغیرہ دین اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہیں، اس کا استہزاء اور

[۱]حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب القضاء، ج۵ ص۳۵۹.

توہین کرنا یا اس کو گالی دینا کفر ہے، لیکن ہر زبان میں بعض الفاظ کئی احتمالات کے حامل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کسی کے کفر کا فیصلہ کرنا بالکل خلاف احتیاط امر بن جاتا ہے لیکن اگر مفتی کو ان الفاظ کا محل استعمال سے واقفیت نہ ہو تو وہ بے محل تکفیر کا ارتکاب کرے گا۔

فتاویٰ حقانیہ میں اسی قسم کا ایک دلچسپ سوال اور اسکے جواب کا ذکر ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ:

سوال: ایک دیندار شخص مسجد میں اللہ کی عبادت کر کے فارغ ہو کر جب گھر آیا تو کسی بات پر بیوی سے جھگڑا ہو گیا، تو غصے کی حالت میں اس کی زبان سے پشتو کے یہ الفاظ نکل گئے " چہ مونگہ۔۔"مسجد میں عبادت کر کے جب گھر آتا ہوں تو سب کچھ تم چو دیتی ہو" تو کیا اس شخص کا یہ کہنا کلمہ کفر تو نہیں؟ اور اس سے یہ آدمی کافر بن جائے گا یا نہیں؟

جواب: اگرچہ ظاہری لحاظ سے مذکورہ الفاظ درست نہیں ہیں مگر پشتو زبان کے محاورہ میں کسی چیز کو برباد کرنے اور اس کو لغو کرنے کے معنیٰ میں مستعمل ہوتے ہیں، لیکن ان سے کسی چیز کی تحقیر و توہین مقصود نہیں ہوتی۔۔۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ دیندار شخص مسلمان ہے، اس پر کفر کا کوئی شک وشبہ نہ کیا جائے۔" ۱

مکفَّر کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

یہاں تک تو ان شرائط کا ذکر تھا جن کا مکفِّر میں موجود ہونا ضروری تھا، اب ان

---

۱ : (فتاویٰ حقانیہ، کتاب العقائد، ج ۱ ص ۱۷۲)

شرائط کو ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق اس شخص کے ساتھ ہے جس کو کافر قرار دیا جارہا ہے۔ اس قسم کی شرائط کل تین ہیں جن کی ضروری تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

پہلی شرط: عاقل ہونا

جس شخص کے مرتد ہونے کا فیصلہ کیا جارہا ہے، ضروری ہے کہ وہ عاقل بھی ہو، یعنی جس وقت اس سے کفریہ قول و عمل صادر ہوا اس وقت اس کا عاقل ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کسی دیوانہ اور پاگل آدمی نے کوئی کفریہ کلمہ بکا تو اس کو مرتد نہیں کہا جائے گا اور اس پر ارتداد کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

اگر کوئی شخص بے ہوش ہے یا نشہ میں مست وہ شخص جس کے عقل وحواس بالکل ٹھکانے نہ ہوں، اس سے اگر اس قسم کی کوئی بے ہودہ حرکت سرزد ہوجائے تو بھی اس کو کافر یا مرتد نہیں کہا جائے گا کیونکہ جس وقت یہ کفریہ عمل کررہا ہے اس وقت عقل موجود ہی نہیں۔

دوسری شرط: بالغ ہونا

یہ بھی ضروری ہے کہ کفریہ کام کرنے والا بالغ بھی ہو، اگر بلوغ کے بعد کوئی کفریہ عمل سرزد ہوجائے تب ہی اس کو کافر کہا جائے گا، بلوغ سے پہلے اس طرح حرکات کرنے کی وجہ سے اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

بلوغ کی شرط ہونے کے متعلق فقہاء کرام کے مختلف مذاہب کا خلاصہ

اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس باب میں حضرات ائمہ کرام کے کل تین مذاہب ہیں:

الف: بلوغ ایمان وکفر دونوں کے لئے ضروری ہے، یعنی نابالغ شخص اگر ایمان لائے یا کوئی کفریہ کام کرے تو دونوں صورتوں میں اس کے ایمان وکفر کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ

اپنی اصلی حالت پر رہے گا، اگر پہلے وہ مسلمان سمجھا جارہا تھا تو اب بھی مسلمان ہی شمار ہو گا اور اگر پہلے کی صورتِ حال اس کے خلاف تھی تو اب بھی وہی حکم برقرار رہے گا۔

ب: ایمان و کفر دونوں کے لئے بالغ ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ عقل و تمیز ہی کافی ہے، اگر کوئی نابالغ بچہ سن تمیز کو پہنچ جائے اور وہ عقل و شعور بھی رکھتا ہو تو اس عمر میں اگر وہ ایمان لائے یا خدانخواستہ کوئی کفریہ مؤقف اختیار کرے تو دونوں صورتوں میں اس پر ایمان و کفر کے احکام جاری ہوں گے، پہلی صورت میں اس کو باقاعدہ مسلمان اور دوسری صورت میں کافر کہا جائے گا، صرف نابالغ ہونے کی وجہ سے اس کی اس حرکت کو غیر معتبر نہیں کہا جائے گا۔

ج: ایمان کے لئے تو بالغ ہونا کوئی ضروری نہیں، لیکن کفر کے لئے یہ شرط ہے، لہٰذا نابالغ شخص کو اس کے ایمان لانے کی وجہ سے مسلمان تو کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کی کسی حرکت کی وجہ سے اس کو مرتد نہیں کہا جاسکتا۔

پہلا مؤقف حضرت امام شافعی اور امام زفر رحمہ اللہ کا ہے، دوسرا مؤقف حضرت امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، جبکہ تیسرا مسلک حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ہے۔[۱]

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: المغنی لابن قدامة، کتاب المرتد ج ۹ ص۱۳، بدائع الصنائع، کتاب السیر، باب أحكام المرتدين، ج٤ ص ١١٧، المكتبة الحقانية بشاور، التشريع الجنائی الإسلامی مقارنا بالقانون الوضعی، الكتاب السادس: الردة ج ٢ ص ٥٨٧-

تیسری شرط: اختیار ورضامندی

کفروارتداد کے لئے یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ حالتِ اختیار ہی میں یہ قول وفعل صادر ہو جائے، اگر کسی شخص کو کسی کفریہ عمل کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس کے پاس اس کام کو کرنے کے سوا بچنے کی کوئی اور تدبیر میسر نہ ہو اور مجبوری کی حالت میں وہ کفریہ کام کرے تو اس صورت میں اگر دل ایمان پر مطمئن ہے اور اس کام کرنے پر دلی رضامندی بالکل نہیں تھی تو اس کو کافر نہیں کہیں گے۔

حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کئی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا، امام طبری رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ مشرکین نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر سخت اذیتیں پہنچائیں اور اس بات پر مجبور کیا کہ حضور ﷺ کی برحق رسالت کا انکار کر بیٹھے، اُنھوں نے زبان سے اس طرح کوئی کلمہ کہا لیکن چونکہ دل میں راسخ ایمان اور مضبوط اعتقاد موجود تھا، اس لئے حضور ﷺ کے دربار عالیہ میں اسی پریشانی کی شکایت لے کر آئے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

"جو شخص ایمان لائے پیچھے اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جاوے، بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو، لیکن ہاں جو جی کھول کر کفر

کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہو گا اور ان کو بڑی سزا ہو گی۔"[۱]

حضور ﷺ نے حضرت عمار سے پوچھا کہ "كيف تجد قلبك؟" حضرت عمار نے جواب دیا کہ "مطمئنا بالإيمان" حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: "فإن عادوا فعد".[۲]

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کو کسی کفریہ کلمہ کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ بادِلِ نخواستہ وہ کلمہ کہہ گزرے تو محض اس کہنے سے وہ کافر نہیں ہو گا، لیکن اس صورت میں بھی ان تین باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو موانع کے ذیل میں مذکور ہوں گی۔

غلطی سے کوئی کفریہ کلمہ کہنے کا حکم

اسی طرح اگر کوئی شخص کلمہ کفر کہے لیکن رضامندی سے نہ ہو بلکہ غلطی سے کہے مثلاً کوئی جائز بات کہنے کا ارادہ تھا لیکن غلطی سے زبان سے کفریہ بات نکلی تو چونکہ یہ کفریہ بات اس نے اپنی رضامندی سے نہیں کہی، اس لئے اس کی وجہ سے وہ کافر بھی نہیں ہو گا۔

علامہ قاضی خان رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أما الخاطئ إذا جرى على لسانه كلمة الكفر خطأ بأن كان أراد أن يتكلم بما ليس بكفر فجرى على لسانه كلمة الكفر خطأ لم يكن ذلك كفرا عند الكل بخلاف الهازل لأن الهازل يقول قصدا إلا أنه لا يريد حكمه و الخاطئ من يجري على لسانه من

[۱] النحل: ١٠٦

[۲] جامع البيان ت شاكر، تفسير سورة النحل، رقم الاية: ١٠٦، ج١٧ ص ٣٠٤.

غير قصد كلمة مكان كلمة.

"اگر غلطی کے ساتھ کسی کی زبان پر کوئی کفریہ بات جاری ہو جائے کہ وہ کوئی اور بات کہنا چاہتا تھا مگر زبان سے غلطی کے ساتھ کفریہ بات نکلی تو یہ بالاتفاق کفر نہیں، بخلاف مذاق کرنے والے کے، کیونکہ مذاق کرنے والا خود اس کفریہ بات کا ارادہ کرتا ہے (اس لئے وہ کافر ہے) مگر (زیادہ سے زیادہ) اس کے حکم یعنی کفر کا قصد نہیں کرتا، اور خاطی کے تو زبان ہی سے ایک بات کی بجائے دوسری بات نکلتی ہے۔"[۱]

کفریہ کلمہ کہا اور معنیٰ معلوم نہیں

اسی طرح اگر کوئی کفریہ کلمہ زبان پر آجائے لیکن کہنے والے کو اس کا معنیٰ و مفہوم کچھ معلوم نہ ہو، نہ ہی اس کو یہ علم ہو کہ یہ کفریہ کلمہ ہے جس کے کہنے سے انسان دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے، تو کیا اس کلمہ کہنے سے بھی کوئی کافر ہو جائے گا یا نہیں؟

اس باب میں فقہاء حنفیہ کا اختلاف ہے، بعض فقہاء نے تو اس کو بھی کفر قرار دیا جبکہ دیگر فقہاء کرام اس بناء پر اسکی تکفیر کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اس لاعلمی کو عذر قرار دیدیتے ہیں۔

چونکہ کفر کا دارومدار دل کی تکذیب پر ہے، کلمہ کفر کو اسی لئے موجب کفر قرار دیا گیا ہے کہ وہ دل کی تکذیب پر دلالت کرتا ہے، اور جب قوی قرائن سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ اس کلمہ کا معنیٰ و مفہوم بالکل نہیں جانتا اور ساتھ ساتھ اس بات سے بھی

---

[۱] فتاوى قاضيخان، باب ما يكون كفرا من المسلم وما لا يكون، ج۳ص۳۶۲.

ناواقف ہے کہ یہ کفریہ بات ہے تو اس کے بعد محض اس کلمہ کو دلی تکذیب کا ترجمان قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے متعدد فقہاءِ کرام نے اسی دوسرے مؤقف کو ترجیح دی کہ ایسے شخص کی تکفیر نہ کی جائے۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فتاویٰ ظہیریہ میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ کے نزدیک ایسا کلمہ کہنے والا کافر ہو جائے گا چاہے اس کا معنیٰ معلوم ہو یا نہیں، اس معنیٰ کا ارادہ کیا ہو یا نہیں (بہر حال کافر ہو جائے گا)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ (ہر حال میں کافر کہنا) مشکل ہے کیونکہ جب اس نے کوئی عجمی کلمہ سنا جبکہ اس کا معنیٰ معلوم نہ تھا اور اس کو یوں ہی عجم کی طرح استعمال کیا تو اس کو کیسے کافر قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ اس کلام کا معنیٰ کہنے والا کا مقصود نہ تھا۔"[۱]

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے الفاظِ طلاق کے مبحث میں اسی کو ترجیح دی، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

ولا خلاف أنه لو جرى على لسانه الكفر مخطئا لا يكفر كما في الخانية أيضا وكذا إذا تلفظ به غير عالم بمعناه.

"اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس شخص کی زبان پر غلطی سے کلمہ کفر جاری ہو جائے تو وہ کافر نہیں ہے جیسا کہ فتاویٰ خانیہ میں ہے، اگر کسی نے کلمہ کفر کہا اور اس کا معنیٰ معلوم نہ تھا تو بھی یہی حکم ہے۔"[۲]

---

[۱]شرح الإمام على القارى على ألفاظ الكفر، ص۲۲۹.

[۲]البحر الرائق شرح كنز الدقائق،كتاب الطلاق،باب ألفاظ الطلاق،ج۳ص۲۷۷.

علامہ عزالدین بن عبد السلام رحمہ اللہ نے بھی اسی بات کو اختیار فرمایا کہ متکلم کو ایسی صورت میں کافر قرار دینا درست نہیں۔[۱]

کافر ہونے کا قصد ضروری نہیں بلکہ قصد فعل کافی ہے

اس شرط کا حاصل یہ ہوا کہ کسی کو کافر کہنا تب درست ہے جبکہ بنائے تکفیر اس کے قصد واختیار سے صادر ہو جائے، اگر اختیار کے بغیر اکراہ کی حالت میں کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اس کو بنیاد بنا کر تکفیر کرنا جائز نہیں، تاہم قصد واختیار سے مراد یہ نہیں ہے کہ کرنے والا کافر ہونے کا بھی ارادہ کرے، بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ جس حرکت کی وجہ سے اس کو کافر قرار دیا جارہا ہو، وہ اس نے اپنے ارادے واختیار سے کی ہو، یعنی قصدِ کفر شرط نہیں بلکہ قصدِ امرِ مکفّر بھی کافی ہے۔

لہٰذا اگر کوئی جبر واکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے ایسا کام کرے جس بناء پر اس کو کافر قرار دینا ضروری ہو تو اس کی تکفیر کی جائے گی، اگرچہ خود کافر ہونا اس کا مقصود نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے کلمات کفریہ کی کہنے کی وجہ سے تکفیر کا حکم لکھا ہے، اگرچہ کہنے والے نے کافر ہونے کا ارادہ نہیں کیا ہو، بلکہ محض تفریح کی خاطر ایسے کلمات کہے ہوں۔[۲]

عام تکفیر اور شخصِ معین کی تکفیر میں فرق

یہاں تک جو تین شرائط ذکر کی گئیں ہیں، یہ کسی قول وفعل کے کفریہ ہونے کی

[۱] قواعد الأحكام في مصالح الأنام،فصل فيمن أطلق لفظا لا يعرف معناه لم يؤاخذ بمقتضاه، ج۲ص ۱۲۰.

[۲] الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الجهاد، باب المرتد،ج٤ ص ۲۲٤.

ضروری شرائط ہیں، اگر کسی شخص نے کوئی کفریہ کام کیا ہو لیکن ان تین اُمور میں سے کوئی ایک مفقود تھا تو کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا جس کی وضاحت ہر شرط کے ذیل میں ذکر ہو چکی ہے۔

یہ ساری تفصیل صرف کسی چیز کے موجب کفر ہونے کے متعلق ہے یعنی ان شرائط کی موجودگی میں کوئی کفریہ قول و عمل موجب کفر بنتا ہے جس کے نتیجے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس شخص نے کفریہ عمل کیا اور مندرجہ بالا شرائط موجود تھیں تو وہ کافر ہے، لیکن اگر کسی خاص شخص مثلاً زید نے اس قسم کی کوئی حرکت کی ہے تو اس کو کافر قرار دینے کے لئے صرف مندرجہ بالا شرائط ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے مزید ایک شرط اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ سابقہ تمام شرائط کے موجود ہونے کے ساتھ ساتھ تکفیر کے موانع بھی موجود نہ ہوں۔

لہٰذا اگر ان شرائط کے موجود ہونے کے باوجود کسی نے کفریہ قول اختیار کیا یا کفریہ عمل کیا لیکن وہاں تکفیر سے کوئی مانع بھی موجود تھا تو اس کی وجہ سے اس کو کافر نہیں کہیں گے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ شرائط تو عام تکفیر کے لئے کافی ہیں لیکن کسی خاص شخص کو کافر قرار دینے کے لئے صرف یہ شرائط کافی نہیں ہیں بلکہ موانع کا موجود نہ ہونا بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی تصریح

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

اعلم أن الحكم بكفر من ذكرنا من أهل الأهواء مع ما ثبت عن أبي حنيفة والشافعي رحمهم الله من عدم تكفير أهل القبلة من المبتدعة كلهم محمله أن ذلك المعتقد نفسه كفر، فالقائل به قائل بما هو كفر، وإن لم يكفر بناء على كون قوله ذلك عن استفراغ وسعه مجتهدا في طلب الحق.

"یاد رکھو کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ سے اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنا منقول ہے اس کے باوجود اہل بدعات کو کافر کہنے کا محمل یہ ہے کہ خود یہ عقیدہ کفریہ ہے لہٰذا ایسا شخص کفریہ عقیدہ رکھ رہاہے اگرچہ بعض موانع کی وجہ سے اس کو کافر نہیں کہاجاتا، مثلاً یہ کہ وہ حق کی جستجو میں اپنی پوری طاقت صرف کرے۔"[۱]

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی توضیح

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اپنی کئی کتابوں میں اس پر بڑا زور دیا ہے کہ مطلق اور عمومی تکفیر سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے تحت آنے والے ہر ہر فرد کو ہر حال میں کافر قرار دیا جائے، بلکہ دونوں قسم کی تکفیر میں بڑا فرق ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ فقہاء کرام کے ذکر کردہ موجبات کفر کا محمل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قد ينقل عن أحدهم أنه كفر من قال بعض الأقوال، ويكون مقصوده أن هذا القول كفر ليحذر، ولا يلزم إذا كان القول كفرا أن يكفر كل من قاله مع الجهل والتأويل ؛ فإن ثبوت الكفر في حق الشخص المعين، كثبوت الوعيد في الآخرة في حقه، وذلك له شروط وموانع، كما بسطناه في موضعه.

بسا اوقات کسی سے منقول ہوتا ہے کہ جو کوئی ایسا کلمہ کہے وہ کافر ہے، اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ کفریہ بات ہے جس سے بچنا چاہئے، اور کسی بات کے کفریہ ہونے سے

---

[۱] فتح القدير، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ج۱ ص۱۳۵.

یہ کہیں لازم نہیں آتا کہ اس کا ہر کہنے والے کو کافر ہی کہا جائے، اگرچہ وہ جہالت یا تاویل کے ساتھ بھی وہ کلمہ کہے، کیونکہ کسی خاص شخص کے حق میں کفر کا ثبوت ایسا ہی ہے جیسا کسی معین آدمی کے لئے آخرت میں عذاب ثابت کرنا، ان (دونوں باتوں) کے لئے کچھ شرائط اور کچھ موانع ہوتی ہیں (جن کی رعایت رکھے بغیر اس طرح اقدام کرنا جائز نہیں۔)[۱]

اس عبارت کا حاصل بھی یہی ہے کہ ایک ہے کسی عقیدے کا کفریہ ہونا، اور دوسری چیز اس عقیدے رکھنے والے کو کافر کہنا ہے، یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں، کسی عمل کے کفریہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتکب ہر حال میں کافر ہے یعنی تکفیر مطلق تکفیر معین کو مستلزم نہیں۔

تکفیر مطلق اور معین میں فرق کرنے کی دلچسپ نظیر احادیث کی روشنی میں

امام عبد الرزاق صنعانی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور ﷺ کے دربارِ اقدس میں ایک شخص کو اس جرم کی پاداش میں لایا گیا کہ اس نے شراب نوشی کی تھی، اس سے پہلے بھی اسی جرم کی وجہ سے اس کو بار بار حاضر کیا گیا تھا لیکن کئی بار سزا پانے کے باوجود وہ باز نہیں آرہا تھا، اس لئے حاضرین میں سے ایک شخص نے بددعا دی کہ اس پر خدا کی لعنت ہو، یہ کتنا ہی زیادہ شراب پیتا ہے کہ بار بار سزا پانے کے باوجود شراب نوشی کو چھوڑنے کا نام تک نہیں لے رہا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا:

لا تلعنه فإنه يحب الله ورسوله.

---

[۱] منهاج السنة النبوية، فصل الله أمر بالاستغفار لأصحاب محمد فسبهم الرافضة، ج۵ ص۲٤۰.

"اس پر لعنت نہ کرو کیونکہ یہ خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے"۔[۱]

اس حدیث مبارک میں حضور ﷺ نے شخص مذکور پر لعنت کرنے سے منع فرمایا حالانکہ وہ شراب نوشی کے جرم میں حاضر کیا گیا تھا اور اس جرم کا ثبوت بھی ہو چکا تھا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شراب پینا اس کا معمول تھا۔ ان ساری باتوں کے باوجود حضور ﷺ نے اس کو ملعون کہنے یا لعنت کی بددعا کرنے سے ممانعت فرمائی، حالانکہ سنن ترمذی کی صحیح روایت میں یہ صراحت ہے کہ خود حضور ﷺ نے شراب کے متعلق دس افراد پر لعنت فرمائی جن میں سے ایک خود شراب پینے والا بھی ہے[۲]۔

اس روایت کے مطابق شراب پینے والا ملعون ہے اور اس کو ملعون کہنے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ پھر خود حضور ﷺ نے کیوں ممانعت فرمائی؟

دراصل بات یہ ہے کہ عمومی طور پر لعنت کرنا اور چیز ہے، خاص کسی معین شخص کو ملعون کہنے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، دونوں حدیثوں کو جمع کرنے سے وضاحت کے ساتھ یہ مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ عمومی طور پر شراب پینے والوں پر لعنت کرنا اور چیز ہے اور خاص کسی شراب خور پر لعنت کرنے کا حکم جدا ہے، حضور ﷺ جو دس افراد پر لعنت فرمائی، وہ عمومی لعنت کے قبیل سے ہے کسی خاص شخص پر لعنت کرنے کے لئے اس سے استدلال کرنا درست نہیں۔

---

[۱] مصنف عبد الرزاق الصنعاني ،باب حد الخمر، رقم الحديث: ۱۳۵۵۲،ج۷ص ۳۸۱.
[۲]سنن الترمذی،أبواب البيوع،باب النهي أن يتخذ الخمر خلا، رقم الحديث: ۱۲۹۵.

تکفیر مطلق اور معین میں فرق کرنے کی فقہی نظیر

متعدد احادیث میں لعنت کرنے سے منع فرمایا گیا، امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں اس قسم کی متعدد روایات جمع کی ہیں جن میں حضور ﷺ نے کسی مسلمان پر لعنت کی بد دعا سے روکا ہے۔[۱]

ان احادیث کی وجہ سے حضرات فقہاء کرام کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ عام حالات میں کسی کو ایسی بد دعا دینا ناجائز اور گناہ ہے، مگر تقریباً تمام فقہاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ لعنت کرنے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک کسی خاص فرد پر لعنت کرنا، مثلاً کوئی یہ کہے کہ اللہ زید کو ملعون کرے، یا کہے کہ زید پر خدا کی لعنت ہو۔

۲۔ کسی خاص وصف کی بنیاد پر لعنت کرنا، اور وہ وصف بھی ایسا ہو کہ جو کفر و فسق پر مشتمل ہو، مثلا جھوٹوں پر خدا کی لعنت۔

پہلی قسم کی لعنت کا حکم فقہاء کرام نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک کوئی شخص زندہ ہے تو اس طرح بد دعا کرنا ناجائز ہے اور دوسری قسم کا حکم یہ ہے کہ ایسا کرنا بالکل جائز ہے، خود قرآن کریم میں " ألالعنة الله على الكذبين" فرمایا گیا اور احادیث مبارکہ میں تو دسیوں گناہوں پر ایسی بد دعا منقول ہے، لیکن اس جیسی عمومی لعنت کے جائز ہونے کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ اگر کسی خاص شخص میں یہ وصف موجود ہو مثلا کوئی شخص جھوٹ بولتا ہو تو اس پر یہ کہہ کر لعنت کی جائے کہ قرآن کریم میں جھوٹوں پر لعنت کی گئی ہے اور یہ بھی جھوٹا ہے

---

[۱]إحياء علوم الدين، ربع المهلكات، كتاب آفات اللسان.

اس لئے اس پر لعنت ہو۔

علامہ بِرکوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

فلا يجوز لشخص معيّن بطريق الجزم إلّا أن يثبت موته على الكفر كأبي جهل وفرعون وإبليس ولا لحيوان ولاجماد..وإنّما يجوز اللّعن بالوصف العام المذموم إذ ثبت عن النبيّ صلى الله عليه وسلّم أنّه لعن من ذبح لغير الله تعالىٰ.[1]

"مخصوص آدمی پر حتمی طور پر لعنت کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اس کا کفر پر مرنا ثابت ہو جائے جیسے ابو جہل، فرعون اور ابلیس، نہ ہی کسی حیوان یا جمادات پر لعنت کرنا جائز ہے، صرف کسی عام اور مذموم صفت کی بناء پر ہی لعنت کی جاسکتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ اُنہوں نے غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔"

اس کتاب کے مشہور شارح علامہ ابو سعید خادمی رحمہ اللہ نے یہاں یہ اشکال اُٹھا یا ہے[2] کہ قرآن وحدیث میں جہاں کسی عام وصف پر لعنت کی گئی ہے وہاں اکثر "کل" وغیرہ ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو اپنے مدخول کے تمام افراد پر بولے جاتے ہیں اور سب افراد کے لئے حکم ثابت کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ مثلاً جھوٹ بولنے والنے ہر ہر فرد پر لعنت ہے، اب کوئی شخص اگر جھوٹا ہے اور اس کا جھوٹا ہونا

[۱] الطريقة المحمدية، الباب الثاني، ص٣٦٧.

[٢] بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية ، الباب الثاني، ج٣ ص١٩٥ .

ثابت ہو جائے تو آسانی کے ساتھ یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور ہر جھوٹے پر خدا کی لعنت ہے لہٰذا اس پر بھی خدا کی لعنت ہے، منطق کی اصطلاح میں اس کو شکلِ اوّل سے تعبیر کیا جاتا ہے جو بالکل بدیہی الانتاج ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی مخصوص شخص ان جیسے اوصاف کا حامل ہے جس پر قرآن وحدیث میں لعنت وارد ہوئی ہے تو اس پر لعنت کرنا کیونکر ممنوع ہو سکتا ہے؟

اس اشکال کو ذکر کرنے کے بعد جواب کا مختصراً ذکر فرمایا جس کی آسان تعبیر یہی ہے کہ مطلق لعن کرنے سے ہر ہر فرد پر لعنت کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، لعنِ معیّن اور لعن مطلق میں فرق ہے، اس کی واضح دلیل مصنف عبد الرزاق کی وہ روایت ہے جو ابھی ذکر کی گئی۔

امام صاحب کے کلام سے ایک اور نظیر

امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا نقول إن حسناتنا مقبولة وسيئاتنا مغفورة كقول المرجئة ولكن نقول من عمل حسنة بجميع شرائطها خالية عن العيوب المفسدة ولم يبطلها بالكفر والردة والأخلاق السيئة حتى خرج من الدنيا مؤمنا فإن الله تعالىٰ لا يضيعها بل يقبلها منه ويثيبه عليها-

ہم مرجئہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں قبول اور برائیاں معاف ہیں، البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو کوئی بھی اپنی تمام تر شرائط کے ساتھ کوئی نیک کام

کرے۔۔۔تو اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں فرمائیں گے، بلکہ قبول کر کے اس پر ثواب بخشیں گے۔"[۱]

اس عبارت میں عمومی قانون تو بیان کیا، لیکن اس کو کسی خاص شخص پر منطبق ہونے سے انکار فرمائیں گے۔

معین سے کیا مراد ہے؟

خاص فرد پر لعنت کرنے اور گناہ وفسق عمومی اوصاف کو بنیاد بنا کر لعنت کرنے میں واضح فرق ہے، پھر خاص فرد پر لعنت کرنا صرف اسی میں منحصر نہیں کہ کوئی کہے زید پر خدا کی لعنت ہو، بلکہ ایک سے زائد افراد بھی اگر کسی وصف میں شریک ہوں اور وہ وصف بھی بذاتِ خود کسی فسق وفجور جیسے عمومی وصف پر مشتمل نہ ہو تو ان پر عمومی طور پر لعنت کرنے کا بھی یہی حکم ہے مثلاً کوئی کہے کہ فلاں گاؤں کے تمام رہنے والوں پر خدا کی لعنت۔

چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے "رعل وذکوان" وغیرہ بعض قبائل کے متعلق یہی بد دعا شروع فرمائی تو آیت کریمہ "ليس لک من الأمر شيء" نازل ہوئی[۲] جس میں آپ ﷺ کو اس سے منع فرمایا گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام فقہاءِ کرام کے نزدیک لعنت کرنے کی ان دونوں صورتوں میں فرق ہے، عمومی اوصاف پر لعنت کرنے سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ خصوصی افراد پر بھی لعنت کی جائے، بس یہی حکم تکفیر کا بھی ہے کہ بعض جرائم کی بنیاد پر اگر

---

[۱] الفقه الأكبر، ص:٤٧.

[۲] الدر المنثور في التفسير بالمأثور، تفسير سورة آل عمران، رقم الأية: ١٢٨، ج٢ص٣١٣.

کہیں عمومی تکفیر کی جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس جرم میں مبتلا ہر ہر شخص کو معین طور پر کافر کہا جائے، محض تکفیر مطلق کی وجہ سے تکفیر معین کرنا درست نہیں۔

چوتھی شرط: موانع کا موجود نہ ہونا

موانع تکفیر

فقہاءِ کرام اور متکلمین کے تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص معین کی تکفیر سے تین موانع ہیں:

۱۔ جہل ۲۔ اکراہ ۳۔ تاویل

لیکن ظاہر ہے کہ یہ اُمور بھی مطلقاً موانع نہیں ہے کہ ہر جگہ اسی کے سہارے تکفیر سے گریز کرنا ضروری قرار دیا جائے بلکہ ہر ایک مانع بننے کے لئے کچھ حدود و قیود ہیں جس کو ذکر کئے بغیر یہ بحث نامکمل رہے گا، اس لئے ذیل میں ہر ایک کی ضروری تفصیل ذکر کر دی جاتی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

پہلا مانع: جہل

اسلام کے احکام کی دو قسمیں ہیں:

الف: ایک قسم ان احکام کی ہے جو دین کے متواتر اور متوارث احکام و تعلیمات ہیں جو ہر عالم اور دیندار آدمی کو معلوم ہوتے ہیں، اس کا علم تو ہر مسلمان کے لئے شرعاً ضروری ہے اس سے جاہل رہنا کوئی عذر نہیں۔

ب: دوسری قسم ان احکام کی ہے جو اس قدر مشہور نہ ہوں، اور ہر خاص و عام کو معلوم نہ ہوں۔

اس قسم کے احکام کا اگر کوئی شخص انکار کرے تو اس پر فوراً کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بلکہ اوّلاً اس کو اصل حکم بتایا جائے گا کہ یہ شریعت کا ثابت شدہ حکم ہے، اگر اس کے باوجود بھی وہ انکار یا تکذیب کرے اور اس حکم کا شریعت میں سے ہونا بھی یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو، تبھی اس کے کفر کا فیصلہ ہو گا، کیونکہ ممکن ہے کہ اس انکار کی بنیاد حضور ﷺ اور دین اسلام کی تکذیب نہ ہو، بلکہ ناواقفیت کے نتیجہ میں اس کا ارتکاب کیا ہو، اس لئے پہلے اس کو شرعی احکام کی تبلیغ و تلقین کرنی ضروری ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ظن لجهله أن ما فعله من المحظورات حلال له، فإن كان مما يعلم من دين النبي صلى الله عليه وسلم ضرورة، كفر وإلا فلا.

"کسی نے اپنی جہالت کی وجہ سے یہ گمان کیا کہ جو منکرات میں نے کئے ہیں، وہ جائز ہیں تو دیکھا جائے گا، اگر وہ منکرات ایسے ہوں جس کا دینِ اسلام میں سے ہونا بداہۃً معلوم ہو تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔[۱]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ دینی احکام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ضروریاتِ دین کے قبیل سے ہیں ان کا انکار کرنا مطلقاً کفر ہے، چاہے انکار کرنے والے کو اس کے حکم شرعی ہونے کا علم ہو یا نہ ہو۔

---

[۱] الأشباه والنظائر مع غمز عيون البصائر، أحكام الناسي والجاهل والمكره، ج۳ص۳۰٤.

۲۔ ضروریاتِ دین کے علاوہ دیگر احکام کا انکار کرنا مطلقاً کفر نہیں ، ان کی وجہ سے انکار کرتے ہی کفر کا حکم جاری نہیں ہو گا بلکہ منکر کو اوّلاً اس حکم کی تبلیغ کی جائے گی، اس کے بعد بھی اگر وہ انکار ہی پر مصر رہا تو کافر قرار دیا جائے گا۔

قیامِ حجت

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تفصیل بھی تب ہے کہ جب کوئی اسلامی معاشرہ میں رہ رہا ہو، اور معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اس کو شعوری یا لاشعوری طور پر یہ احکامات معلوم ہوں، کیونکہ قانون الٰہی یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس حضرات انبیاء کرام کی تعلیمات نہ پہنچتی ہوں، اس وقت تک نافرمانیوں اور گناہوں کی وجہ سے اس قوم کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا جاتا، عذاب وسزا ہمیشہ حجت قائم ہونے کے بعد ہی دی جاتی ہے۔

اس لئے حضرات متکلمین نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص دور دراز پہاڑی پر رہ رہا ہو جہاں شرعی احکام اور دینِ اسلام کی دعوت نہیں پہنچی، یا کوئی شخص دارالحرب میں قیام پذیر ہے جہاں اسلام کا معاشرتی اور ثقافتی ماحول میسر نہ ہو، اور وہاں کے رہنے والوں کے پاس نماز وغیرہ دینی احکام جاننے کے ذرائع نہ ہوں تو اگر ایسی صورت میں کوئی شخص ان ضروریاتِ دین کی تصدیق نہ بھی کرے تو بھی اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

علامہ جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقيد العلم ليخرج عنه المحرمات الصادرة عمن لم تبلغه دعوة نبي أو عمن هو قريب العهد بالإسلام.

"علم کی قید اس لئے لگائی تا کہ اس سے وہ محرمات کام نکل جائیں جن کا ارتکاب ایسا شخص کرتا ہے جس کو نبی ﷺ کی دعوت نہیں پہنچی ہو، یا جو کوئی ابھی نیا

اسلام قبول کر چکا ہو۔ (اور اس کو حلال و حرام وغیرہ کا علم نہ ہو) "[۱]

وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام و کفر کا دار و مدار تصدیق و عدمِ تصدیق پر ہے، دونوں کے درمیان تقابل عدم والملکہ ہے، ایمان کے لئے تصدیق ضروری ہے اور کفر دراصل تکذیب کا نام ہے لیکن حضور ﷺ کی تصدیق نہ کرنا ہی تکذیب کے مترادف ہے جیسا کہ باب اوّل میں پوری تفصیل کے ساتھ یہ بحث گزر چکی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اب سوال یہ ہے کہ جب عدمِ تصدیق کفر ہے تو شخص مذکور کو کافر ہی قرار دینا چاہئے، کیونکہ پہلی صورت میں اس نے ان احکام کا واضح انکار کیا جن کو "ضروریاتِ دین" کہا جاتا ہے، اور پہلی صورت میں اگرچہ صریح انکار تو نہیں کیا لیکن اس کی تصدیق بھی نہیں کی، لہٰذا ان دونوں صورتوں میں کفر کے احکام جاری ہونے چاہئیں، پھر متکلمین اس کو کافر کیوں نہیں قرار دیتے؟

لفظ کفر کے دو مختلف مفہوم

اس کا جواب واضح ہے کہ کفر کے دو استعمال ہیں، دونوں استعمال میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، علم کلام اور علم فقہ میں کفر کا لفظ دونوں مفہوم میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ دنیا میں کسی کے متعلق کفر کے احکام جاری ہونا، یعنی کافر ہونے کا مطلب یہ

[۱] شرح المواقف، المرصد السادس، المقصد الخامس في الحسن والقبح، ج ۸ ص ۲۰۵۔

لیا جاتا ہے کہ وہ شخص دنیا میں مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے سے محروم ہو گا، دنیا میں اس پر کافر کے احکام ہی جاری ہوں گے مثلاً اس پر سلام کرنے میں سبقت نہ کرنا، مسلمانوں کا اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھنا، رشتہ وناطہ کے مسئلہ میں مسلمانوں کا اس سے امتیاز باقی رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ کفر کا دوسرا اطلاق اس معنیٰ میں ہوتا ہے کہ آخرت میں وہ کافر شمار ہو گا اور اس پر کفر ہی کے احکام جاری ہوں گے، مثلا وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اس کی مغفرت نہیں ہو گی وغیرہ وغیرہ۔

جن حضرات نے مذکورہ دونوں صورتوں میں کفر کا حکم نہیں لگایا ان کا مقصود دوسرے معنیٰ میں کافر ہونے کی نفی ہے یعنی اُخروی احکام میں ایسا شخص دوسرے کفار کی طرح جہنم میں نہیں جائے گا، کیونکہ جب تک اس کو دین حق کی دعوت نہیں پہنچی تو قبول نہ کرنے میں وہ مجرم بھی نہیں، کیونکہ نماز وغیرہ عبادات محض عقل سے معلوم نہیں ہو سکتے، بلکہ اس کے لئے وحی الٰہی کی ضرورت ہے جس کی تبلیغ شخص مذکور کو ہوئی نہیں، اس لئے اسلام قبول نہ کرنے میں وہ معذور شمار ہو گا۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا.

"اور ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں بھیج دیتے۔"[۱]

امام طبری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

[۱] الإسراء: ۱۵

وما كنا مهلكي قوم إلا بعد الإعذار إليهم بالرسل، وإقامة الحجة عليهم بالآيات التي تقطع عذرهم. كما حدثنا بشر- عن قتادة، قوله (وما كنا معذبين-:إن الله تبارك وتعالىٰ ليس يعذب أحدا حتى يسبق إليه من الله خبرا، أو يأتيه من الله بينة، وليس معذبا أحدا إلا بذنبه. [۱]

ترجمہ: "اور ہم کسی قوم کو تب سزا دیتے ہیں جب واضح نشانات اور پیغمبروں کے ذریعے ان کا عذر ختم کریں، حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے باری تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی "ہم کسی قوم کو تب سزا دیتے ہیں جب انہیں پیغمبر مبعوث فرمائیں۔" کے تحت نقل ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تب تک سزاوار نہیں ٹھہراتا ہے جب تک انہیں اللہ کی طرف سے خبر یا واضح دلیل نہ آئے۔"

امام شاطبی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس انبیاء کرام تشریف نہیں لاتے، اور ان کی دعوت نہیں پہنچتی تو اس وقت تک اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں بھی کرتے رہیں، شرعی احکام کی مخالفت بھی کرتے رہیں، تو بھی اللہ تعالیٰ ان کا مواخذہ نہیں فرماتا[۲]

"کفر" کے ان دونوں قسم کے استعمال کو مد نظر رکھ کر پہلے استعمال کے اعتبار سے وہ کافر ہے، دنیا میں اس پر کفر کے احکام جاری ہوں گے، کیونکہ مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے کے لئے قبولِ اسلام بنیادی شرط ہے اور اسلام چونکہ ایک وجودی چیز ہے جو اَبھی تک

---

[۱] جامع البيان ت شاكر، تفسير سورة الإسراء، رقم الاية: ۱۵ ج۱۷ ص۴۰۲.
[۲] الموافقات، كتاب الأدلة الشرعية، ج٤ ص۲۰۰.

شخص مذکور سے وجود میں نہیں آیا، اس لئے اسلام کے احکام بھی اس پر جاری نہیں ہونگے۔

تاہم اتنا ضرور ہے کہ دیگر کفار کے برعکس اس قسم کے لوگوں کو دعوت دینے سے پہلے ان سے قتال کرنا جائز نہیں ہے، دعوت دینے کے بعد ہی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اس قسم کا اقدام کیا جاسکتا ہے کیونکہ جب دین حق کی آواز نہیں پہنچی ہو تو وہ معذور ہے اور یہ کفر اس کی سرکشی یا بغاوت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ الناس أعداء لما جهلوا.

امام محمد رحمہ اللہ کا مدبرانہ فیصلہ

علامہ حموی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ کو عذاب دیں گے، اس پر کسی عورت نے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اس لئے اللہ ان کو عذاب نہیں دیں گے، اب سوچنے کی بات ہے کہ یہود ونصاریٰ کو قیامت کے دن عذاب ملنے کا عقیدہ رکھنا ایک مسلمان کے لئے ضروریاتِ دین سے شاید کم نہیں، ہر خاص وعام کو اس کا علم ہے، اب اس لئے اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس عورت کو فوراً کافر قرار دیتے۔

لیکن جب یہی مسئلہ امام محمد رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ یہ عورت کافر نہیں ہوئی، بس اتنی سی بات ہے کہ وہ جاہل ہے اس کو پوری بات سمجھاؤ، لوگوں کے سمجھانے پر وہ بات سمجھ گئی۔[۱]

امام محمد رحمہ اللہ کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دین اسلام

---

[۱] غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر،أحكام الناسي والجاهل والمكره، حقيقة الجهل وأقسامه،ج۳ص۳۰٤.

کے عام فہم اور ضروری مسائل وعقائد سے بھی انکار کرے لیکن اس کا انکار ضد وعناد پر مبنی نہ ہو تو اس کو حکمت و مصلحت اور اس کے فہم کے مطابق اصل دینی حکم سمجھا دینا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ سمجھائے بغیر تکفیر کرنے کی وجہ سے فطری کمزوری اپنا کام کرے اور وہ مزید اپنے "مؤقف" پر ہٹ دھرمی کے ساتھ برقرار رہے اور نفسانی جذبات سے مغلوب بیچارے انسان کے اندر ضد وتعصّب کی فضاء میں یہ تکفیر تیل پر جلتی کا کام کردے، موجودہ زمانہ میں چونکہ دینی شعور کا کوئی خاص اہتمام نہیں رہا، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ محض نادانی اور جہالت کی وجہ سے ایسے اُمور کا اقدام کیا جاتا ہے، اس لئے آج کل اس اُصول کا خاص طور پر لحاظ رکھ لینا ضروری ہے۔

دوسرا مانع: اکراہ

شرائط کے بیان میں ذکر ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان تب ہی مرتد ہوگا جب وہ کفریہ عمل اپنے ارادے اور اختیار سے کرے، کیونکہ ایمان اور کفر کا اصل دارومدار دِلی تصدیق یا تکذیب پر ہے، جن اقوال واعمال کو حضرات فقہاء کرام نے موجبات کفر قرار دیا ہے، وہ صرف اسی لئے کفر کے اسباب بنتے ہیں کہ وہ درحقیقت اسی قلبی تصدیق وتکذیب پر دلالت کرتے ہیں، جو اعمال پورے اختیار اور رضامندی سے صادر ہوتے ہیں ان ہی کو دل کا ترجمان کہا جا سکتا ہے، ڈنڈے کے سہارے مجبور کرنے کی ضرورت پیش وہی آتی ہے جہاں کسی کی مرضی کے خلاف کوئی کام کروایا جارہا ہو جو کام مرضی سے انجام دیا جارہا ہو اس میں اکراہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

امام کاسانی رحمہ اللہ کی ایک دلچسپ تفریع

امام کاسانی رحمہ اللہ نے اسی پر یہ مسئلہ متفرع فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص کو اسلام

لانے پر مجبور کیا گیا اور اسی جبر واکراہ کی وجہ سے اس نے اسلام قبول کیا، اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ مرتد ہوا تو اس کو اگرچہ اسلام لانے پر دوبارہ مجبور تو کیا جائے گا، تاہم عام مرتدین کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کو قتل بھی نہیں کیا جائے گا، کیونکہ جب اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول نہیں کیا تھا، بلکہ کسی کے جبر کرنے کی وجہ سے کلمہ اسلام کہا تو اس صورت میں زبان سے کلمہ اسلام کہنا حقیقی معنیٰ میں دل کا ترجمان نہیں، گویا اس اکراہ کی وجہ سے وہ مسلمان ہی نہیں ہوا، لہٰذا دوبارہ کفر اختیار کرنے وجہ سے اس پر ارتداد کے تمام احکام بھی جاری نہیں ہوں گے۔[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ اگر اکراہ کے نتیجہ میں کوئی کفریہ کام کیا جائے تو اس کی بنیاد پر اس عمل کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جائی گی، البتہ اس میں مندرجہ ذیل تین باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ اکراہ سے کیا مراد ہے؟

۲۔ کیا اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کہنا ضروری ہے؟ اگر کوئی شخص حالت اکراہ میں بھی کلمہ کفر منہ سے نہ نکالے تو کیا وہ گناہ گار ہوگا؟

۳۔ اکراہ کی حالت میں توریہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

---

[۱] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب الإكراه،النوع الثاني: المكره على الكفر، ج۷ص۱۷۸.

اکراہ سے مقصود

حضرات فقہاء کرام نے اکراہ کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں، اکراہ ملجی اوراکراہ غیر ملجی۔

یہاں جس اکراہ کی وجہ سے زبان سے کلمہ کفر کہنے کی اجازت دی گئی ہے ، اس سے مراداکراہ ملجی ہے، یعنی اس حدتک اکراہ کہ کلمہ کفرنہ کہنے کی وجہ سے جان یاعضو تلف ہونے کا قوی اندیشہ ہو، اگر معمولی قید وضرب کی دھمکی دی گئی ہو تووہ اکراہ غیر ملجی / اکراہ ناقص ہے، اس کی وجہ سے کلمہ کفر کہنایاکفریہ عمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ اگر معمولی اکراہ کے نتیجہ میں کوئی یقینی کفریہ قول یا عمل انجام دیاتو قضاءً وہ کافرہی شمار ہو گا۔

امام کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

هذا إذا كان الإكراه على الكفر تاما، فأما إذا كان ناقصا يحكم بكفره؛ لأنه ليس بمكره في الحقيقة؛ لأنه ما فعله للضرورة بل لدفع الغم عن نفسه، ولو قال: كان قلبي مطمئنا بالإيمان لا يصدق في الحكم؛ لأنه خلاف الظاهر كالطائع إذا أجرى الكلمة ثم قال: كان قلبي مطمئنا بالإيمان ويصدق فيما بينه وبين الله تعالیٰ[1].

"یہ تفصیل تب ہے کہ جب کفر پر اکراہ تام ہو یعنی پوری طرح کسی کو مجبور کیاجائے، اگر اکراہ ناقص ہے (اور اس سے بچنے کی خاطر کلمہ کفر کہا) تواس کے کفر کا حکم کیاجائے گا، کیونکہ حقیقت میں یہ مکرہ ہے ہی نہیں، اس نے کلمہ کفر ضرورت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنی پریشانی دور کرنے کے لئے کہا، اس کے بعد اگر وہ یہ بھی کہے کہ میرادل ایمان پر مطمئن تھاتو بھی قضاءً اس کی تصدیق نہیں

کی جائے گی، کیونکہ یہ ظاہر الفاظ کے خلاف ہے، یہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ کوئی اپنی مرضی سے کلمہ کفر کہے اور پھر یہ دعوی کرے کہ میرا دل ایمان پر مطمئن تھا، تاہم دیانۃً اس کی تصدیق کی جائے گی۔"[۱]

اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کہنا شرعاً ضروری نہیں

اکراہ کی حالت میں شریعت محمدیہ میں اگرچہ زبان کی حد تک کلمہ کفر کہنے کی گنجائش دی گئی ہے، لیکن یہ استثناء اجازت ہی کے درجہ میں ہے، کوئی فرض وواجب نہیں، اگر اکراہ کی حالت میں کسی نے کلمہ کفر نہیں کہا اور اس جرمِ وفا کی پاداش میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو شرعاً وہ ماخوذ نہیں ہوگا، کیونکہ کلمہ کفر کہہ کر جان بچانے کی اگرچہ رخصت اور اجازت تھی، لیکن ایسا کرنا کوئی ضروری نہ تھا جس کے چھوڑنے پر اس کا مؤاخذہ ہو۔

عزیمت کی راہ

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمار بن یاسر اور حضرت خباب بن الارت رحمہ اللہ دونوں کے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آیا، حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے زبان سے ایسا کلمہ کہدیا اور حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے اس رخصت پر عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

صحابہ کرام نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا یہ عمل رخصت پر محمول کیا اور حضرت خباب کی جرأت کو عزیمت پر حمل کیا، امام جصاص رازی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ اس کی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کے نزدیک سیدنا حضرت عمار رضی

[۱] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب الإكراه، حكم مايقع عليه الإكراه، ج۷ص۱۷۹.

اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت خباب افضل سمجھے جاتے تھے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

وقوله صلى الله عليه وسلم لعمار "إن عادوا فعد" إنما هو على وجه الإباحة لا على وجهة الإيجاب ولا على الندب وقال أصحابنا الأفضل أن لا يعطي التقية ولا يظهر الكفر حتى يقتل وإن كان غير ذلك مباحا له وذلك لأن خبيب بن عدي لما أراد أهل مكة أن يقتلوه لم يعطهم التقية حتى قتل فكان عند النبي صلى الله عليه وسلم وعند المسلمين أفضل من عمار في إعطائه التقية ولأن في ترك إعطاء التقية إعزازا للدين وغيظا للمشركين فهو بمنزلة من قاتل العدو حتى قتل فحظ الإكراه في هذا الموضع إسقاط المأثم عن قائل هذا القول حتى يكون بمنزلة من لم يقل.

"حضور ﷺ کا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو ان جیسے حالات میں دوبارہ کلمہ کفر کہنے کی اجازت دینا اباحت (رخصت) پر مبنی ہے، کوئی واجب و مستحب نہیں، فقہاء احناف فرماتے ہیں کہ اکراہ کی حالت میں بہتر یہ ہے کہ تقیہ سے کام لے کر کفر کا اظہار نہ کرے، بلکہ صبر کرے یہاں تک کہ قتل ہو جائے، کیونکہ جب اہل مکہ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو مجبور کیا تو اُنہوں نے تقیہ سے کام نہیں لیا، یہاں تک کہ ان کو شہید کیا گیا، تو اس صبر کی وجہ سے حضرت خبیب حضور ﷺ اور مسلمانوں کے نزدیک حضرت عمار سے بہتر سمجھے جاتے تھے کہ جنہوں نے تقیہ سے کام لیا تھا، اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس حالت میں بھی تقیہ چھوڑنے میں دین کی عزت اور کفار کے غیظ وغضب کا سامان موجود ہے، گویا یہ ایسا ہی ہے کہ وہ باقاعدہ لڑ رہا ہے اور لڑتے لڑتے شہید ہوا ہو، لہٰذا ا

یسی صورت میں اکراہ کی وجہ سے صرف اس کہنے کا گناہ ختم ہو گا گویا کہ اس نے یہ کلمہ کفر استعمال ہی نہیں کیا۔"[۱]

بلکہ سورۃ آل عمران کی تفسیر میں آپ نے ایک مرفوع روایت بھی نقل فرمائی ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابہ کرام کو گرفتار کیا اور دونوں سے اپنی رسالت کا اقرار کروانا چاہا، ان میں سے ایک نے زبانی کلامی طور پر "ہاں" کیا جس پر اس کی جان بخشی ہوئی اور دوسرے نے آپ کو نبی کہنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں بہرا ہوں، مسیلمہ کے تین بار تلقین کرانے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اس کو شہید کیا گیا۔

حضور ﷺ کا فیصلہ

حضور ﷺ کو جب اس سانحہ کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أما هذا المقتول فمضى على صدقه ويقينه وأخذ بفضيلة فهنيئا له وأما الآخر فقبل رخصة الله فلا تبعة عليه.

"یہ مقتول تو اپنے صدق ویقین پر چل بسا اور بزرگی حاصل کی، جو اُس کو مبارک ہو، اور دوسرے نے اللہ تعالیٰ کی رخصت کو قبول کیا تو اس پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں ہے"[۲]

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد آپ نے بڑی بسط وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ایسی صورت میں عزیمت کی راہ اختیار کرنا ہی بہتر ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس رخصت پر عمل کرنا بھی کوئی ناجائز یا بُرا نہیں۔

---

[۱] أحكام القرآن للجصاص، سورة النحل، رقم الآية: ۱۰٦، ج۳ص۲٤۹.

[۲] أحكام القرآن للجصاص، تفسير سورة آل عمران، رقم الآية: ۳۳، ج۲ص ۲۹۰.

فقہاء شافعیہ کی طرف سے ایک مناسب تطبیق

شوافع میں سے بعض فقہاء کرام نے اس میں ایک اور مناسب تطبیق کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو مجبور کیا جارہا ہے اس کی حالت کو دیکھ لینا چاہئے:

۱۔ اگر مستقبل میں اس سے دینی خدمات کی توقع ہو مثلاً کفر اور کفار کو نقصان پہنچانا، اسلام کی کوئی بڑی خدمت کرنا تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ زبان سے یہ کلمہ کہہ گزرے۔ اور اس میں بھی حتی الامکان مناسب یہ ہے کہ اگر توریہ وغیرہ کی کسی صورت اختیار کرنے سے جان بچائی جاسکے تو وہی اختیار کرے جس کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی۔

۲۔ اور اگر مجبور شخص کا یہ حال نہ ہو تو مجبور کرنے والے افراد کے غیظ وغضب کے لئے کلمہ کفر سے باز آجانا چاہے۔

یہ اگرچہ تمام شوافع کا مؤقف نہیں نہ ہی حنفیہ نے اس تفصیل کو بطور مذہب نقل فرمایا ہے لیکن قواعد کے لحاظ کافی حد تک مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شوافع کی مشہور کتاب "المجموع" میں ہے:

من أكره على كلمة الكفر فالافضل ألا يأتي بها. ومن أصحابنا من قال (إن كان ممن يرجوا النكاية في أمر العدو والقيام في أمر الشرع فالأفضل أن يدفع القتل عن نفسه ويتلفظ بها، وإن كان لا يرجو ذلك اختار القتل.

"جس کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ وہ نہ کہے، البتہ ہمارے بعض ائمہ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ شخص ایسا ہو جو دشمن کو نقصان پہنچا سکے اور شرعی احکام پر استقامت بر قرار رکھ سکے تو اس کے لئے قتل سے بچنا اور اس پر

تلفظ کرنا بہتر ہے اور اگر ایسی کوئی اُمید نہ ہو تو قتل ہونے کو ترجیح دے۔"[۱]

امکانی حد تک زوایہ فکر کی تبدیلی

اکراہ کی صورت میں کلمہ کفر کہنے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر اس میں بھی حتی الامکان کوئی ایسا توریہ / تدبیر اختیار کرلینا چاہئے کہ جس کی وجہ سے صریح کفر سے بچا جاسکے، مثلاً اگر کسی کو خدانخواستہ حضور سرورکائنات ﷺ کو گالی دینے پر مجبور کیا جائے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کی زندگی یا عضو تلف ہوجانے کا قوی اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ برا بھلا کہتے وقت لفظ محمد سے حضور ﷺ کے علاوہ کسی اور محمد کا ارادہ کیا جائے، اور خیال یہ کرے کہ میں فلاں شخص کے بارے میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں جس کا نام اتفاقاً محمد ہو، حضور ﷺ کے بارے میں نہیں کہہ رہا۔

اسی طرح اگر کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ انشاء کی بجائے اقرار کے پہلو کو مد نظر رکھ کر جان بچائے مثلاً ایک شخص نے دوسرے پر اکراہ کیا کہ وہ اپنی طرف کفر کی نسبت کرے ورنہ اس کی جان لے لے گا اور وہ عرب ہے تو بہتر یہ ہے کہ "کفرت" کہتے وقت ابھی فی الحال کافر ہونا یا کفر کرنا مراد نہ لے بلکہ ماضی کے دریچوں میں جھانک کر جھوٹا اقرار کرے۔

اس طرح کرنے میں صرف زاویہ فکر کی تبدیلی کی ضرورت ہے، اکراہ کرنے والوں کے ظلم سے بھی نجات حاصل ہوجائے گی اور حضور ﷺ کے دربار عالیہ میں سب وشتم جیسی لعنت سے بھی بچنے کی صورت ہاتھ آجاتی ہے۔

---

[۱] المجموع شرح المهذب، باب قتل المرتد، ج۱۹ ص ۲۲٤.

حضرات فقہاءِ کرام کے نزدیک توریہ کی اہمیت

فقہاء کرام کے ہاں اس توریہ کی بڑی اہمیت ہے، یہاں تک کہ امام جصاص رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اگر سب و شتم کرتے وقت یہ تدبیر خیال میں آئی لیکن پھر بھی اس پر عمل نہیں کیا اور لفظ "محمد" سے آپ ﷺ ہی مراد لے کر برا بھلا کہا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

ويعارض بها غيره إذا خطر ذلك بباله فإن لم يفعل ذلك مع خطوره بباله كان كافرا قال محمد بن الحسن إذا أكرهه الكفار على أن يشتم محمدا صلى الله عليه وسلم فخطر بباله أن يشتم محمدا آخر غيره فلم يفعل وقد شتم النبي صلى الله عليه وسلم كان كافرا وكذلك لو قيل له لتسجدن لهذا الصليب فخطر بباله أن يجعل السجود لله فلم يفعل وسجد للصليب كان كافرا فإن أعجلوه عن الروية ولم يخطر بباله شيء وقال ما أكره عليه أو فعل لم يكن كافرا إذا كان قلبه مطمئنا بالإيمان قال أبو بكر وذلك لأنه إذا خطر بباله ما ذكرنا فقد أمكنه أن يفعل الشتيمة لغير النبي صلى الله عليه وسلم إذ لم يكن مكرها على الضمير وإنما كان مكرها على القول وقد أمكنه صرف الضمير إلى غيره فمتى لم يفعله فقد اختار إظهار الكفر من غير إكراه فلزمه حكم الكفر.

"جب دل میں اس (محمد) نام کا کوئی شخص آئے تو حتی الامکان اسی کو مراد لے کر (نازیبا) بات کی جائے اگر دل میں آنے کے باوجود ایسا نہیں کیا بلکہ خود

حضور ﷺ کو مراد لے کر نازیبا بات کی تو کافر ہو جائے گا، امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب کفار کسی مسلمان کو حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے پر مجبور کریں اوراس کے دل میں کوئی اور ہم نام آئے اس کے باوجود خاص حضور ﷺ ہی کو مراد لے تو وہ کافر ہے۔۔امام جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب دوسرا ہم نام ذہن میں آیا تو حضور ﷺ کے علاوہ کسی کی طرف اس بات کو پھیرنا ممکن تھا، کیونکہ اس کو تو صرف اس بات کے کہنے پر مجبور کیا گیا تھا، حضور ﷺ کی طرف ضمیر لوٹانے یعنی حضور ﷺ مراد لینے پر مجبور نہیں کیا گیا، تو اسکے باوجود حضور ﷺ مراد لینے سے معلوم ہوا کہ اس نے مجبوری کے بغیر ہی کفر کو ترجیح دی اس لئے اس پر کفر کے احکام جاری ہوں گے۔"[۱]

اس عبارت سے واضح ہوا کہ جب اصل کفر سے بچنے کی کوئی تدبیر ذہن میں آئی اوراس پر عمل کرنے کی صورت میں جان بخشی بھی ممکن ہے تو اسی تدبیر پر چلنا ضروری ہے، اس کو چھوڑ کر اصل کفریہ فعل کرنا موجب کفر ہے، کیونکہ کفریہ عمل کی اجازت یقیناً موجب کفر تھی، اکراہ کی وجہ سے صرف ظاہری طورپر اس کی اجازت دی گئی مگر جب بچنے کی راہ میسر ہے تو خواہ مخواہ اسی کفریہ راستے کا انتخاب رضامندی اوراختیار کی دلیل ہے، جو کہ بے شک کفر ہے۔

---

[۱] أحكام القرآن للجصاص ،سورة النحل، رقم الأية:۱۰٦، ج۳ص۲۸۳.

تیسرا مانع: تاویل

تکفیر کے باب میں ایک بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ تاویل کا ہے جس کو کماحقہ سمجھنے کے بغیر تکفیر کا مسئلہ سمجھنا نہایت مشکل ہے۔

لغوی تحقیق

تاویل باب تفعیل کا مصدر ہے، اس کا مادہ "اوّل" ہے جس کا معنیٰ ہے رجوع یعنی واپس ہونا اور لوٹنا، مختلف علوم وفنون میں یہ لفظ مختلف مفاہیم کے لئے استعمال ہوتا ہے، علم تفسیر، اُصول فقہ اور رمل وغیرہ سبھی کے ضمن میں یہ لفظ ایک الگ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس کی مختصر سی وضاحت علامہ محمد تھانوی رحمہ اللہ نے "کشاف اصطلاحات الفنون" میں ذکر فرمائی ہے۔[۱]

متکلمین کی اصطلاح

متکلمین کی اصطلاح میں "قرآن و سنت کے نصوص کو اپنے متبادر معانی سے پھیر کر دیگر ممکنہ معانی پر حمل کرنے" کو تاویل کہا جاتا ہے۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ یہ دوسرا ممکنہ معنیٰ بھی قرآن وسنت کے نصوص سے متصادم نہ ہو بلکہ دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ لفظ کو اپنے ظاہری معنیٰ سے ہٹا کر دوسرے معنیٰ پر حمل کرنے کی کوئی معتبر دلیل موجود نہ ہو۔

---

[۱] کشاف اصطلاحات الفنون، حرف التاء، تحت لفظ "التفسیر" ج۱ ص۴۹۲.

علامہ سیف الدین الآمدی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أما التأويل من حيث هو تأويل مع قطع النظر عن الصحة والبطلان، هو حمل اللفظ على غير مدلوله الظاهر منه، مع احتماله له.

" تاویل اس کو کہا جاتا ہے کہ لفظ کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹا کر کسی ایسے معنیٰ پر حمل کیا جائے جس کا یہ لفظ احتمال بھی رکھتا ہو۔"[۱]

یہ تو مطلق تاویل کی تعریف تھی، لیکن جیسا کہ اُوپر تحریر کیا گیا، تاویل کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ تاویل ہے جس کی شریعت کی طرف سے اجازت ہے اور دوسری تاویل وہ ہے جو ناجائز ہے، اگر کسی نص سے دوسرا کوئی ایسا معنیٰ مراد لیا جائے جو کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو اور خود نص میں بھی اس کا احتمال ہو تو تاویل کی یہ قسم جائز ہے اور اگر ایسا معنیٰ مراد لینے کا دعویٰ کیا جائے جو نہ قرآن وسنت سے میل کھاتا ہو نہ ہی کلام عرب میں اس کا احتمال ہو تو یہ تاویل مردود ہے۔

علامہ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ جائز تاویل کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وفي الشرع: صرف اللفظ عن معناه الظاهر إلى معنى يحتمله، إذا كان المحتمل الذي يراه موافقًا للكتاب والسنة،

---

[۱] الإحكام في أصول الأحكام للآمدي، النوع الثانى، الصنف التاسع، مقدمة،ج۳ ص۵۳.

"شریعت کی اصطلاح میں تاویل یہ ہے کہ لفظ کو اس کے ظاہری مفہوم سے پھیر کر کوئی اور معنیٰ مراد لیا جائے جس کا یہ لفظ احتمال بھی رکھتا ہو، بشرطیکہ یہ دوسرا معنیٰ محتمل قرآن و سنت کے مطابق ہو۔"[۱]

علامہ آمدی رحمہ اللہ بھی لکھتے ہیں:

والحق في ذلك أن يقال: وأما التأويل المقبول الصحيح فهو حمل اللفظ على غير مدلوله الظاهر منه مع احتماله له بدليل يعضده.

"حق بات یہ ہے کہ صحیح اور مقبول تاویل اس کو کہا جاتا ہے کہ لفظ کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹا کر کسی ایسے معنیٰ پر حمل کیا جائے جس کا یہ لفظ احتمال بھی رکھتا ہو، اور اس کی تائید میں کوئی دلیل بھی موجود ہو۔"[۲]

فوائد قیود

اس تعریف میں کل تین ضروری قیود لگائی گئی ہیں:

۱۔ پہلی قید یہ لگائی گئی کہ "لفظ کے اپنے ظاہری مفہوم سے ہٹا کر کوئی اور مفہوم مراد لینا" لہٰذا اگر کسی لفظ کے دو معانی ہوں اور دونوں مفہوم پر اس لفظ کا اطلاق بھی ہوتا ہو تو ان میں سے کوئی ایک معنیٰ مراد لینا تاویل نہیں کہلائے گا۔

۲۔ "مع احتماله له" یعنی لفظ سے جو مفہوم مراد لیا جا رہا ہو، ضروری ہے کہ لفظ میں اس مفہوم کا احتمال بھی موجود ہو، یعنی لغت عرب کے حوالے سے یہ دوسرا غیر متبادر

[۱] التعریفات، باب التاء، ص: ۵۰.

[۲] المصدر السابق.

معنیٰ مراد لینا ممکن ہو، لہٰذا اگر کوئی ایسا خود ساختہ معنیٰ مراد لیا جائے جس کی تائید کلام عرب سے نہ ہوتی ہو تو وہ تاویل نہیں بلکہ تحریف کہلائے گی۔

۳۔ "بدلیل یعضدہ" یعنی متبادر معنیٰ چھوڑ کر دوسرا معنیٰ مراد لینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسی دلیل موجود ہو جس سے اس احتمالی معنیٰ کی تائید ہوتی ہو، اگر اس قسم کی کوئی دلیل موجود نہ ہو تو محض احتمال برائے احتمال کی وجہ سے متبادر معنیٰ چھوڑنا درست نہیں ہوگا، اور یہ تاویل جائز نہیں بلکہ تاویل فاسد کہلائے گی۔

تاویل کے جائز یا ناجائز ہونے کی اُصولی بحث

قرآن وسنت انسانیت کی ہدایت اور اس کی درست رہنمائی کے لئے ہیں، دونوں کی زبان فصیح عربی ہے خود قرآن کریم میں بار بار اس بات کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ یہ آسان عربی زبان میں نازل کی گئی ہے، چونکہ خیر کے ان دونوں سرچشموں کے اوّل اور براہ راست مخاطب عرب تھے اس لئے ان ہی کی زبان میں ان کو ہدایات دی گئی ہیں۔

نصوص کے الفاظ اور اسلوب دونوں چیزیں عرب کے فہم اور ان کی زبان کے مطابق تھے تاکہ وہ اس سے ہدایت حاصل کریں، اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب الفاظ سے عام متبادر معانی ہی مراد ہوں، کیونکہ غیر متبادر معانی ان کو معلوم نہ تھے نہ ہی اس کے لئے قاعدہ و قانون مقرر ہے دریں ایک ہی لفظ سے ہر شخص اپنی پسند کے مطابق معنیٰ مراد لے سکتا ہے جس کے بعد منشاء خداوندی بالکل مجہول رہ جائے گی، لہٰذا اس قسم معانی مراد لینے میں تکلیف بالمحال لازم آجاتی ہے کہ مثلاً "أقیموا الصلاۃ" کے ذریعے "صلوۃ" کو فرض کیا گیا، لیکن اس سے مراد کیا ہے؟ اس کی اقامت کا طریقہ کار کیا ہے؟ یہ بالکل نہیں بتایا گیا اور نہ ہی مخاطب کو پہلے سے معلوم ہو تو۔ یہ تکلیف بما لایطاق ہوگی جس سے

شریعتِ اسلام بالکل پاک وصاف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح اعلان فرمایا ہے کہ:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ [۱]

"اور ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا تاکہ ان سے (احکام الٰہیہ کو) بیان کریں۔"

ہر رسول کو اپنی قوم کی زبان میں بھیجنے کا فائدہ یہی ہے جو اس آیت میں ذکر کیا گیا کہ جب داعی اور مدعو کی زبان ایک ہو تو دعوت دینے میں آسانی رہے گی اور قوم کے پاس یہ عذر نہیں ہو گا کہ ہم احکام خداوندی کو سمجھ نہیں سکے، کیونکہ تمام رسول اپنی قوم ہی کی بولی میں دعوت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اسی زبان میں ان لوگوں کو بتلاتے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قوم کے اسلوب وزبان ہی میں گفتگو فرماتے ہیں۔

نقل خلافِ اصل دلیل سے ہو

اسی لئے تمام متکلمین نے باہمی اتفاق سے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ نقل خلافِ قاعدہ اصل ہے، اس کا حاصل بھی وہی ہے جو ابھی تحریر کیا گیا کہ کسی لفظ سے وہی معنیٰ مراد لیا جائے گا جو عرب کے ہاں متوارث چلا آرہا ہو، کسی معتبر دلیل کے بغیر لفظ کو اپنے معنیٰ سے ہٹا کر دوسرے معنیٰ کا دعویٰ کرنا ضابطہ کے خلاف ہے۔

---

[۱] إبراهيم ٤

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لأن النقل خلاف الأصل لا يصار إليه إلا بدليل[۱]

امام غزالی رحمہ اللہ نے معقولی انداز میں لکھا کہ:

إنك إذا فتحت هذا الباب، وهو أن تريد باللفظ غير ما وضع اللفظ له ويدل عليه في التفاهم لم يكن لما تريد به حصر-

"جب آپ ایک بار اس دروازے کو کھولدیں گے یعنی لفظ سے اپنے اصل معنیٰ اور عرفی مفہوم کے علاوہ مفہوم مراد لیں گے، تو ایک مرتبہ اس دروازے کو کھولنے کے بعد کوئی حصر ہی نہیں رہے گا (اور تمام نصوص میں یہ ترمیم جاری ہو جائے گی (جس سے دین بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا)۔"[۲]

تاویل کے جائز ہونے کی شرائط

تاویل کے جائز ہونے کے لئے بنیادی طور پر تین شرائط ہیں:

پہلی شرط: لغوی معنیٰ کا متعذر ہونا

اُصول یہ ہے کہ قرآن وسنت کے تمام نصوص سے اپنا متبادر معنیٰ ہی مراد لیا جائے گا، مگر جہاں کہیں ظاہری معنیٰ مراد نہ لیا جاسکے وہاں مناسب تاویل کی جائے گی مثلاً آیت کریمہ میں ہے "كل شيء هالك إلا وجهه"

---

[۱] شرح المقاصد في علم الكلام، ج۳ص ٤٢٦.

[۲] الاقتصاد في الاعتقاد، القطب الأول، الدعوى السابعة، ص: ٣٤.

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف "وجہ" کی نسبت کی گئی اور ظاہر ہے کہ "وجہ" جسم ہی کی ہو سکتی ہے تو گویا وجہ کو ثابت کرنا جسم ہونے کو مستلزم ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جسمیت منسوب کرنا عقلاً اور شرعاً نا قابل تسلیم ہے کیونکہ جسم کے لئے مختلف اشیاء کا محتاج رہنا ضروری ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے یقیناً پاک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس لفظ کا متبادر معنٰی چہرہ ہی ہے مگر یہ ظاہری معنٰی یہاں مراد لینا عقلاً مشکل ہے، بلکہ بعض نصوص مثلاً "ليس كمثله شيء" بھی اس تصور کی نفی کر رہی ہیں، اب ایک طرف تو یہ مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمیت سے قطعاً و یقیناً پاک ہے اور دوسری طرف آیت کریمہ کا متبادر معنٰی ہے جو بظاہر اس قطعی قاعدہ کے خلاف ہے، اس ظاہری معنٰی کو مراد لینے کی صورت میں اس یقینی قاعدہ کی مخالفت کرنی پڑتی ہے اور قاعدہ کے لحاظ کرنے میں متبادر معنٰی چھوٹ جاتا ہے۔

تطبیق کی آسان اور اہون صورت یہی ہے کہ تاویل کا سہارا لیا جائے یعنی یہ قرار دیا جائے کہ اگرچہ "وجہ" کا لغوی معنٰی چہرہ ہی ہے، اہل زبان نے اس کو اسی معنٰی کے لئے استعمال کیا، لیکن یہاں اس سے یہ معنٰی مقصود نہیں بلکہ اس کے علاوہ دوسرا مناسب معنٰی مراد ہے جو ذاتِ الٰہی کے شایانِ شان ہے مثلاً امکان کی حد تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں اس سے مراد قدرتِ خداوندی ہے، یہی تاویل ہے۔

تاویل ہی کا سہارا لینے کی وجہ

تطبیق کی بظاہر یہ صورت بھی ممکن ہے کہ تاویل کو اختیار کرنے کی بجائے اوضاع کے اختلاف کا سہارا لیا جائے یعنی یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں "وجہ" ایک خاص معنٰی کے لئے وضع کیا گیا، لہٰذا اگرچہ متبادر معنٰی اس لفظ کا چہرہ ہی ہے لیکن قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ استعمال ہوگا وہاں اس سے وہی خاص معنٰی ہی مقصود ہوگا جس کے

لئے قرآن کریم نے یہ اصطلاح مقرر کی۔

لیکن ظاہر ہے کہ اوضاع کے اختلاف کا سہارا لینے سے تاویل کو اختیار کرنا اسلم ہے، کیونکہ الفاظ سے عام متبادر معانی لینا ایک ایسا اتفاقی امر ہے جس پر مزید دلیل کی ضرورت نہیں، اگر ایک بار بھی یہ دروازہ کھلے تو دین کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، تاریخ کے اوراق میں باطنیہ کے الحاد کی ایک بڑی بنیاد یہ بھی تھی، اس لئے بلا دلیل نئی اصطلاح کا دعوی کرنا درست نہیں۔

علامہ کفوی کی وضاحت

علامہ ابو البقاء الکفوی (۱۰۹۴ھ) رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وتأويل الظواهر أولى من مخالفة الأوضاع اللغوية لوجهين: الأول: أن تأويل الظواهر متفق عليه بخلاف مخالفة الأوضاع، ومخالفة ما اتفق على جواز مخالفته أولى من مخالفة ما لم يتفق على مخالفته. والثاني: أن مخالفة الظواهر في الشرع أكثر من مخالفة الأوضاع اللغوية عند القائلين بمخالفة الأوضاع، وإن أكثر الظواهر مخالفة، وأكثر الأوضاع مقررة، وذلك يدل على أن المحذور في مخالفة الأوضاع أعظم منه في مخالفة الظواهر فكان مخالفة الظواهر أولىٰ.

" لغوی اوضاع کی مخالفت سے الفاظ کے ظاہر میں تاویل کرنا ہی بہتر ہے، اس کی دو وجہیں ہیں: ۱۔ تاویل کا جائز ہونا ایک اتفاقی امر ہے جبکہ اوضاع کی مخالفت متفق نہیں، اور ظاہر ہے کہ اتفاقی طور پر جائز مخالفت کو اختیار کرنا اس مخالفت سے بہتر ہے جس کے جواز میں اختلاف ہو۔ ۲: جن کے نزدیک اوضاع کی

مخالفت جائز بھی ہے ان کے نزدیک بھی شرعی نصوص میں تاویل کا تحقق زیادہ ہے، بیشتر ظاہری نصوص میں مخالف ہوتی ہیں جبکہ لغوی اوضاع مسلم رہتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تاویل کے مقابلے میں اوضاع کے خلاف دعویٰ کرنا زیادہ برا ہے اس لئے نصوص کے ظاہر میں تاویل ہی بہتر ہے۔"[۱]

ضرورت کے بغیر نصوص میں تاویل

اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ عام حالات میں نصوص سے اس کے متبادر معانی ہی مراد ہوں گے، بلاضرورت ان معانی کو چھوڑ کر دوسرے مفاہیم کو مراد لینا اور اس کے لئے تاویل کا سہارا لینا درست نہیں۔

چنانچہ شرح العقائد میں علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

(والنصوص) من الكتاب والسنة تحمل (على ظواهرها) ما لم يصرف عنها دليل قطعي --(فالعدول عنها) أي عن الظواهر (إلى معان يدعيها أهل الباطن) -(إلحاد) أي ميل وعدول عن الإسلام واتصال واتصاف بكفر، لكونه تكذيباً للنبي عليه السلام فيما علم مجيئه به بالضرورة.

"قرآن وسنت کے نصوص ظاہر ہی پر محمول رہیں گی جبکہ کوئی قطعی دلیل اس کے خلاف موجود نہ ہو، لہٰذا ظاہر کو چھوڑ کر اہل باطن جیسے معانی مراد لینا الحاد اور گمراہی ہے، یہ اسلام سے اعراض اور کفر کو اختیار کرنا ہے کیونکہ یہ درحقیقت

---

[۱] الكليات، باب التاء، ص ۲٦۲.

ضروریاتِ دین میں حضور ﷺ کی تکذیب ہے۔"[۱]

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کسی بھی دلیل کے بغیر بلاوجہ نصوص میں تاویل کرنا اوران کے ظاہری معنیٰ سے اعراض کرنا درحقیقت اس نص کے تکذیب کے مترادف ہے، کیونکہ جب یہ قاعدہ مسلم ہے کہ نصوص سے عام متبادر معنیٰ ہی مراد لیا جائے گا، تواس ضابطہ کے ہوتے ہوئے اسی متبادر معنیٰ کو مراد نہ لینا تکذیب ہے۔

کن حالات میں نصوص کے اندر تاویل کی جاسکتی ہے؟

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے بغیر نصوص میں تاویل درست نہیں، ضرورت کے وقت ہی نصوص میں "تاویل" کی جائے گی۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس ضرورت سے کیا مراد ہے؟ کن وجوہات کی بنیاد پر الفاظ کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر دوسرے معانی مراد لئے جاسکتے ہیں؟ تاویل کی ضرورت کب پڑتی ہے؟

متکلمین کی ذکر کردہ تفصیلات کا خلاصہ

تواس کے متعلق متکلمین کی ذکر کردہ تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی یقینی دلیل لفظ کے ظاہری معنیٰ مراد لینے سے مانع ہو تب ہی تاویل کی ضرورت پڑے گی، یقینی دلیل کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ عقلی دلیل جو قطعی ہو، جیسا کہ مندرجہ بالا مثال میں ہے کہ بعض نصوص میں

---

[۱] شرح العقائد النسفية، ص٩٦.

اللہ تعالیٰ کے لئے جسم کے مختلف صفات بظاہر وارد ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا اس سے منزہ ہونا عقلاً ضروری ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لئے احتیاج لازم آجائے گی جو کہ موجب نقص ہے، اس عقلی دلیل کی وجہ سے نصوص کے متبادر معانی کو چھوڑ کر دوسرے معانی کو مراد لیا گیا۔

واضح رہے کہ اسماء وصفات کے نصوص میں تاویل کرنے کی بنیاد صرف عقل ہی نہیں بلکہ بہت سی نصوص بھی اس باب میں موجود ہیں، مثلاً "ليس كمثله شيء"۔

۲۔ قطعی نص: یعنی اگر کسی نص کے ظاہری الفاظ کا مفہوم دوسری نصوص کے خلاف ہو، اور وہ دوسری نصوص اس خاص نص کے مقابلے میں قطعی بھی ہوں، تو اس وقت نصوص کے اس ظاہری تضاد کو ختم کرنے کے لئے تاویل کا سہارا لیا جائے گا۔

۳۔ یقینی اجماع: جمہور کے نزدیک اجماع بھی ایک قطعی دلیل ہے، لہٰذا اگر کسی نص کے ظاہری الفاظ کسی یقینی اور قطعی اجماع کے خلاف وارد ہوں تو دونوں دلائل میں تطبیق دینے کے لئے تاویل کریں گے۔

علامہ فرہاروی رحمہ اللہ کی مختصر اور جامع عبارت

علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ "شرح العقائد" کی مندرجہ بالا عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قوله"تحمل علي ظواهرها" أي علي المعاني الظاهرة بحسب الوضع اللغوي الشائع المشهور في أهل الإسلام، قوله:"ما لم يصرف عنها دليل قطعي"من برهان عقلي أو إجماع او نص قاطع.

حاصل ترجمہ: "ظاہر سے وہ عام لغوی معنیٰ مراد ہے جو مسلمانوں کے درمیان

مشہور ہو، اور دلیل قطعی سے کوئی عقلی دلیل، اجماع یا قطعی نص ہے"[۱]

بحث کا حاصل

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جہاں دلائل میں تعارض ہو، لفظ کا متبادر معنیٰ مراد لینا بھی عام اُصول و قواعد کا تقاضا ہے لیکن کوئی دلیل ایسی بھی موجود ہو جو اس راہ میں حائل ہو، ان دونوں دلائل میں تعارض کے وقت دیکھا جائے گا کہ اگر عام مفہوم مراد لینے کے مقابلے میں دوسرے دلائل قوی اور غالب ہوں تو تاویل کی جائے گی اور الفاظ کے ظاہری معنیٰ کو ترک کیا جائے گا، ورنہ اگر وہ دلیل اس درجہ مضبوط نہ ہو تو زبان و بیان کے عام اُصول کے مطابق اس سے متبادر معنیٰ ہی مقصود لیا جائے گا، بلا ضرورت تاویل کا سہارا لینا درست نہیں۔

علامہ آمدی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وأن يكون الدليل الصارف للفظ عن مدلوله الظاهر راجحا على ظهور اللفظ في مدلوله ليتحقق صرفه عنه إلى غيره، وإلا فبتقدير أن يكون مرجوحا لا يكون صارفا ولا معمولا به اتفاقا، وإن كان مساويا لظهور اللفظ في الدلالة من غير ترجيح، فغايته إيجاب التردد بين الاحتمالين على السوية، ولا يكون ذلك تأويلا غير أنه يكتفى بذلك من المعترض إذا كان قصده إيقاف دلالة المستدل، ولا يكتفى به من المستدل دون ظهوره، وعلى حسب قوة الظهور وضعفه وتوسطه يجب أن يكون التأويل.

---

[۱] النبراس ص ۳۳۷-

"تاویل کے درست ہونے کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ تاویل کی متقاضی دلیل اس دلیل سے راجح ہو جو ظاہری معنیٰ مراد لینے کا تقاضا کرتی ہے تاکہ ظاہری معنیٰ کو چھوڑنا درست ہو، ورنہ تو تاویل نہیں کی جائے گی، اگر دونوں دلائل قوت میں برابر بھی ہوں تو بھی زیادہ سے زیادہ یہی کیا جائے گا کہ دونوں احتمال لئے جاسکتے ہیں اور یہ کوئی تاویل نہیں ہے۔۔۔"[۱]

دوسری شرط: مؤول کی اہلیت

تاویل کے جائز ہونے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ خود تاویل کرنے والا اس کا اہل بھی ہو، "متبادر معنیٰ مراد لینے" کے عام اُصول سے وہی شخص اعراض کا حق رکھتا ہے جس میں اس کی اہلیت بھی موجود ہو، ہر شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ نصوص کے اندر تاویلات کرتا پھرے، ورنہ نصوص بازیچہ اطفال بن جائیں گے۔

علامہ سیف الدین آمدی رحمہ اللہ تاویل کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وشروطه: أن يكون الناظر المتأول أهلا لذلك.

ا۔ "ایک شرط یہ ہے کہ نصوص کو دیکھنے والا اور تاویل کرنے والا اس کام کا اہل بھی ہو۔"[۲]

[۱] الإحكام في أصول الأحكام للآمدي ،الصنف التاسع في الظاهر وتأويله، مقدمة في تحقيق معنى الظاهر والتأويل، ج۳ص٥٤.
[۲] نفس المصدر.

تیسری شرط: الفاظ میں تاویل کا احتمال موجود ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ لفظ میں بھی اس معنیٰ کا احتمال موجود ہو جو تاویل کے ذریعے مراد لیا جا رہا ہو، زمین بول کر آسمان مراد لینا کسی عقل مند کا کام نہیں۔ علامہ آمدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> وأن يكون اللفظ قابلا للتأويل بأن يكون اللفظ ظاهرا فيما صرف عنه محتملا لما صرف إليه.
>
> "(دوسری شرط یہ ہے کہ) لفظ بھی تاویل کے قابل ہو کہ اپنے معنیٰ میں ظاہر ہو اور تاویلی معنیٰ کا بھی احتمال رکھتا ہو۔"[۱]

تکفیر کے باب میں تاویل کی اہمیت

تکفیر کے باب میں تاویل کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگر کوئی شخص اسلام کے کسی ثابت شدہ قطعی حکم کا انکار کرے تو اس سے وہ کافر ہو جاتا ہے لیکن اگر تاویل کرے تو اس کی تکفیر نہیں کی جاسکتی، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے دور سے لے کر عصر حاضر تک مختلف فتنوں نے جنم لیا، ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام کے بعض مشہور مسائل میں "تاویل" کر کے اُمت کے سوادِ اعظم کے مخالف مؤقف اپنایا، بلکہ بسا اوقات نصوص کی بھی مخالفت کی فضا پیدا ہوگئی، لیکن اُمت نے ان کو کافر نہیں قرار دیا، کیونکہ وہ لوگ صراحتاً انکار نہیں کرتے تھے بلکہ تاویل کرتے تھے۔

---

[۱] نفس المصدر.

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ خوارج کے کرتوت ذکر کرنے کے بعد اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرات فقہاء کرام نے ان تمام تر گمراہیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان کو کافر کیوں قرار نہیں دیا، آپ لکھتے ہیں:

قد عرف من مذهب الخوارج تكفير كثير من الصحابة، ومن بعدهم، واستحلال دمائهم، وأموالهم، واعتقادهم التقرب بقتلهم إلى ربهم، ومع هذا لم يحكم الفقهاء بكفرهم؛ لتأويلهم. وكذلك يخرج في كل محرم استحل بتأويل مثل هذا.

"خوارج کا مؤقف مشہور ہے کہ وہ صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے تابعین کو کافر قرار دیتے تھے، ان کے مال وجان کو مباح سمجھتے تھے بلکہ ان کے قتل کرنے کو موجبِ ثواب یقین کرتے تھے، لیکن ان سب کچھ کے باوجود فقہاء کرام نے ان کے کافر ہونے کا فیصلہ نہیں کیا، کیونکہ (وہ لوگ یہ سب کچھ ایک) تاویل کے تحت کرتے تھے، یہی حکم ہر اس حرام کام کا ہے جس کو اس جیسی تاویل کے ساتھ جائز سمجھا جائے۔"[۱]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اہل علم کہتے ہیں کہ ہر تاویل کرنے والا اپنی تاویل کرنے میں معذور ہے، گناہگار نہیں ہے بشرطیکہ کلام عرب میں اس تاویل کی گنجائش ہو اور اس کی کوئی علمی بنیاد بھی موجود ہو۔"[۲]

[۱] المغني لابن قدامة، كتاب المرتد، فصل اعتقد حل شيء أجمع على تحريمه، ج۹ ص۱۲.
[۲] فتح الباري،قوله باب ما جاء في المتأولين، قبيل كتاب الإكراه،ج۱۲ ص۳۰٤.

"تاویل" تکذیب نہیں بلکہ تصدیق کی فرع ہے

امام غزالی رحمہ اللہ اس پر ایک پورا رسالہ لکھا ہے کہ نصوص میں تاویل تکذیب سے قطعاً مختلف چیز ہے بلکہ تاویل تصدیق ہی کی فرع ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص تاویل کرے تو اس کو کافر یا منکر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آپ نے تحریر فرمایا کہ "ایمان" تصدیق کا نام ہے اور تصدیق کے پانچ مختلف مراتب و درجات ہیں، ان سب مراتب کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں:

اعلم أن من نزل قولا من أقوال صاحب الشرع علي درجة من هذه الدرجات فهو من المصدقين، وإنما التكذيب أن ينفي جميع هذه المعاني ويزعم أن ما قاله لا معني له و إنما هو كذب محض-- ولا يلزم الكفر للمؤولين ما داموا يلازمون قانون التأويل.

"یاد رکھو کہ جس نے شریعت کی بات کو ان پانچوں درجات میں کسی بھی درجہ میں برقرار رکھ کر قبول کیا تو اس نے تصدیق کی (اور مسلمان کہلائے گا) تکذیب (و کفر) تو یہ ہے کہ ان تمام درجات کا انکار کرے اور یہ خیال کرے کہ (معاذ اللہ) شریعت کے ان نصوص کا کوئی معنیٰ نہیں بلکہ صاف جھوٹ ہے، تاویل کرنے والے جب تک تاویل کے ضابطہ میں رہیں گے تو کافر نہیں ہوں گے۔"[۱]

---

[۱] فيصل التفرقة بين الإسلام والزندقة، الفصل الخامس: القول في معني تكذيب الشارع، ص ٤١.

جمہورِ اُمت کا مؤقف

علامہ ابو البقاء کفوی الحنفی رحمہ اللہ جمہورِ اُمت کا مؤقف نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

مختار جمهور أهل السنة منهما عدم إكفار أهل السنة من المبتدعة المؤولة في غير الضرورية لكون التأويل شبهة، كما في " خزانة " الجرجاني، و " المحيط " البرهاني، و "أحكام" الرازي، و رواه الكرخي والحاكم الشهيد عن الإمام أبي حنيفة والجرجاني عن الحسن بن زياد و شارح " المواقف والمقاصد " والآمدي عن الشافعي والأشعري لا مطلقا.

"اہلِ سنت کا مختار مذہب یہ ہے کہ جو اہلِ بدعت ضروریاتِ دین کے علاوہ دیگر مسائل میں تاویل کرتے ہیں، وہ ان کو کافر نہیں کہتے، کیونکہ تاویل ایک شبہ ہے جیسا کہ متعدد کتابوں میں لکھا ہے۔۔"[۱]

ضروریاتِ دین میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے

تاویل کے جائز ہونے کی شرائط کے ذیل میں یہ بات ذکر ہوچکی ہے کہ جب تک کسی نص سے اس کا لغوی متبادر معنیٰ مراد لیا جاسکے، اور اس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو، تو یہی متبادر معنیٰ ہی مراد ہو گا، بلا ضرورت اس عام معنیٰ کو چھوڑ کر تاویل کے سہارے دوسرے معانی مراد لینا جائز نہیں، البتہ جہاں اس عام قانون کے مقابلے میں اس

[۱] الكليات، حرف الكاف، الكفر (ص: ٧٦٦).

سے زیادہ مضبوط دلیل موجود ہو اور وہ اس متبادر معنیٰ مراد لینے سے مانع ہو تو وہاں تاویل کی جائے گی۔

اس اُصول کے مطابق ضروریاتِ دین میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں رہ پاتی، کیونکہ جیسا کہ آئندہ باب رابع میں واضح ہو جائے گا کہ "ضروریاتِ دین" دین اسلام کے ان بنیادی احکام کا نام ہے جس کا معنیٰ و مفہوم اسلامی معاشرے میں اتنا عام ہو کہ ہر خاص وعام کو اس کا پتہ ہو، اس کے جاننے کے لئے کوئی بہت زیادہ علم کی ضرورت نہ ہو، بلکہ دیندار طبقے کے عوام وخواص سب کو اس کا علم ہو تو ایسے احکام جوں کے توں تسلیم کرنے ضروری ہیں، نصوص میں جس طرح حکم وارد ہوا، اسی طرح اس پر ایمان واعتقاد رکھنا ضروری ہے، اس کے معنیٰ و مفہوم میں اپنی طرف سے تاویلات کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ ختم نبوت میں تاویل کے کفر ہونے کی اصل وجہ

مثلاً متعدد نصوص میں حضور ﷺ کی ایک صفت بیان فرمائی گئی کہ آپ ﷺ "خاتم النبیین" ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

"محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔"[۱]

[۱] سورة الأحزاب، رقم الآية: ٤٠.

اس لفظ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ سب سے آخری نبی ہیں، آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، لفظ کے اسی متبادر معنیٰ پر قرن اوّل سے لے کر عصر حاضر تک تمام اُمت کا اتفاق رہاہے، پوری اُمت نے ان نصوص کی وجہ سے اس بات پر اجماع کیاہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آسکتا۔

اب اگر کوئی شخص اس لفظ کو تسلیم کرے کہ حضور ﷺ واقعۃ خاتم النبیین ہیں لیکن اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، بلکہ ظلی وبروزی کی تاویل کرکے آپ کے بعد بھی نئی نبوت کا قائل رہے تو وہ یقیناً کافر ہو گا۔

تاویل تب اختیار کی جاتی ہے جہاں کہیں لفظ کا اپنا ظاہری معنیٰ مراد لینا متعذر ہو اور یہاں ایسی کوئی مشکل نہیں۔ دوسری طرف جب اس کے اسی متبادر معنیٰ پر پوری اُمت متفق ہے، اور یہ اتفاق صرف علماء تک ہی منحصر نہیں بلکہ دیندار عوام بھی یہی جانتے مانتے ہیں تو علماء اور غیر علماء کے اس اعتقاد و تسلیم سے اسی متبادر مفہوم میں مزید تاکید پیدا ہو گئی اور اب یہ مسئلہ ان بنیادی مسائل کی سی اہمیت اختیار کر گیا جن کو "ضروریاتِ دین" سے تعبیر کرتے ہیں جس کا انکار کرنا یا اُمت کے متفقہ مؤقف کے خلاف کوئی نیا مفہوم کشید کرنا دونوں برابر ہیں۔

امام صاحب کے کل فتاویٰ تکفیر کی تعداد

قاضی کمال الدین بیاضی رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب "إشارات المرام "میں لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے کل تیئس (۲۳) مسائل میں کفر کا فتویٰ دیاہے، ان میں سے چھ مسائل تو ایسے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف صراحۃً کوئی نقص منسوب کرنے کے بارے میں ہیں اور سولہ (۱۶) مسائل میں ضروریاتِ دین کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم دیاہے جبکہ ایک

مسئلہ ایسا تھا جہاں نہ اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی نقص منسوب ہوا نہ ہی ضروریاتِ دین کا انکار ہو، بلکہ اس صورت میں تکفیر کی بنیاد ضروریاتِ دین میں تاویل ہے اور اسی لئے آپ نے کفر کا فیصلہ فرمایا۔[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ ضروریاتِ دین میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے اور یہ تاویل تکفیر سے مانع نہیں ہے۔

ضروریاتِ دین میں تاویل کے کفر ہونے کی بنیادی وجہ

ضروریاتِ دین میں تاویل کے کفر ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں دو باتیں ہیں

۱۔ شریعت سے اس عقیدے کا ثبوت۔

۲۔ اس کا مفہوم۔

اور یہ دونوں باتیں متواتر ہونے کی وجہ سے یقینی اور قطعی ہوتی ہیں بلکہ عوام وخواص میں مشہور ہو جانے کی وجہ سے "ضروری" بن جاتی ہیں، ان دونوں باتوں کا دین اسلام میں سے ہونا جب عوام وخواص سب کو معلوم ہو تو اس کی وجہ سے یہ ضروریاتِ دین میں شامل ہو جاتے ہیں جن کی تاویل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا جو مفہوم مسلمان طبقہ میں متوارث چلا آرہا ہے، وہ غلط ہے، تو چونکہ اس میں اس مفہوم کا بھی انکار ہوا جو بجائے خود ضروریاتِ دین میں سے تھا، اس لئے یہ کفر ہے۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(فالعدول عنها) أي عن الظواهر (إلى معان يدعيها أهل

---

[۱] اشارات المرام، ص۵۱، زمزم پبلشرز، کراچی۔

الباطن) (إلحاد) أي ميل وعدول عن الإسلام واتصال و اتصاف بكفر، لكونه تكذيباً للنبي عليه السلام فيما علم مجيئه به بالضرورة.

"ظاہر کو چھوڑ کر اہل باطن جیسے معانی مراد لینا الحاد اور گمراہی ہے، یہ اسلام سے اعراض اور کفر کو اختیار کرنا ہے، کیونکہ یہ درحقیقت ضروریاتِ دین میں حضور ﷺ کی تکذیب ہے"

خط کشیدہ عبارت سے واضح ہوا کہ جب نصوص کا ایک مفہوم دلیل کے اعتبار سے متعین ہے تو بلا دلیل اس مفہوم سے اعراض کرنا اور اس کے مقابلے میں دوسرے مفاہیم مراد لینا اس نص کی تکذیب ہے، گویا ایسا کرنے والا اس نص کو درست تسلیم ہی نہیں کرتا، اور جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے کہ ضروریاتِ دین کا مفہوم اجتماعی تواتر اور توارث سے ثابت ہوتا ہے جو قطعی ہے، اس لئے اس میں تاویل کرنا اور اس کو اپنے متوارث مفہوم سے نکالنا درحقیقت اس کو تسلیم نہ کرنا ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں۔

علامہ بیاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جمہور اہل سنت نے ان مبتدع لوگوں کی تکفیر نہیں کی جو اہل قبلہ میں سے ہیں اور ضروریاتِ دین کے علاوہ باقی مسائل میں تاویل کرتے ہیں، (یہ قید اس لئے لگائی ہے کہ) ضروریاتِ دین میں تاویل کرنا دیگر اُصول میں تاویل کرنے کی طرح نہیں ہے، کیونکہ بعض نصوص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ظاہر پر محمول ہیں، تو ایسی نصوص میں تاویل کرنا درحقیقت نبی

کریم ﷺ کی تکذیب کرنا ہے۔"[۱]

امام العصر علامہ کشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

أن التصرف في ضروريات الدين، والتأويل فيها، وتحويلها إلى غير ما كانت عليه، وإخراجها عن صورة ما تواترت عليه كفر، فإن ما تواتر لفظاً أو معنى، وكان مكشوف المراد، فقد تواتر مراده، فتأويله رد للشريعه القطعية، وهو كفر بواح، وإن لم يكذب صاحب الشرع، وإنه ليس فيه إلا الإستتابة.

"ضروریاتِ دین میں تصرف کرنا، تاویل کرنا، اس کو اپنے معہود معنٰی سے پھیرنا اور اپنے متواتر شکل سے نکالنا کفر ہے، کیونکہ جو نص لفظاومعنا متواتر ہو اور اس کا معنٰی واضح ہو تو گویا کہ اس کا معنٰی مراد بھی متواتر ہے، لہٰذا اس میں تاویل کرنا قطعی شریعت کو رد کرنا ہے جو کہ واضح کفر ہے۔"[۲]

تاویل معتبر ہونے کے متعلق ایک ضروری نکتہ

تاویل کے کفر نہ ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خود کرنے والے نے اس کا قصد بھی کیا ہو، اگر کسی شخص نے دین کے کسی قطعی اور یقینی حکم کا انکار کیا جس کا انکار موجب کفر تھا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو کافر کہا جائے لیکن ساتھ یہ احتمال بھی موجود ہو کہ شاید اس نے خالص انکار نہیں کیا، بلکہ اس کے متعلق وارد شدہ نص کی تاویل کی، تو اس

[۱] إشارات المرام من عبارات الإمام، ص ۵۱-

[۲] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، خاتمة، ص۱۲۸.

کی تکفیر میں احتیاط برتی جائے، اور جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ خود انکار کرنے والے کے پیش نظر بھی تاویل تھی انکار مقصود نہ تھا، اس وقت تک اس کے اس عمل کو تاویل پر محمول نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا حکم انکار ہی کا حکم ہو گا۔

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قد كان الأئمة رحمهم الله يعتبرون إرادة التأويل وقصده، فجاء المتسللون فاعتبروا إيجاده، ففي "جامع الفصولين"، وعن مالك رحمه الله أنه سئل عن من أراد أن يضرب أحداً؟ فقيل له: ألا تخاف الله تعالىٰ؟ فقال: لا، قال: لا يكفر، إذ يمكنه أن يقول: التقوى فيما أفعله له، ولو قيل له ذلك في معصيته، فقال: لا أخافه يكفر، إذ لا يمكنه ذلك التأويل اهـ. ونحوه في "الخانية" في قصة شداد بن حكيم مع زوجته، وذكرها في "طبقات الحنفية" من شداد عن محمد رحمه الله أيضاً، وهو أولى بالاعتبار مما ذكره من اعتبار مجرد الامكان، فإنه لا حجر فيه، وقالوا في الإكراه على كلمة الكفر: إن خطر بباله التورية ولم يور كفر، فاعتبروا القصد وإرادة التأويل في حقه، وإلا فالتمحل لا يعجز عنه أحد-

"متقدمین ائمہ کرام تاویل کے قصد کرنے کا اعتبار کرتے تھے بعد میں نااہل لوگوں نے (صرف اس پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ) تاویل کے ایجاد کرنے کا بھی اعتبار کرنا شروع کیا (اور اگر تاویل کا صرف احتمال بھی موجود ہو تو بھی تکفیر سے روکتے ہیں) چنانچہ جامع الفصولین میں امام مالک رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے

کہ ان سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی دوسرے کو مارنا چاہتا تھا تو کسی نے کہا کہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا نہیں؟ مارنے والے نے جواب میں کہا کہ نہیں، تو امام مالک رحمہ اللہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ شخص کافر نہیں ہوا، کیونکہ کلمہ میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ مارنے ہی میں تقویٰ کا پہلو موجود ہے (یعنی کسی خاص ایسی صورت میں مار رہا ہو جس میں شرعاً مارنا لازم ہو، اس لئے ایک ضروری حکم پورا کرنے میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟) اور کسی گناہ کرتے وقت ایسا کہا جائے اور وہ کہے کہ نہیں، میں اللہ سے نہیں ڈرتا تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ پھر یہ تاویل ممکن نہیں۔۔ صرف تاویل کے امکان کو معتبر ماننے کے مقابلے میں اس اُصول کا اعتبار کرنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ تاویلات کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی، جس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو کہ اکراہ کے باب میں فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا گیا اور اس کے دل میں دوسرا کوئی خیال آیا جس کے متعلق مذکورہ کلمہ کہنے میں کفر سے بچنا ممکن ہو، پھر بھی اس نے اس خیال کا ارادہ نہیں کیا تو کافر ہو جائے گا۔ تو دیکھئے یہاں فقہاء کرام نے اس دوسرے احتمال کے قصد وارادے کا اعتبار کیا (صرف نفس امکان کو معتبر نہیں مانا) ورنہ تو تکلف کے ساتھ تاویل کرنا تو کوئی مشکل نہیں۔"[۱]

اس سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دین کے کسی مسئلے کا انکار کرے اور وہ مسئلہ ایسا ہو کہ قطعی طور پر ثابت بھی ہو تو اگرچہ انکار کی بنیاد تاویل بھی ہو سکتی ہو لیکن اگر خود منکر نے اس تاویل کی وجہ سے انکار نہیں کیا بلکہ بلا تاویل ہی انکار کر بیٹھا تو وہ کافر ہو جائے گا، صرف احتمالات کی موجودگی کی وجہ سے اس کو مسلمان نہیں

---

[۱] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، ص: ۹۰.

کہا جاسکتا۔

اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کفر و اسلام کا اصل دار و مدار دلی تصدیق و تکذیب پر ہے، زبانی کلمات کو شریعت نے ان کا قائم مقام ٹھہرایا، لہٰذا جب کوئی شخص جاننے کے باوجود اس قسم قطعی دینی احکام کا انکار کرتا ہے تو اُصول کے مطابق وہ کافر ہو جائے گا، تاویل صرف ایک معروضی یا استثنائی شکل تھی، اور معروضی حالات اگر موجود نہ ہو تو اُصول کے مطابق ہی احکامات جاری ہوتے ہیں۔

علامہ کشمیری اور جامع الفصولین کی عبارات میں تضاد

قاضی ابن سماوہ رحمہ اللہ نے امام ماتریدی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص ہمارے زمانے کے بادشاہ کو عادل کہے وہ کافر ہے، کیونکہ اس زمانے کے بادشاہ عادل نہیں، بلکہ واضح طور پر جابر و ظالم ہیں، لہٰذا ان کو عادل کہنا گویا ان کے ظلم وجبر کو عدل کہنا ہے جو کہ کفر ہے۔

بعض متاخرین حنفیہ نے اس کلمہ کو موجب کفر ماننے سے انکار کیا اور وجہ اس کی یہ بیان کر دی کہ اس میں تاویل کا احتمال موجود ہے، کیونکہ عادل جس طرح منصف کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح جب اس کے صلہ میں "عن" آجائے تو اعراض کرنے اور مائل ہونے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، گویا اس احتمال کے مطابق عادل اور ظالم کا مفہوم ایک ہی ہے، چونکہ ایک جائز اور مناسب احتمال موجود ہے، اس لئے اس کلمہ کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا درست نہیں۔

جامع الفصولین میں متاخرین کی اسی دلیل سے یہ استدلال کیا گیاہے کہ امکان تاویل بھی مانع تکفیر ہے، یعنی اگر کسی کلام میں کفریہ احتمال کے علاوہ بھی کوئی احتمال موجود ہو

تو اس کلام کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا جائز نہیں ہے، اگرچہ خود متکلم نے اس تاویل کا ارادہ نہ کیا ہو، چنانچہ جامع الفصولین میں لکھا ہے کہ:

أقول: هذا نص على أن مجرد إمكان التأويل يمنع التكفير وإن لم يظهر التأويل وعلى هذا ينبغي أن لا يكفر في مواضع كثيرة مما قيل بكفره فليتأمل.

"بعض متاخرین کی یہ توجیہ اس بات کی تصریح ہے کہ صرف کسی جائز تاویل کا احتمال بھی مانع تکفیر ہے اگرچہ تاویل پوری طرح واضح نہ بھی ہو۔"[۱]

اکفار الملحدین اور جامع الفصولین کی ان دونوں عبارات میں تضاد ہے، "اکفار" میں نفس تاویل کو مانع تکفیر نہیں کہا بلکہ ارادہ تاویل کو ضروری قرار دیا ہے جبکہ جامع الفصولین میں نفس تاویل کو بھی مانع تکفیر قرار دیا گیا ہے۔

تطبیق

دونوں آراء کو سامنے رکھتے ہوئے بظاہر یہی تطبیق مناسب معلوم ہوتی ہے کہ "اکفارالملحدین" کے مؤقف کو کفر پر حمل کیا جائے اور جامع الفصولین کی عبارت کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے اور اس سے تکفیر ہی مراد لی جائے، اس کا حاصل یہ ہو گا کہ اگر کسی شخص نے غیر کفریہ احتمال کا ارادہ نہیں کیا تو وہ دیانۃً کافر ہو جائے گا، تاہم ہمارے لئے اس کے کفر کا فیصلہ کرنا جائز نہیں ہو گا، کیونکہ احتمال کی موجودگی میں بنائے تکفیر قطعی نہیں رہی جو کہ تکفیر کی بنیادی شرط ہے۔

---

[۱] جامع الفصولین،الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية ،ج۲ص ۱۷٤.

اس خیال کی تائید علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

وإن سئل عمن تكلم بكفر متأول قال يسأل إن أراد كذا فلا شيء عليه، وإن أراد كذا فيستتاب فإن تاب قبلت توبته وإلا قتل- [۱]

"جو شخص کوئی ایسی کفریہ بات کرے جس میں تاویل ہو سکتی ہے تو اس سے پوچھا جائے گا، اگر اس نے کسی غیر کفریہ احتمال کے ارادے سے بات کی تو اس پر کوئی (سزا) نہیں اور اگر کفریہ احتمال کا ارادہ تو اس سے توبہ طلبی کی جائے گی، اگر توبہ کی تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی ورنہ تو قتل کیا جائے گا۔"

اس عبارت میں محتمل کلمہ کہنے کی وجہ سے تکفیر نہیں کی گئی بلکہ احتمال کی وجہ سے تنقیح کرائی گئی، متکلم سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں جب معلوم ہوا کہ وہ غیر کفری احتمال کا اراد نہیں کر رہا بلکہ کفریہ احتمال ہی اس کا مقصود ہے تو اس کو کافر قرار دیا گیا۔

---

[۱]البحر الرائق،كتاب القضاء،فصل في المستفتي ،ج٦ص٢٩١.

تیسری قسم کی شرائط

اب تک ان شرائط کو بیان کیا گیا جو مکفِّر اور مکفَّر کے اعتبار سے ضروری تھیں، اس کے بعد ان شرائط کو بیان کیا جارہا ہے جن کا تعلق خود اس قول و فعل کے ساتھ ہے جس کی وجہ سے کسی کو کافر کہا جاتا ہے۔

ہر بات پر کسی کو کافر کہنا پوری اُمت کے نزدیک ناجائز ہے، لہٰذا اس میں دو رائے نہیں ہے کہ ہر کوتاہی موجب کفر نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے کچھ خاص شرائط ہیں، یہاں اُنہی شرائط کو ذکر کرنا مقصود ہے۔

پہلی شرط: موجبِ کفر ہونا

بنیادی شرط یہ ہے کہ جس قول و عمل کی بنیاد پر کسی کی تکفیر کی جارہی ہو، واقعۃً وہ عمل موجبِ کفر بھی ہو، کیونکہ معاصی کی بناء پر تکفیر کرنا اہل سنت والجماعت کا مسلک نہیں ہے، لہٰذا کسی کو کافر کہنے سے پہلے اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ جس عمل کی وجہ سے اس کو کافر کہا جارہا ہے آیا وہ عمل ایسا ہے بھی جس کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جاسکتی ہے؟

رہا یہ سوال کہ کن کن اُمور کی وجہ سے کسی کو کافر کہا جاسکتا ہے؟ اور کن اُمور کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جاسکتی؟ تو اس کی تفصیل اسی کتاب کے باب چہارم میں ذکر کردی جائے گی، انشاءاللہ تعالیٰ۔

دوسری شرط: کفر و تکفیر کا دارومدار

جیسا کہ پہلے بھی یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ ایمان و کفر کا اصل تعلق دل کے ساتھ ہے لیکن شریعت نے بعض اقوال وافعال کو بھی اس کا قائم مقام ٹھہرایا ہے، کیونکہ یہ

اعمال دل کی تصدیق یا تکذیب پر دلالت کرتے ہیں، لیکن چونکہ مسئلہ "ایمان وکفر" کا ہے جس میں انتہائی حزم واحتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے عمل کی بنیاد پر کسی کو کافر کہنے سے پہلے اس بات کا گہرا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس عمل کی دلالت دِلی تکذیب پر کس درجہ کی ہے؟ اگر دلالت یقینی اور قطعی ہو تب تو کفر کا حکم جاری ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں۔

تکفیر کے باب میں اس شرط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے بڑی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔

دلالت کا معیار

اگر کوئی شخص گناہ کبیرہ کر رہا ہے، زنا، شراب یا سود وغیرہ کا ارتکاب کر رہا ہے تو کسی درجہ میں یہ گناہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی، آخرت اور قبر وحشر کے عذاب کا مکمل طور پر یقین نہیں ہے، اگر ان چیزوں کا یقین ہوتا تو وہ معمولی لذت کی خاطر اتنی مصیبتیں اپنے لئے جمع نہ کرتا۔

اگر کوئی عقل مند آدمی چند ٹکوں کے بدلے اس دارِ فانی میں عمر قید برداشت نہیں کرتا تو اس شخص نے آخرت کے عذاب کو ایک لمحہ کی خوشی کے لئے کیونکر برداشت کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ دل میں آخرت پر کماحقہ یقین نہیں ہے ورنہ اتنی حماقت نہ کرتا۔

اب یہاں یہ گناہ بھی دلی تکذیب پر دلالت کرتا ہے لیکن اس کی بناء پر کسی مسلمان کی تکفیر کرنا بالکل ناجائز ہے اور یہ دلالت قطعی اور صریح نہیں، کیونکہ اس میں کفر کے علاوہ دیگر احتمالات بھی موجود ہیں، بسا اوقات دل میں آخرت اور جزاوسزا پر یقین رکھنے کے باوجود اس قسم کے گناہوں کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔

بہت سے لوگوں کی غلط فہمی کی بنیاد یہی بات بنی کہ وہ ہر قسم کی دلالت کو مد نظر

رکھ کر تکفیرِ مسلم کے جرم میں مبتلا ہو جاتے ہیں، **لیکن فقہاءِ کرام اوراہل سنت والجماعت کے نزدیک جس عمل کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جاتی ہے، اس کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ اس کی دلالت دلی تکذیب پر صریح اور قطعی ہو، اگر یہ دلالت صریح نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے احتمالات بھی موجود ہوں تو اس کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا بے احتیاطی اوراہل سنت والجماعت کے مسلک ومشرب کے بالکل خلاف ہے۔**

امام غزالی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ولكن يعرف اعتقاده تعظيم الصنم تارة بتصريح لفظه، وتارةً بالإشارة إن كان أخرساً، وتارة بفعل يدل عليه دلالة قاطعة كالسجود حيث لا يحتمل أن يكون السجود لله وإنما الصنم بين يديه كالحائط وهو غافل عنه أو غير معتقد تعظيمه، وذلك يعرف بالقرائن.

"بتوں کی عظمت کا عقیدہ کبھی تو صریح الفاظ استعمال کرنے سے معلوم ہو گا اور اگر گونگا ہو تو اشارہ سے معلوم ہو گا اور کبھی ایسے کام کرنے سے معلوم ہو گا جو قطعی طور پر اس اعتقاد پر دلالت کرے مثلاً (بت کے سامنے) سجدہ کرنا، کہ اس میں یہ احتمال نہیں ہے کہ شاید سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے کر رہا ہو اور بت صرف دیوار کی مانند سامنے موجود ہو، یا یہ احتمال کہ بت کے عظمت کا خیال نہ رکھتا ہو گا، یہ باتیں قرائن سے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔"[۱]

[۱] الاقتصاد في الاعتقاد، الباب الرابع، بيان من يجب تكفيره من الفرق، ص:۱۳۸.

تیسری شرط: کفریہ عمل کے صادر ہونے کا شرعی ثبوت

کسی خاص شخص کو کافر قرار دینے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ کافر قرار دینے والے کے پاس اس بات کا ثبوت بھی ہو کہ وہ جس شخص کو معیّن طور پر کافر کہہ رہا ہے اس نے واقعۃً کوئی واضح کفریہ کام کیا ہو، شرعی ثبوت کے بغیر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں، کیونکہ کسی کو کافر قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا وآخرت میں لعنت اور سزائے خداوندی کا مستحق ہے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا وغیرہ وغیرہ ، اور ظاہر ہے کہ کسی مسلمان شخص کے بارے میں اتنی بڑی جسارت کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق کرنا ضروری ہے کہ اس نے متعلقہ کام کیا بھی ہے یا نہیں؟

احادیثِ مبارکہ میں بے جا کسی کو لعنت کرنے اور کسی مسلمان کو بلا دلیل ناحق کافر کہنے کو قتل کی طرح قرار دیا گیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں:

لعن المؤمن كقتله، ومن رمى مؤمنا بكفر فهو كقتله.

"مسلمان پر لعن کرنا اس کو قتل کرنے کی طرح ہے اور جس نے کسی مسلمان کو کافر کہا (یہ ایسا گناہ ہے کہ) گویا اس کو قتل کر دیا۔"[۱]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عینی رحمہ اللہ وغیرہ شارحین نے بیان فرمایا کہ کسی کو کافر کہنا دراصل اس کے قتل کئے جانے کا سبب ہے،[۲] یعنی جب کسی شخص کو

---

[۱] صحيح البخاري، باب من كفر أخاه بغير تأويل فهو كما قال،رقم الحديث: ٦١٠٥.

[۲] عمدة القاري شرح صحيح البخاري،كتاب الإيمان والنذور،باب من حلف بملة سوى ملة الإسلام ،ج٢٣ص١٧٩.

کافر قرار دیا جائے تو کفر کے تمام احکام اس پر جاری ہوں گے جس میں سے ایک قتل بھی ہے تو گویا یہ تکفیر ہی قتل ہو جانے کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا جس طرح کسی کو قتل کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ جس شخص کو قتل کیا جا رہا ہے، کیا وہ واقعۃً مجرم ہے یا نہیں؟ اور اگر مجرم ہو تو کیا جرم کی نوعیت یہ ہے کہ اس کی پاداش میں قتل کیا جائے یا نہیں؟ ان تمام باتوں کی بابت تسلی کرنے کے بعد ہی کسی کو قتل کیا جا سکتا ہے، یہی حکم کسی کو کافر قرار دینے کا بھی ہے کہ جب تک مستند ذرائع سے کسی کفریہ عمل کرنے کا ثبوت نہ مل جائے تب تک کسی کو کافر کہنے کی جسارت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

چوتھی شرط: موانعِ تکفیر موجود نہ ہوں

کفریہ عمل کرنے کے ثبوت کے بعد اس بات کی تنقیح بھی ضروری ہے کہ کفریہ عمل صادر ہونے میں تکفیر کے موانع میں سے کوئی مانع موجود تھا یا نہیں؟ اس باب کے شروع میں جو موانع ذکر ہوئے، اگر ان میں سے کوئی ایک مانع بھی موجود تھا اور اس کی وجہ سے کسی مسلمان نے کوئی کفریہ قول و عمل کا ارتکاب کیا تو اس کو کافر قرار دینا جائز نہیں، اس لئے اس کی تحقیق بھی ضروری ہے تا کہ ناحق تکفیر مسلم کے گناہ سے حفاظت ہو جائے۔

پانچویں شرط: بنائے تکفیر کا کفر ہونا یقینی ہو

جس عقیدے یا عمل کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جا رہا ہو، اس کا یقینی طور پر کفر ہونا ضروری ہے، محتمل امر کو بنیاد بنا کر کسی کی تکفیر کرنا شرعاً جائز نہیں یعنی جس قول و فعل میں کفر و اسلام دونوں کا احتمال موجود ہو اس کی بناء پر کسی کو کافر قرار دینا درست نہیں، اسی بنیاد پر حضرات فقہاء کرام نے یہ قاعدہ مقرر فرمایا ہے کہ جس کلمہ میں کفر کے بیسیوں احتمالات

موجود ہوں، صرف ایک ممکنہ احتمال کسی ایسی پہلو کا بھی ہو جس کو اختیار کرنے کی صورت میں کفر اور تکفیر کی ضرورت نہ پڑے تو حتی الامکان اسی آخری احتمال کو ترجیح دینا ضروری ہے اور جب تک متکلم خود کسی کفریہ احتمال کی صراحت نہیں کرتا تو صرف اس محتمل کلمہ کی وجہ سے اس کو قطعی کافر کہنا بالکل غلط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ وغیرہ بہت سے فقہاء کرام نے کسی عمل کے بناء پر تکفیر کے جائز ہونے کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس عمل کے کفر ہونے میں حضرات فقہاء کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو اگر کسی بات کے کفر ہونے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہو تو چونکہ ایسا عمل یقینی طور پر موجب کفر نہیں رہتا، اس لئے اس کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا درست نہیں۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وفي الخلاصة وغيرها إذا كان في المسألة وجوه توجب التكفير ووجه واحد يمنع التكفير فعلى المفتي أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير تحسينا للظن بالمسلم زاد في البزازية إلا إذا صرح بإرادة موجب الكفر فلا ينفعه التأويل حينئذ وفي التتارخانية لا يكفر بالمحتمل لأن الكفر نهاية في العقوبة فيستدعي نهاية في الجناية ومع الاحتمال لا نهاية اه-.

"خلاصۃ الفتاویٰ وغیرہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں ایسے کئی احتمال موجود ہوں جو موجب کفر ہوں لیکن کوئی ایک ایسی توجیہ ہو جو تکفیر سے مانع ہو تو مفتی کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمان کے متعلق حسن ظن رکھتے ہوئے اسی مانع تکفیر توجیہ کو اختیار کرے، اس کے ساتھ فتاویٰ بزازیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر

خود متکلم کسی کفریہ احتمال کی مراد لینے کی تصریح کردے تو پھر تاویل کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا (بلکہ وہ کافر ہوگا) فتاویٰ تتارخانیہ میں لکھا ہے کہ احتمالی امر کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جاسکتی، کیونکہ کفر انتہائی سزا ہے تو اس کے لئے انتہائی درجہ کی جنایت ضروری ہے اور احتمال کی موجودگی میں کوئی جرم انتہائی نہیں بنتا۔"[۱]

علامہ شامی رحمہ اللہ اس عبارت کو نقل کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

والذي تحرر أنه لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة.

"جب تک کسی مسلمان کے کلام کو درست پہلو پر حمل کرنا ممکن ہو یا اس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اگر (کفر نہ ہونے کا قول) ضعیف ہی کیوں نہ ہو، تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جاتا۔[۲]

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ضعیف روایت کی بناء پر تکفیر سے خلاصی ممکن ہو تو حتی الامکان اسی کو اختیار کیا جانا چاہئے، علامہ حموی رحمہ اللہ اس میں مزید تاکید پیدا کردی اور یہ ذکر فرمایا کہ اگر اپنے مذہب میں عدم تکفیر کی کوئی روایت نہ ہو لیکن دیگر مذاہب میں کوئی ایسا قول ہو تو اسی پر عمل کرلینا چاہئے۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

قوله: متى وجدت رواية أنه لا يكفر: يعني ولو كانت تلك

---

[۱] البحر الرائق شرح كنز الدقائق، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ج٥ ص١٣٤.

[۲] حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب الجهاد، باب المرتد، ج٤ ص٢٢٤.

الرواية ضعيفة كما في شرح المصنف - رحمه الله تعالىٰ - على الكنز. أقول: ولو كانت تلك الرواية لغير أهل مذهبنا، ويدل على ذلك اشتراط كون ما يوجب الكفر مجمعا عليه. [۱]

"علامہ ابن نجیم نے فرمایا کہ جب کوئی روایت موجود ہو تو کسی کی تکفیر نہ کی جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روایت ضعیف بھی ہو جیسا کہ کنز کی شرح میں خود مصنف (علامہ ابن نجیم) نے لکھا ہے، میں کہتا ہوں کہ اگرچہ وہ روایت ہمارے مذہب کے علاوہ دیگر حضرات کی بھی ہو، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ موجب کفر امر کے لئے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ وہ متفق علیہ ہو۔"

---

[۱] غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر،الفن الثاني، كتاب السير، باب الردة، ج۲ص ۱۹۰.

احکام کفر و تکفیر

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، انسانی زندگی کے بیسیوں مسائل ایسے ہیں جن میں مسلمانوں اور کفار کے احکام میں فرق ہے، مسلمانوں کے لئے الگ حکم اور کافر کے لئے الگ، اسی طرح آخرت تو کفر واسلام کے درمیان فرق کا اصل مظہر اور میدان ہے، جہاں ان دونوں حقائق کے درمیان اصل فرق بالکل آشکارا اور آنکھوں کے سامنے آجائے گا جس کے بعد اس میں کوئی پوشیدگی یا خفاء کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا، اسلام اور کفر کے موضوع پر تحقیق کرنے والے کے لئے ان احکام کو سمجھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے، اس لئے یہاں ان احکام کو نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جاتا ہے۔[۱]

ان احکام کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ احکام ہیں جن کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہے اور دنیا ہی میں اس پر عمل کرنے کے لئے ان کو مشروع کیا گیا ہے، اور دوسری قسم احکام کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے جہاں اللہ تعالیٰ براہ راست ان احکام کو جاری فرمائیں گے۔

---

[۱] کتاب کی مناسبت سے اختصار کے ساتھ کچھ احکام بیان کئے گئے ہیں، کفار کے مزید اقسام، احکام اور ان کے ساتھ مختلف نوعیت کے تعلقات کے لئے ملاحظہ فرمائیں اس ناکارہ کی کتاب: "غیر مسلم کے ساتھ مختلف نوعیت کے تعلقات"۔ اس میں کفار کی مختلف اقسام پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، اور ان کے ساتھ مختلف قسم کے ربط و تعلق کے احکام و مسائل بھی تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایمان و کفر کے اعتبار سے اُخروی احوال

اگر کوئی مکلّف یعنی عاقل و بالغ آدمی دنیا سے انتقال کر جائے اور اس کو دین حق کی دعوت بھی پہنچی ہو، اس کے باوجود اس نے اسلام قبول نہیں کیا یا اسلام قبول تو کیا لیکن اس پر استقامت اختیار نہیں کی، بلکہ دنیا سے کفر کی حالت میں مرا، تو ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اگر مکلّف نہ تھا بلکہ یا تو عقل کی نعمت سے محروم تھا یا حد بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر کسی بچے کے والدین میں سے دونوں یا کوئی ایک مسلمان ہو تو اس کو بھی حکماً مسلمان سمجھا جائے گا اور اگر کم سنی کی حالت میں اس کا انتقال ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے جنت میں رہے گا، لیکن اگر والدین کافر ہوں تو کیا پھر بھی ایسا ہو گا یا دونوں میں کچھ فرق ہو گا؟

اس میں اختلاف ہے، معتزلہ اور بعض دیگر متکلمین نے جنت میں بھیجے جانے کا قول اختیار کیا ہے، اس کے مقابلہ میں بہت سے متکلمین نے جہنم میں بھیجے جانے کا مؤقف اپنایا ہے جبکہ امام صاحب رحمہ اللہ وغیرہ بہت سے ائمہ کرام سے توقف منقول ہے۔[1]

اسی طرح جو شخص عاقل و بالغ ہے مگر وہ کسی ایسی دور دراز گھاٹیوں کا باشندہ ہو جہاں دین اسلام کی کرنیں نہیں پہنچ سکیں اور اس کو دین حق کا کسی طرح علم حاصل نہیں ہو سکا، اور اس حال میں اس کا انتقال ہو جائے تو آخرت میں اس کا حشر مسلمانوں کے ساتھ ہو گا یا کفار کے ساتھ؟ حنفیہ اور ماتریدیہ کے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ کی

---

[۱] مزید تفصیل کے لئے کتب کلام ملاحظہ فرمائیں۔

ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے انسان شرعی احکام کا مخاطب بنتا ہے لیکن محض عقل ایمانیات کے لئے کافی نہیں جب تک وحی کی روشنی میسر نہ ہو، اس لئے اگر ایسا شخص ایمان و کفر کے متعلق کچھ نہ جانے اور کفریہ عقیدہ رکھے بغیر مرے تو کافروں جیسا عذاب نہیں دیا جائے گا اور اگر کوئی کفریہ عقیدہ اختیار کرکے مرا تو چونکہ کفر سمجھنے والے کے لئے ایمان سمجھنا بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے بلکہ ایک چیز کے سمجھنے کے بعد اس کی ضد سمجھنا بھی کوئی مشکل نہیں ہے اس لئے ایمان اختیار نہ کرنا اس کی بڑی کوتاہی ہے جس کی وجہ سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔

بہت سی کتابوں میں امام ابو حنیفہ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ توحید اور معرفت خداوندی کے لئے صرف عقل ہی کافی ہے، اس لئے اگر وحی کا علم نہ بھی پہنچے تو بھی محض عقل کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی پہچان ضروری ہے ورنہ تو کافر سمجھا جائے گا اور آخرت میں اس جرم پر عذاب دیا جائے گا، یہ قول منتقی وغیرہ بعض کتابوں میں ان حضرات کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن محقق اُصولیین نے اس کو ترجیح نہیں دی۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (علامہ عبد العزیز بخاری رحمہ اللہ کی کتاب "کشف الأسرار شرح أُصول البزدوی" ج۴ ص۳۸۷ قدیمی کتب خانہ، کراچی پاکستان)۔

دُنیوی معاملات میں کفر اور کفار کے احکام

دُنیوی معاملات میں بھی بیسیوں احکام کے درمیان مسلمان اور کافر کا فرق ہے، آسانی کے لئے ان احکام کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ کفر کے متعلق اسلام کا نظریہ۔ ۲۔ عبادات میں مسلمان اور کافر کے درمیان فرق۔ ۳۔ مالی معاملات اور لین دین کے مسائل میں دونوں کے درمیان فرق۔ ۴۔ مناکحات اور معاشرت کے باب میں فرق۔ ۵۔ حقوق و املاک۔

کفر کے متعلق اسلام کا نظریہ

۱۔ ہر مسلمان کے لئے اس بات کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے بالمقابل تمام ادیان و مذاہب باطل اور ناحق ہیں، دین اسلام تمام سابقہ ادیان کے لئے ناسخ ہے جس کی وجہ سے گذشتہ تمام مذاہب منسوخ ہوگئے ہیں اور اب قیامت تک سفینہ نوح یہی دین ہے اور یہی سبیل نجات ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں دین اسلام کے علاوہ کوئی دین و مذہب قبول نہیں ہو گا۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ [آل عمران : ۸۵].

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہو گا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہو گا۔"

۲۔ کفر اور اہل کفر سے اپنی براءت کا اظہار کرنا ضروری ہے، مسلمان کے لئے کفر سے محبت کرنا اور اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا قطعاً ناجائز ہے، اسی طرح اہل کفر سے ان کے دین و مذہب کی وجہ سے پیار و محبت کے جذبات رکھنا سخت گناہ اور نہایت خطرناک جرم ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور ان پر ایمان لانے والوں نے اپنی قوم سے یہی کہا تھا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللهِ وَحْدَهُ [الممتحنة: ٤]

"تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو (ایمان اور اطاعت میں) ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔"

بہت سی نصوص میں اس بات کا بڑی تاکید واہتمام کے ساتھ حکم دیا گیا، بلکہ بعض نصوص میں تو اس کو ایمان کا معیار قرار دیا گیا۔

یہاں اس مسئلہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ عموماً لوگ اس باب میں افراط و تفریط کے شکار ہوتے ہیں، بعض لوگ تو اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت ہی نہیں دیتے، بلکہ تمام ادیان و مذاہب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سبھی کے ساتھ احترام و تقدس کا رویہ رکھتے ہیں، اس کے بالمقابل بعض حضرات نے محض اس مسئلہ کو بنیاد بنا کر کفر و اسلام کے فیصلے کرنے شروع کئے اور کفار کے ساتھ جو کوئی اور کیسا بھی تعلق رکھے وہ ان کے نزدیک مسلمان نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کے ساتھ تعلقات کی مختلف نوعیتیں ہیں، ہر قسم تعلق کی اجازت نہیں بلکہ بعض قسم کے تعلقات میں کفر کا اندیشہ ہے اسی طرح ہر تعلق کو کفر قرار دینا بھی غلط ہے، بلکہ بعض جائز بھی ہے اور جو ناجائز تعلق ہے اس کا بھی ہر حال میں کفر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں: ا۔ موالات یعنی دوستی۔ ۲: مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی۔ ۳: مواسات یعنی احسان و نفع رسانی۔

ان معاملات میں تفصیل یہ ہے کہ موالات تو کسی حال میں جائز نہیں اور آیت

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ"

اور

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ"

میں یہی مراد ہے۔ اور مدارات تین حالتوں میں درست ہے، ایک دفع ضرر کے واسطے۔ دوسرے کافر کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے۔ تیسرے اکرام ضیف کے لئے، اور اپنی مصلحت و منفعت مال یا جاہ کے لئے درست نہیں، اور بالخصوص جبکہ ضرر دینی کا بھی خوف ہو تو بدرجہ اولیٰ یہ اختلاط حرام ہو گا۔۔۔ اور مواسات کا حکم یہ ہے کہ اہلِ حرب کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہلِ حرب کے ساتھ جائز۔۔" [۱]

کفر و اسلام کا اصل دار و مدار چونکہ دل کے ساتھ ہے اس لئے جن تعلقات کو یہاں ناجائز قرار دیا گیا ہے، اس پر ہر حال میں کفر کا فیصلہ کرنا جائز نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اولاً اساس تکفیر کی تحقیق کی جائے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے، اگر کفار کے ساتھ دوستی اس لئے رکھی جائے کہ ان کے دین و عقیدے کے ساتھ محبت ہے یا کوئی کفر کی وجہ سے اہل کفر سے دلی محبت رکھے تو یہ کفر ہے کیونکہ یہ در حقیقت رضا بالکفر ہے جو شرائط ایمان کے منافی ہے جس کی تفصیل باب اوّل میں تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

---

[۱] بیان القرآن، ج۱ص۲۲٦.

اگر کہیں تعلق کی بنیاد کوئی اور چیز ہو مثلاً کوئی ذاتی لالچ، دینوی منافع کا حرص وغیرہ تو ان مقاصد کے لئے کفار سے دوستی کرنا اگرچہ ناجائز اور سخت گناہ ہے لیکن اس کو کفر قرار دینا بھی بالکل غلط ہے، حضرات فقہاء کرام نے "زُنّار" وغیرہ اہل کفر کے لباس پہننے کے ذیل میں اس کی تفصیل لکھی ہے کہ ان جیسے شعائر کفار کا پہننا حرام اور سخت گناہ ہے لیکن اگر دِلی محبت کے بغیر پہنا جائے تو کفر نہیں، کفر تب ہی کہہ سکتے ہیں جبکہ کوئی دلی محبت سے ایسا اقدام کرے، اور چونکہ دل کا حال براہ راست معلوم کرنا ممکن نہیں اس لئے صاحب معاملہ کی بات کا اعتبار کرلینا چاہئے۔

مشہور مالکی فقیہ علامہ دردیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> (وشد زنار) -- والمراد به ملبوس الكافر الخاص به أي إذا فعله حبا فيه وميلا لأهله وأما إن لبسه لعبا فحرام وليس بكفر
>
> "زنار پہننا (بھی کفر ہے) اس سے مراد وہ لباس ہے جو کفار کے ساتھ مخصوص ہو، اگر کوئی اس کی محبت کی وجہ سے اور اس لباس پہننے والوں کی طرف (دِلی) میلان کی وجہ سے پہنے (تو تب ہی کفر کہہ سکتے ہیں ورنہ) اگر یونہی میں پہنے تو حرام تو ہے مگر کفر نہیں ہے۔" [۱]

فتاویٰ ہندیہ میں ایک دوسرے مسئلہ کی ضمن میں ذکر کردہ تفصیل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

---

[۱] الشرح الكبير للشيخ الدردير مع حاشية الدسوقي، باب في الردة وأحكامها ج٤، ص٣٠١.

وبقوله لمعامله الكفر خير مما أنت تفعل عند بعضهم مطلقا، وقيده الفقيه أبو الليث بأن قصد تحسين الكفر لا تقبيح معاملته.

"اگر کسی نے اپنے ساتھ معاملہ کرنے والے سے کہا کہ آپ کے کرتوت سے کفر بہتر ہے، تو بعض فقہاء کرام کے نزدیک اس لفظ سے مطلقاً کافر ہو جائے گا لیکن فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ اس میں یہ قید بھی لگائی کہ اگر کہنے والے کا اس لفظ سے کفر کو اچھا سمجھنا مقصود ہو تب ہی کافر ہو گا ورنہ اگر صرف مخاطب کے معاملہ کی برائی کرنا مقصود ہو تو کفر نہیں ہے۔"[۱]

عبادات اور معاملات کے باب میں اسلام و کفر کے درمیان بنیادی فروق

۱۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عبادات قبول ہونے کے لئے ایمان شرط ہے، کفر کے ساتھ ساتھ اگر بظاہر کوئی نیک کام بھی کیا جائے تو بھی وہ عند اللہ مقبول نہیں ہے جس کی وجہ سے آخرت کی نجات نصیب نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَى وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ-

---

[۱] الفتاوى الهندية، كتاب السير، الباب التاسع فى أحكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر، ج۲ص۲۷٦.

"اور ان کی خیر خیرات قبول ہونے سے اور کوئی چیز بجز اس کے مانع نہیں کہ اُنہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا اور وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ۔"[التوبة : ٥٤]

۲۔ شریعت کے جن احکام کا تعلق ایمانیات، عقوبات اور معاملات کے ساتھ ہیں، ان تمام احکام میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی فرق نہیں، بلکہ دونوں ہی برابر اس کے مکلف اور مخاطب ہیں (چند ایک استثناءات کے ساتھ مثلاً شراب کا لین دین وغیرہ) البتہ عبادات سے متعلق نصوص کے بھی کافر مخاطب ہے یا نہیں؟ اور اگر مخاطب ہیں تو صرف آخرت میں عذاب کے لحاظ سے یا دنیوی احکام میں بھی یہی حکم ہے؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: امام سرخسی رحمہ اللہ کی کتاب "أصول السرخسي" (فصل في بيان موجب الأمر في حق الكفار، ج١ص: ٧٣. اور امام جصاص رازی رحمہ اللہ کی کتاب "شرح مختصر الطحاوي ،كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ج١ ص ٧٣٥).

۳۔ غیر مسلم کو زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی۔[١]

۴۔ معاملات کے باب میں دونوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ دارالاسلام میں بطور ذمی رہتے ہوئے اگر یہ لوگ شراب یا خنزیر کا لین دین کرنا چاہے تو ان کو منع نہیں کیا جائے گا جبکہ مسلمان ان چیزوں کا نہ خود ہی مالک بن سکتا ہے نہ ہی کسی دوسرے کو مالک بنا سکتا ہے۔

---

[١] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،باب المصرف،ج٢ص ٣٥١.

نکاح و معاشرت کے باب میں فرق

۱۔ کافر شخص کسی مسلمان کا ولی نہیں بن سکتا۔

۲۔ مسلمان عورت کا کسی بھی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا حرام ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا - [البقرة : ٢٢١]

"اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جاویں"

۳۔ اسی طرح کافر عورت کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح کرنا بھی شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر کوئی عورت اہل کتاب میں سے ہو تو اس کے ساتھ مسلمان کا نکاح ہو سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ صرف نام نہاد عیسائی / یہودی نہ ہو بلکہ واقعۃً آسمانی دین، اللہ تعالیٰ کے وجود اور قیامت کی قائل ہو، اگر ان باتوں پر کسی کا ایمان نہیں تو صرف مردم شماری میں عیسائی شمار ہونے سے وہ اہل کتاب ہو سکتا ہے نہ ہی اس کے ساتھ کسی مسلمان مرد کا نکاح کرنا جائز ہے۔

حقوق و املاک میں فرق

۱۔ کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔

۲۔ مسلمان کافر کا بھی وارث نہیں بن سکتا، کیونکہ اختلاف دین مانع ارث ہے، البتہ اگر کوئی مسلمان خدانخواستہ مرتد ہو جائے اور اسی حالت میں وہ مرے یا کسی غیر اسلامی ملک میں جا کر پناہ گزیں ہو جائے، تو دیون کی ادائیگی کے بعد اس کا ترکہ مسلمان ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے گا، چاہے یہ کمائی اس نے مرتد ہونے سے پہلے کی ہو یا اس کے بعد،

اور امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک ارتداد سے پہلے کمائی کا تو یہی حکم ہے البتہ ارتداد کے بعد والی کمائی بیت المال میں رکھی جائے گی۔

۳۔ کافر مسلمان کے خلاف گواہی کا اہل نہیں ہے۔

۴۔ کافر کا ذبیحہ حرام ہے البتہ اہل کتاب اگر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جانور ذبح کریں تو ان کا ذبیحہ حرام نہیں ہے، تاہم اس میں بھی وہی شرط ہے جو ان کے ساتھ نکاح کرنے کے مسئلہ میں ذکر کی جاچکی ہے۔

۵۔ ارتداد کا ایک حکم قتل کرنا بھی ہے جو آدمی اسلام کے بعد کفر اختیار کرے تو حکومت وقت کو چاہئے کہ اس کو تین دن تک مہلت دے اور اس دوران اس کو دوبارہ اسلام میں داخل ہونے کی ترغیب دے، اگر دین اسلام کے متعلق کچھ شکوک وشبہات کی گردش نے اس کو اسلام سے پھیر کر مرتد بنایا ہو تو ان شبہات کو تسلی بخش ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کی جائے، اگر تین دن کے بعد اسلام لایا تو درست، ورنہ تو اس کو قتل کرنا ضروری ہے۔

یہ تفصیل تو تب ہے کہ جب مرتد ہونے والا (نعوذ باللہ) مرد ہو اگر عورت ایسا کوئی جرم کرے تو فقہاء احناف کے نزدیک اس کو قتل تو نہیں کیا جائے گا، تاہم اس کو عمر بھر قید میں رکھا جائے گا کہ یا تو اسلام لے آئے اور یا یوں ہی قید وبند کی حالت میں مر جائے۔

جماعت کی تکفیر کا ضابطہ

ابھی تک جو تفصیل گزری وہ کسی خاص فرد کے تکفیر سے متعلق تھی، پوری جماعت یا فرقہ کی تکفیر کے لئے کیا اُصول ہیں ؟یعنی جب کسی جماعت، گروہ اور فرقہ کو کافر قرار دینے کی ضرورت ہو تو اس کے لئے کیا ضابطہ ہے؟ یہاں اسی ضابطہ کو ذکر کرنا مقصود ہے۔

بحث کو شروع کرنے سے پہلے یہ بات واضح رہے کہ کافی تلاش کے باوجود اس کے لئے کوئی صریح معیار نہیں مل سکا، فقہاء کرام اور متکلمین کے کلام میں کہیں کوئی جامع ضابطہ کافی جستجو کرنے کے بعد بھی نہیں مل سکا، تاہم ایک عرصہ تک غور و فکر کرنے کے بعد یہ ناکارہ جس نتیجہ پر پہنچاہے اس کو اہل علم کی خدمت میں پیش کرتا ہے اس کی حیثیت کسی حتمی رائے کی نہیں ہے بلکہ اس لئے ذکر کیا جارہا ہے تاکہ اہل علم اور اہل فتویٰ اس پر غور کریں۔

سابقہ مباحث کے نتیجہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ کسی کی طرف کفر کی نسبت کرنا تب ہی درست ہو سکتا ہے جبکہ وہ کسی موجبِ کفر عقیدہ یا قول و فعل کا ارتکاب کرے، ایسے کسی امر کے ارتکاب کے بغیر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں، بالکل یہی حکم کسی جماعت کی تکفیر کا بھی ہے، اگر کسی جماعت کا ڈھانچہ ہی کسی کفریہ عقیدہ پر مشتمل ہو تب تو اس کی تکفیر درست بلکہ ضروری ہے، لیکن اگر جماعتی حیثیت سے اس میں کوئی ایسا کفریہ عقیدہ موجود نہ ہو جس کو بنائے تکفیر بنایا جا سکے، لیکن اس سے وابستہ کچھ افراد غلو و افراط کی وجہ سے کوئی کفریہ عقیدہ رکھے تو محض چند افراد کی وجہ سے پوری جماعت کی تکفیر کرنا درست نہیں، بلکہ سراسر خلاف احتیاط ہے، کیونکہ پوری جماعت کی تکفیر کرنے کی صورت میں اس جماعت سے وابستہ تمام افراد کی تکفیر لازم آتی ہے، جماعت تو افراد ہی سے عبارت ہوتی ہے جماعت کو کافر کہنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جو جو لوگ اس جماعت سے وابستہ ہیں

وہ تمام کافر ہیں۔

نیز اگر کہیں پوری جماعت کو کافر قرار دیا جا رہا ہو تو قواعد کے لحاظ سے یہ زیادہ سے زیادہ تکفیر مطلق کے قبیل سے ہو سکتا ہے اور تکفیر مطلق کے بارے میں سابقہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ اس کے تحت کس خاص فرد کو کافر قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ شخص معین کو کافر کہنے کے لئے مزید ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس کے حق میں تکفیر کے موانع میں سے کوئی بھی مانع موجود نہ ہو، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی جماعت کو کافر قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے ہر ہر فرد پر بھی کفر کا فتویٰ لگایا جائے بلکہ اس اقدام سے پہلے موانع تکفیر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اگر اس گروہ کا کوئی فرد ایسا ہو کہ اس کے حق میں کوئی مانع تکفیر موجود نہ ہو تب ہی اس کو کافر کہنا درست ہے ورنہ نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی جماعت ایسی ہو کہ اُمت مسلمہ سے اس کی علیحدگی کی بنیاد ہی کوئی کفریہ عقیدہ ہو اور وہ عقیدہ بھی ایسا ہو کہ وہ اس جماعت کی پہچان اور شعار کی حد تک مشہور ہو مثلاً قادیانیت، یہ وہ گروہ ہے جو اُمت مسلمہ سے ختم نبوت کے اُصولی مسئلہ میں بے جا اختلاف کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا، اسی طرح منکرین حدیث کہ جو حجیت حدیث کے مسلّمہ اور قطعی عقیدہ میں پوری اُمت سے ہٹ کر غلط راستہ پر چل پڑے، تو ان جیسی جماعتوں کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا ہی موجبِ کفر ہے، کیونکہ اس حقیقت کے جاننے کے باوجود کہ یہ جماعت کفریہ عقیدہ رکھتی ہے، اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرنا درحقیقت رضاء بالکفر کی قبیل سے ہے جو کہ کفر ہے۔

اس بات کی قریب ترین نظیر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو کافر کہہ کر پکارے اور دوسرا شخص اس لفظ کے باوجود اس کی طرف متوجہ ہو کر رضامندی سے اپنی حاضری کی یقین دہانی کرائے تو بہت سے فقہاء کرام نے اس کو موجب کفر اُمور میں شمار فرمایا

ہے اور لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے متوجہ ہونے والا شخص کافر ہو جائے گا، علامہ ابن نجیم موجبات کفر اُمور جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وبقوله لبيك جوابا لمن قال يا كافر- [۱]

"اگر کوئی کافر کہہ پکارے تو اس کو جواب دیکر متوجہ ہونے سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے۔"

علامہ شامی رحمہ اللہ اس کی وجہ یہ ذکر فرمائی ہے کہ

(قوله كفر) أي؛ لأن إجابته إقرار بأنه كافر فيؤاخذ به لرضاه بالكفر ظاهرا إلا إذا كان مكرها. وأما فيما بينه وبين الله تعالىٰ فإن كان متأولا بأنه كافر بالطاغوت مثلا فلا يكفر- [۲]

"کافر اس لئے کہا جائے گا کہ اس کو جواب دینا (گویا) اس بات کا اقرار ہے کہ جواب دینے والا کافر ہے لہٰذا اس اقرار کی وجہ سے اس کا مواخذہ ہو گا کیونکہ وہ ظاہر میں کفر پر راضی ہو گیا، مگر یہ کہ اکراہ کی حالت میں کوئی جواب دے، جہاں تک دیانت کا مسئلہ ہے تو اگر اس نے کافر سے طاغوت سے کافر ہونا مراد لیا ہو تو کافر نہیں ہو گا۔"

لیکن جہاں کہیں کسی جماعت کے تفرّق کی بنیاد کوئی ایسا کفریہ نظریہ نہ ہو جس کی بناء پر کسی کو کافر کہا جا سکے اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی موجبِ کفر بات ان کے شعار و پہچان

---

[۱]البحر الرائق؛ كتاب السير، باب أحكام المرتدين،ج٥ ص ١٣٣.

[۲] حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب الحدود، باب التعزير،ج٤ ص ٦٩.

کے طور پر مشہور ہو تو وہاں پوری جماعت کو جماعتی حیثیت سے کافر قرار دینا اور اس کے ہر ہر فرد کو صرف اس گروہ کی طرف منسوب کرنے کی وجہ سے کافر قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا، بلکہ وہاں یہ تفصیل ضروری ہے کہ اس جماعت کے افراد میں سے جو جو فرد فلاں فلاں کفریہ عقیدہ کا حامل ہو تو وہ کافر ہے۔

اس کی بنیادی وجہ ایک یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس صورت میں جماعتی حیثیت کے اندر کوئی کفریہ عقیدہ موجود نہیں جس کو بنائے کفر قرار دیا جاسکے، بعض افراد اگرچہ کفریہ عقیدہ کے حامل ہوں لیکن بعض افراد کے کردار کو پوری جماعت کا ترجمان قرار دینا اور ہر ہر فرد کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا خلاف احتیاط ہے، نیز کسی جماعت کے تمام تر افراد کا تتبّع اور استقصاء بھی کوئی آسان کام نہیں، اس لئے تکفیر جیسے نازک مسئلہ میں سلف صالحین اور جمہور فقہاء و متکلمین کے حد درجہ احتیاط کرنے کا تقاضا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں اس خاص جماعت سے وابستگی کی بناء پر کسی فرد معین کو کافر نہ کہا جائے جب تک اس کے بارے میں یہ یقین حاصل نہ ہو کہ وہ بھی کسی کفریہ عقیدہ کا حامل ہے۔

ماضی میں ایسی کئی جماعتیں گزری ہیں جن کے اندر حد سے زیادہ غلو کا مرض موجود تھا اور اس میں بہت سے افراد اپنے افراط و تفریط کی وجہ سے کئی موجبات کفر کے بھی مرتکب تھے لیکن جب جماعت کی مجموعی حیثیت کسی کفریہ عقیدہ کا حامل نہ تھی تو جمہور اُمت اس کے تمام افراد کو کافر کہنے سے گریز کرتی رہی، خوارج کی علمی و عملی کوتاہیاں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں، بہت سی روایات میں ان کی بھرپور مذمت بھی کی گئی اور ان کے دین اسلام سے نکلنے کی پیش گوئی بھی دی گئی بلکہ بعض روایات میں ان کے کافر ہونے کی صراحت بھی موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ کئی محدثین کرام نے ان کو کافر قرار بھی دیا، خود امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی رجحان معلوم ہوتا ہے، لیکن جمہور فقہاء کرام نے ان کو کافر

کہنے سے ہمیشہ گریز ہی کیا۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے امام ابن المنذر رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ محدثین کے ساتھ اس بات میں کسی نے اتفاق نہیں کیا، جمہور فقہاء و محدثین کرام کے نزدیک خوارج (علی الاطلاق) کافر نہیں ہیں،[۱] حنابلہ میں سے علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بھی جمہور فقہاء اور کثیر محدثین کا یہی مؤقف نقل فرمایا۔[۲]

****

[۱] فتح القدير ،كتاب السير، باب البغاة،ج٦ ص ١٠٠.

[۲] المغني لابن قدامة ،كتاب قتال أهل البغي،ج٨ ص ٥٢٤.

باب رابع

- فصل اوّل، کفر اور تکفیر میں فرق اور اس کی وضاحت
- کفر کے تین مختلف موجبات اور اس کی مکمل تفصیل
- ضروریاتِ دین کی تعریف، تعداد اور تفصیلی تعارف
- ضروریاتِ دین کے انکار کرنے اور اس میں تاویل کرنے کا حکم
- ہر قطعی شرعی حکم کا انکار کرنا کفر ہے یا ضروریاتِ دین میں سے ہونا ضروری ہے؟ تفصیلی اور تحقیقی بحث
- قول و عمل کے موجب کفر بننے کی تحقیق
- تکفیر کے باب میں نہایت جامع اور مکمل ضابطہ

موجبات کفر و تکفیر کی منضبط بحث

اس بحث میں دو الفاظ (یعنی کفر اور تکفیر) کا استعمال زیادہ ہے اس لئے بحث شروع کرنے سے پہلے ان دونوں کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

کفر اور تکفیر میں فرق اور اس کی وضاحت

کفر کی تعریف باب اوّل میں تفصیل سے گزر چکی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفر دین اسلام یا اس کے قطعی اور یقینی احکام کے تصدیق نہ کرنے کا نام ہے، جو شخص دل سے دین اسلام کی تصدیق نہ کرے، اس کو حق اور سچ نہ مانے وہ کافر ہے، اور تکفیر کا معنیٰ ہے کسی کو کافر قرار دینا۔

دونوں الفاظ میں فرق واضح ہے گویا کفر کا تعلق اس شخص کے ساتھ ہے جو دین اسلام کی تصدیق نہیں کر رہا لیکن تکفیر اس کا فعل نہیں، بلکہ یہ دین حق کے حدود کی حفاظت کرنے والے ان حضرات علماء کرام کی ذمہ داری ہے جو کسی بھی شخص کے قول و فعل کو شریعت کے تراوز میں تول کر اس کے مطابق حکم شرعی بتانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں کہ فلاں کافر ہے۔

اگر کوئی شخص دل ہی دل میں دین اسلام یا اس کی کسی قطعی ضروری عقیدے کا انکار کرے، لیکن اس کے کسی قول و فعل سے اس کی تائید نہ ہوتی ہو تو اگرچہ شرعاً وہ کافر ہو گا اور اگر اسی حالت میں اس کا انتقال ہوا تو آخرت میں اس کے ساتھ کافروں کا سا معاملہ کیا جائے گا، لیکن چونکہ دنیا میں شریعت کے احکام کا دار مدار ظاہر پر ہے، دل کے احوال جاننے کے لئے ہمارے پاس صرف یہی قول و فعل ہی وسائل تھے اس کے علاوہ کوئی قطعی راستہ ہمارے پاس موجود نہیں جس کو بنیاد بنا کر دو ٹوک انداز میں فیصلہ کیا جا سکے، اس لئے

محض پوشیدہ اعتقاد کو دنیوی احکام میں مدارِ حکم نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان و کفر کا دار و مدار دل پر ہے، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ایمان نام ہے دین اسلام کے تصدیق کا اور کفر اس کی تصدیق نہ کرنے کو کہا جاتا ہے، جبکہ تصدیق و تکذیب کا محل قلب ہی ہے، زبان و بیان کو محض اس کا ترجمان ہی کہا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جب وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو اس کے بعد کسی کو یقینی طور پر منافق کہنا بھی جائز نہیں، کیونکہ منافق نام ہی اس شخص کا ہے جو زبان سے اقرار کے باوجود صرف دل ہی دل میں کفر چھپائے رکھے اور دل میں کفر کے موجود ہونے کے ہمارے پاس کوئی یقینی ذرائع موجود نہیں۔

ان دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کفر او تکفیر دونوں کے وسائل واسباب میں بھی فرق واضح ہو گیا کہ کفر کا موجب صرف اعتقاد ہی ہے جبکہ تکفیر کا مدار کسی مکلف شخص کا قول یا فعل بھی ہو سکتا ہے، ذیل میں اسی کی مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

کفر کا موجب: اعتقاد

علم کلام کی اصطلاح میں اعتقاد اور عقیدہ اس پختہ یقین اور ناقابل تردید نظریہ کا نام ہے جس کا تعلق صرف دل و دماغ کے ساتھ ہو، عمل سے اس کا کوئی خاص واسطہ نہ ہو، اسلامی عقائد کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، ایک قسم ان عقائد کی ہے جس کو متکلمین "ضروریاتِ دین" کہتے ہیں اور ایک قسم اس کے علاوہ دیگر عقائد کی ہے، ان دونوں کے احکام یکساں نہیں بلکہ کچھ فرق ہے جس کو سمجھنے سے پہلے دونوں کی تعریف، مفہوم اور مصداق کو جاننا ضروری ہے۔

ضروریاتِ دین کی تعریف

"ضروریات" ضروری کی جمع ہے، ضروری لغت میں عام طور پر اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہ ہو، بلکہ کرنا لازم ہو، عام طور پر یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے لیکن مختلف فنون میں اس کا مفہوم بھی مختلف ہے۔

علم منطق کی اصطلاح میں ضروری کا مفہوم

علم منطق کی اصطلاح میں علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علم جو نظر و استدلال پر موقوف ہو اور دوسری قسم اس علم کی ہے جو نظر و استدلال کے بغیر ہی حاصل ہو جائے، پہلی قسم کو "نظری" اور دوسری قسم کو "ضروری" کہا جاتا ہے، اس اصطلاح کے مطابق ضروری سے مراد ان اُمور کا جاننا ہے جس کو جاننے کے لئے کسی غور و فکر کی ضرورت نہ ہو بلکہ یوں ہی حاصل ہو جائے۔

علم کلام کی اصطلاح میں ضروری کا مفہوم

علم کلام کے ماہرین نے اس کی دو قسم کی تعریفیں کی ہیں، بعض حضرات نے اس کی یہ تعریف فرمائی کہ اس سے مراد وہ علم ہے جس کے جاننے سے انسان کو کوئی چارہ کار نہ ہو، وہ چاہے نہ چاہے بہر حال اس کا علم حاصل ہو جائے جیسے بھوک و پیاس کہ انسان کی چاہت کے بغیر بھی اس کا احساس و ادراک ہو ہی جاتا ہے، اور اس کے مفہوم جاننے کے لئے کسی غور و فکر کی کوئی ضرورت نہیں، تو یہ علم ضروری ہے۔

دیگر متکلمین نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ جن اُمور کا علم انسان کی قدرت و اختیار میں نہ ہو تو وہ ضروری ہے، شیخ محمد تھانوی رحمہ اللہ نے ان دونوں قسم کی تعریف نقل

کرنے کے بعد فرمایا کہ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

ولا شكّ أنّه إذا لم يكن تحصيله مقدورا لم يكن الانفكاك عنه مقدورا وبالعكس، لأنّه لا معنى للقدرة إلّا التمكّن من الطرفين، فإذا كان التحصيل مقدورا يكون تركه الذي هو الانفكاك مقدورا وكذا العكس، أي إذا كان الانفكاك مقدورا يكون تركه الذي هو التحصيل مقدورا فمؤدّى العبارتين واحد.

"یہ یقینی بات ہے کہ جب اس کو حاصل کرنا اختیار میں نہیں ہے تو اس سے جدا رہنا بھی قدرت میں نہیں ہو گا، اسی طرح برعکس بھی ہے، کیونکہ قدرت تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ دونوں پہلو اختیار میں ہوں، لہٰذا جب حاصل کرنا قدرت میں ہے تو جدا رہنا بھی اختیار میں ہو گا اور جب جدا رہنا ممکن ہو گا تو حاصل کرنا بھی قدرت میں رہے گا، دونوں عبارتوں کا حاصل ایک ہی ہے۔"[۱]

دونوں تعریفوں کا حاصل یہ ہوا کہ جس بات کا علم فکر و نظر کے بغیر حاصل ہو جائے وہ ضروری ہے، لہٰذا اس تعریف کے مطابق حواسِ خمسہ سے حاصل ہونے والا علم ضروری ہے مثلاً زید کو کھڑا ہوتے دیکھا یا تلاوت کرتے ہوئے سنا، اب زید کے کھڑے ہونے یا تلاوت کرنے کا علم دیکھنے والے یا سننے والے کو حاصل ہوا لیکن اس کے حصول میں

[۱]کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، حرف الضاد، الضروری،ج۲ص۱۱۱٦.

اس کو کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑی، اب یہ علم ضروری ہے، اسی طرح باطنی حواس سے حاصل ہونے والے علم کا بھی یہی حکم ہے مثلاً زید کے سر میں تکلیف ہے اس کو اپنی تکلیف کا احساس ہوا، اس احساس میں اس کو کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑی، لہٰذا یہ علم بھی ضروری ہے۔

جن چیزوں سے انسان کا ہر وقت واسطہ رہتا ہے اس کا علم بھی چونکہ یوں ہی بلا کسب حاصل ہوتا ہے اس لئے وہ بھی ضروری کے ضمن میں داخل ہے، اسی طرح وہ بنیادی باتیں جو انسان کو خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں کسی سے سیکھنے سمجھنے کی ضرورت نہ ہو، مثلاً اس بات کا علم کہ دو اور دو مل کر چار بنتے ہیں، یہ ساری باتیں "ضروری" کے تحت داخل ہیں۔

ضروریاتِ دین کا مطلب

اس تفصیل کے مطابق "ضروریاتِ دین" کا مطلب یہ ہوا کہ دین کے وہ بنیادی مسائل و احکام جن کا علم اتنا عام و مشہور ہو کہ جس کے سمجھنے میں دلیل و برہان کی ضرورت نہ ہو بلکہ ہر خاص و عام کو معلوم ہو مثلاً نماز یا روزے کی فرضیت کا علم، ہر مسلمان کو اس کا علم ہے، قیامت کا قائم ہونا بھی ایسا ہی ایک مسئلہ ہے جس کا ہر عام و خاص مسلمان کو علم ہے، حضرات متکلمین نے بھی ضروریاتِ دین کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہیں۔

چنانچہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

والمراد "بالضروريات" على ما اشتهر في الكتب: ما علم كونه من دين محمد صلى الله عليه وسلم بالضرورة، بأن تواتر عنه واستفاض، وعلمته العامة، كالوحدانية، والنبوة، وختمها بخاتم الأنبياء، وانقطاعها بعده.

"ضروریات (دین) سے مراد وہ اُمور ہیں جن کا دین محمدی ﷺ سے ہونا بداہۃً معلوم ہو، یعنی حضور ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت اور اس حد تک مشہور ہو کہ عام لوگ بھی اس کو جانتے ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید، نبوت اور حضور ﷺ کی ختم نبوت۔"[۱]

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی ذکر کردہ یہ تعریف حقیقت میں تمام متکلمین کی ذکر کردہ تفصیلات کا خلاصہ ہے، اس تعریف سے ضروریاتِ دین کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے، البتہ اس کے متعلق مندرجہ ذیل چند ضروری مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے۔

ضروری سے حکم کا بدیہی ہونا ضروری نہیں؟

"ضروریاتِ دین" کی اصطلاح سمجھنے میں بعض اوقات یہ غلط فہمی پیش آجاتی ہے کہ یہاں ضروری بدیہی کے معنیٰ میں ہے، لہٰذا جو حکم بدیہی اور واضح ہو اُسی کے منکر کو کافر کہا جا سکتا ہے، جو حکم غور و فکر کے بغیر سمجھ نہ آسکے وہ چونکہ اس اصطلاح کے مطابق ضروری نہیں ہے، اس لئے اس کا منکر بھی کافر نہیں، اس نقطہ نظر کے مطابق صرف بدیہیات کا منکر کافر ہے اور جو احکام نظری ہیں ان کا منکر کافر نہیں۔

اس غلط فہمی کی اصل منشا یہی ہے کہ لفظ "ضروری" کو حکم کا صفت قرار دیا گیا اور اس کو بدیہی کے معنیٰ میں لیا گیا، حالانکہ یہاں "ضروری" کا تعلق ثبوت کے ساتھ ہے، اصل حکم کے ساتھ نہیں، یعنی جس حکم کا شریعت سے ثابت ہونا مندرجہ بالا معنیٰ کے مطابق ضروری ہو، وہ اس فہرست میں داخل ہو گا، اور جس حکم کا ثبوت اس درجے کا یقینی اور قطعی

---

[۱] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، ص: ۲.

نہ ہو، وہ ضروریاتِ دین میں بھی داخل نہیں، اس کا مفہوم صرف اسی قدر ہے، حکم کے بدیہی ہونے یا نظری ہونے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اگر حضرات متکلمین اور اُصولیین کی ذکر کردہ تمام مثالوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، کیونکہ ان حضرات نے "ضروریاتِ دین" کو سمجھانے کے لئے اپنی کتابوں میں جو جو مثالیں بیان فرمائی، ان میں سے اکثر مثالیں منطقی اصطلاح کے مطابق نظری ہی ہیں، مثلاً قیام قیامت، حشر اجساد۔ لیکن چونکہ شریعت اسلام میں اس کا ثبوت قطعی اور بالکل واضح ہے اس لئے اس کو بالاتفاق ضروریاتِ دین میں شمار کیا گیا ہے۔

علامہ کشمیری کی عبارت

متاخرین حضرات احناف میں سے امام العصر حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی اس غلط فہی کو دور فرمایا، آپ اپنی کتاب "اکفار الملحدین" میں تحریر فرماتے ہیں:

فالضرورة في الثبوت عن حضرة الرسالة، وفي كونه من الدين، لا من حيث العمل، ولا من حيث الحكم المتضمن، فقد يكون حديث متواتراً ويعلم ثبوته عنه صلى الله عليه وسلم ضرورة، ولابد، ويكون الحكم المتضمن فيه نظرياً من حيث العقل، كحديث عذاب القبر، ثبوته عنه صلى الله عليه وسلم مستفيض، وفهم كيفية العذاب مشكل.

"ضرورت یعنی بداہت سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ سے ثابت ہونے اور دینی حکم ہونے میں بدیہی ہو، عمل اور اصل حکم کے اعتبار سے بدیہی ہونا (کوئی) ضروری نہیں، بسا اوقات کوئی حدیث متواتر ہوتی ہے اور حضور ﷺ سے

بداہت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے لیکن جس حکم پر وہ مشتمل ہوتی ہے وہ عقل (ومنطق) کے لحاظ سے نظری ہوتا ہے مثلاً عذاب قبر کی حدیث کہ حضور ﷺ سے ثبوت مشہور ہے لیکن عذاب کی اصل کیفیت پہچاننا مشکل اور نظری ہے۔"[۱]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ "ضروریاتِ دین" میں لفظ "ضروری" سے مراد یہ ہے کہ اس کا ثبوت بدیہی ہو، اس کے لئے اس حکم کا فرض وواجب ہونا لازم ہے نہ ہی حکم کا بدیہی ہونا شرط ہے بلکہ صرف یہی کافی ہے کہ جس دلیل سے یہ حکم ثابت ہے، اس کا ثبوت بدیہی ہو۔

علامہ عثمانی کی واضح عبارت

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ مزید وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

والمراد حصول العلم الضروري بثبوته عن النبي صلي الله عليه وسلم لا كون الثابت ضروريا، وهذا العلم إنما يحصل بالتواتر-

"اصل مقصود کسی حکم کے ثبوت کا بدیہی طور پر معلوم ہونا ہے، ثابت شدہ حکم کا بدیہی ہونا ضروری نہیں، اور ثبوت میں بداہت کا درجہ تواتر کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔"[۲]

---

[۱] فتح الملهم، كتاب الإيمان، ج۱ ص۴۰۵.

[۲] إكفار الملحدين في ضروريات الدين،ص۳.

"ضروریاتِ دین" کیا ہیں؟

ضروریاتِ دین کی کوئی جامع ومانع فنی تعریف شریعت نے مقرر نہیں کی نہ ہی مخصوص عقائد و نظریات کو اس عنوان میں داخل قرار دیا ہے بلکہ یہ اہل سنت والجماعت کے متقدمین اور متاخرین حضرات متکلمین کی بنائی ہوئی ایک اصطلاح ہے کہ دین کا جو مسئلہ اس حد تک مشہور ہو جائے جو عوام و خواص کو بلا تکلف معلوم ہو، وہ ضروریاتِ دین کی فہرست میں داخل ہو جاتا ہے اور جو اس حد تک مشہور نہ ہو وہ ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اصطلاح کی بنیاد شہرت پر ہے، کسی مسئلہ کو اسلامی معاشرے میں عام ہونے سے ہی اس عنوان کے تحت جگہ ملتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا تعلق کسی مسئلہ کے بار بار تذکرہ کرنے اور چرچا کرنے سے ہے جو مسئلہ معاشرہ میں بار بار بیان کیا جاتا رہے، محراب و منبر سے اس کا تذکرہ ہوتا رہے تو ایک مدت کے بعد وہ سب لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے، اور اگر یہی صورت حال باقی رہی تو نئی نسلوں تک کو بھی وہ مسئلہ بلا تکلف معلوم ہو جاتا ہے یوں اس کو ضروریاتِ دین کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔

اور اگر اسی مسئلہ سے کسی دوسرے معاشرے میں پہلو تہی کی جاتی رہی، اور جن لوگوں کو معلوم ہے وہ اس کا تذکرہ اس حد تک نہ کریں، اور لوگوں کے درمیان شہرت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ اس سے بے خبر رہیں تو اس معاشرے میں اس مسئلہ کو ضروریاتِ دین کہنا اُصول کے مطابق درست نہیں ہو گا۔

ماحول اور زمانے کا اثر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ضروریاتِ دین" ہر علاقہ کی علمی فضا کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں، یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمارے قدماء متکلمین نے جس چیز کو

اپنے معاشرے کے لحاظ سے ضروری قرار دیا تھا، ہمارے ہاں بھی اس کی وہی حیثیت باقی رہے اور اس کی بناء پر تکفیر کی جائے، نہ ہی یہ کوئی لازم ہے کہ جس مسئلہ کو ایک مکمل دینی اور مذہبی معاشرے میں یہ مقام حاصل ہو وہ پوری دنیا میں اپنی یہی حیثیت برقرار رکھے اور ہر جگہ اس کو "ضروریاتِ دین" میں سے شمار کیا جائے، اگر کوئی اس کا انکار کرے یا اس میں نامناسب تاویل کرے تو فوراً ہی اس کو کافر قرار دیا جائے، کیونکہ ممکن ہے کہ جس معاشرے میں انکار یا تاویل کا یہ جرم کیا جارہا ہے، اس معاشرے میں اس مسئلہ کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو۔

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کی تصریح

علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قد یکون الشئی متواترا معلوما بالضرورۃ عند قوم دون غیرھم فیکفر من تواتر عندہ دون غیرہ-

"ایک چیز بعض اوقات بعض لوگوں کے لئے متواتر اور ضروری ہوتی ہے، دوسرے لوگوں کے حق میں اس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی، لہٰذا جس کے ہاں متواتر ہو وہ (اس کے انکار کرنے سے) کافر ہو جائے گا اور دوسرا کافر نہیں ہو گا۔"[۱]

ضروریاتِ دین کی اصطلاح میں غور کرنے سے بھی بظاہر علامہ ہیثمی کی بات کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ ضروری عام طور پر بداہت کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے جو کہ علم کی صفت ہے اور علم کے وسائل، مقدار اور کیفیت میں تمام لوگ یکساں شریک نہیں ہوتے

[۱] الفتح المبین بشرح الأربعین، شرح حدیث جبرئیل، ص:۱۵۸

بلکہ انسان کی فطرت، ذہانت اور ماحول وغیرہ مختلف عناصر کی وجہ سے اس میں خاصی تفاوت پائی جاتی ہے، لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو چیز ایک عالم دین کے لئے ضروری اور بدیہی کے درجہ میں ہو وہی چیز ایک عام مسلمان کو بھی اس حد تک معلوم ہو۔

حدیث حذیفۃ بن الیمان رضی اللہ عنہ

بعض احادیث سے بھی اس نکتہ کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ سیدنا حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

عن حذيفة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " يدرس الإسلام كما يدرس وشي الثوب، لا يدرى ما صيام ولا صدقة ولا نسك، ويسرى على كتاب الله عز وجل في ليلة فلا يبقى في الأرض منه آية، ويبقى طوائف من الناس: الشيخ الكبير، والعجوز الكبيرة، يقولون: أدركنا آباءنا على هذه الكلمة لا إله إلا الله فنحن نقولها " فقال صلة: فما تغني عنهم لا إله إلا الله لا يدرون ما صيام ولا صدقة ولا نسك؟ فأعرض عنه حذيفة رضي الله عنه فردد عليه ثلاثا كل ذلك يعرض عنه، ثم أقبل عليه في الثالثة، فقال:يا صلة، تنجيهم من النار،تنجيهم من النار، تنجيهم من النار"[١]

[١] ذكره الحاكم في المستدرك على الصحيحين وعلق عليه بقوله" هذا حديث صحيح على شرط مسلم، ولم يخرجاه "وأقرّه عليه الذهبي رحمه الله تعالىٰ، انظر المستدرك، كتاب الفتن والملاحم، رقم الحديث: ٨٦٣٦،ج٤ ص٥٨٧.

ترجمہ: "حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد گرامی نقل ہے کہ اسلام اس طرح مٹ جائے گا جس طرح کپڑے کا نقش و نگار مٹ جاتا ہے، کسی کو کچھ پتہ نہ ہو گا، روزہ کیا ہے؟ حج اور صدقہ کیا ہے؟ اور ایک رات میں قرآن مجید کو اُٹھایا جائے گا جس کی کوئی آیت زمین میں برقرار نہ رہے گی۔ لوگوں کی بعض جماعتیں باقی رہیں گی، ان میں جو بوڑھے مرد اور عورتیں ہوں گے، وہ کہیں گے کہ ہم نے اپنے والدین کو یہ کلمہ کہتے سنا، ہم بھی کہتے ہیں۔ صلہ رحمہ اللہ نے عرض کیا: جب انہیں روزہ، صدقہ، حج وغیرہ ضروری احکام کا علم نہ ہو تو محض کلمہ لا الہ الا اللہ اسے کیا فائدہ دے گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے اعراض اور حضرت صلہ رحمہ اللہ کے تین مرتبہ پوچھنے پر حضرت حذیفہ نے فرمایا: اے صلہ! یہ کلمہ انہیں جہنم سے نجات دے گا۔ تین مرتبہ یہ کلمہ دُہرایا۔"

یہ حدیث اگرچہ اکثر حضرات محدثین نے "کتاب الفتن" میں روایت فرمائی ہیں اور روایت کے سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری زمانے کی خبر ہے، لیکن بہرحال اس سے اتنی بات متحقق ہو جاتی ہے کہ نماز، روزہ اور صدقہ جیسے اہم اور بنیادی مسائل سے بھی لوگ ناواقف ہوں گے، زمانے کی بگڑی ہوئی صورت حال کی وجہ سے ان چیزوں کی ان کو کوئی خبر نہیں ہو گی، لیکن اس قدر "جہالت" کے باوجود بھی جب تک وہ توحید ورسالت کے قائل ہوں گے تو مسلمان ہی شمار ہوں گے اور جہنم سے ان کو نجات حاصل ہو جائے گی، حالانکہ نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ ضروریاتِ دین میں داخل بلکہ ان میں شاید سرِ فہرست ہیں۔

ضروریاتِ دین میں سے ہونے کیلئے فرض واجب ہونا کوئی ضروری نہیں

جیسا کہ سابقہ مباحث میں وضاحت کی گئی کہ متکلمین کی اصطلاح میں ضروریاتِ دین سے وہ مسائل مراد ہوتے ہیں جو عوام وخواص کو یکساں طور پر معلوم ہوتے ہیں، اس کے جاننے کے لئے کسی غور وفکر کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ کسی مسئلہ کی حیثیت فرض یا واجب کی ہو تب ہی وہ ضروریاتِ دین میں شامل ہو سکتا ہے ورنہ نہیں، یہ کوئی ضروری نہیں بلکہ جو مسئلہ بھی تواتر کے ساتھ ثابت ہو، جب وہ مسئلہ اتنا عام اور مشہور ہو جائے جس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی تو وہ ضروریاتِ دین میں سے بن جائے گا۔

لہٰذا اس کے مطابق اگر کوئی شخص مسواک کے مسنون ہونے کا انکار کرے تو بھی اس کو کافر کہا جائے گا، کیونکہ مسواک کی حیثیت اگرچہ فرض واجب کی نہیں ہے بلکہ ایک مسنون عمل ہے، لیکن چونکہ اس کا ثبوت قطعی ہے اور مشہور بھی ہے اس لئے اس کا انکار کفر ٹھہرا۔

علامہ کشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لا يريدون أن الإتيان بها بالجوارح لابد منه، كما يتوهم، فقد يكون استحباب شيء أو إباحته ضرورياً يكفر جاحده، ولا يجب الإتيان به، فالضرورة في الثبوت عن حضرة الرسالة، وفي كونه من الدين، لا من حيث العمل، ولا من حيث الحكم المتضمن -- السواك سنة، وإعتقاد سنيته فرض، وتحصيل علمه سنة، وجحودها كفر -

"متکلمین کا مقصود یہ نہیں کہ اس فعل کا کرنا بھی ضروری ہو جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات کسی عمل کا مستحب اور مباح ہونا بھی ضروری

ہوتا ہے جس کا منکر تو کافر ہوتا ہے لیکن اس کا کرنا ضروری نہیں ہوتا، لہٰذا ضرورت سے ثبوت میں اور دینی حکم ہونے میں ضرورت مراد ہے، عمل کرنے کے اعتبار سے اور نفس حکم کے اعتبار سے ضروری مراد نہیں، جیسا کہ مسواک سنت ہے لیکن اس کے مسنون ہونے کا عقیدہ رکھنا فرض ہے اور اس علم کو حاصل کرنا سنت ہے انکار کفر ہے۔"[۱]

"عوام" کا مفہوم

ضروریاتِ دین کی تعریف میں جو یہ قید لگائی گئی ہے کہ عوام بھی اس کو جانتے ہوں، اس میں عوام سے کون مراد ہے؟ کیا تمام اور ہر قسم کے عوام کا جاننا شرط ہے یا اس سے مخصوص عوام مراد ہے؟ یعنی ضروریاتِ دین میں سے ہونے کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ دیندار اور غیر دین دار ہر قسم کے عوام اس کو جانتے ہوں یا نہیں؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا تمام عوام کا جاننا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کوئی دینی مسئلہ اکثر عوام کو معلوم ہو لیکن بہت سے اس سے ناواقف بھی ہوں تو وہ مسئلہ ضروریاتِ دین میں سے ہو جائے گا یا نہیں؟

جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے تو اس کے متعلق واضح رہے کہ عوام سے ہر قسم کے عوام مراد نہیں، بلکہ اس سے مقصود وہ عوام ہیں جن کے اندر دینی شعور موجود ہو، دین اور علماء دین سے ان کا تعلق ہو، دین سے بے زار قسم کے عوام کا اس باب میں کوئی دخل نہیں، لہٰذا اگر کوئی مسئلہ بے دین عوام کو معلوم نہ ہو تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ضروریاتِ

[۱] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، ص۳ و ص٦ .

دین میں سے بھی نہ ہو، بلکہ اگر وہ مسئلہ تواتر کے ساتھ ثابت ہو، اہل علم اور دین سے تعلق رکھنے والے عوام کو اس مسئلہ کا علم ہو اور وہ اس کو دین کا مسئلہ سمجھتے ہیں تو وہ ضروریاتِ دین میں سے ہو جائے گا۔

علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وقوله فما القدر المعلوم من الدين بالضرورة؟ جوابه: أنه قد سبق ضابطه وهو أن يكون قطعيا مشهورا بحيث لا يخفى على العامة المخالطين للعلماء بأن يعرفوه بداهة من غير إفتقار إلى نظر واستدلال.

"رہا یہ سوال کہ ضروریاتِ دین کی مقدار کتنی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ پہلے اس کا ضابطہ ذکر ہو چکا ہے کہ (دین اسلام کا جو حکم) اس قدر قطعی اور مشہور ہو کہ علماء کرام سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں پر بھی مخفی نہ ہو، بلکہ وہ بھی بداہت کے ساتھ بغیر کسی دلیل وبرہان کے جان سکے، (وہ ضروریاتِ دین میں سے ہے)[۱]

اس عبارت میں لفظ" العامة "کے ساتھ "المخالطين للعلماء"کی قید بھی لگائی گئی جس سے معلوم ہوا کہ اس باب میں ہر قسم کے عوام داخل نہیں، بلکہ اس سے مراد عوام میں سے صرف وہی دیندار طبقہ ہے جن کو علماء کرام کی مجلس وصحبت نصیب ہو۔

کیا سب عوام کا جاننا ضروری ہے؟

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے کہ تمام عوام کا جاننا ضروری ہے یا بعض

---

[۱] الفتاوى الحديثية ، ص:۱٤۱.

کا جان لینا بھی کافی ہے؟ تو اس کے متعلق یاد رہے کہ سب عوام کا جان لینا کوئی شرط نہیں، بلکہ اکثریت کا علم بھی اس باب میں کافی ہے، لہٰذا اگر کوئی دینی مسئلہ اکثر عوام کو معلوم ہو، لیکن بعض عوام کو اس کا کوئی پتہ نہ ہو تو محض بعض عوام کے نہ جاننے کی وجہ سے اس مسئلہ کو ضروریاتِ دین سے نہیں نکالا جاسکتا۔

علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی "اکفار الملحدین" کے حاشیہ میں یہی لکھا:

"استفاض علمه حتى وصل إلى دائرة العوام، وعلمه كواف منهم لا أنّ كلامهم يعلمه وان لم يرفع لتعلم الدين رأسا وحرم توفيقه فان جهله كواف منهم لعدم رغبتهم فى تعلم الدين وعلمه كواف منهم فهوضروريّ-"

"ضروریاتِ دین وہ مسائل ہیں جن کا علم اتنا مشہور ہو گیا ہو کہ عوام تک بھی پہنچا ہو اور عوام میں سے بھی کافی حد تک لوگوں کو معلوم ہو، یہ کوئی ضروری نہیں کہ تمام عوام اس کو جانے چاہے وہ دین سیکھنے کے لئے کوئی اقدام نہ کرے۔ [١]

"ضروریاتِ دین" کی تعداد

جیسا کہ اُوپر تحریر کیا گیا ضروریاتِ دین کا کوئی واضح معیار شریعتِ مطہرہ نے مقرر نہیں فرمایا، بلکہ یہ حضرات متکلمین کی مخصوص اصطلاح ہے جس کی وضاحت پہلے ذکر ہوچکی، حضرات متکلمین نے تمام دینی احکام کے متعلق یہ تفصیل بیان نہیں کی کہ ان میں سے کون کونسے احکام اس فہرست میں داخل ہیں اور کون سے نہیں؟ نہ ہی ایسا کرنا کوئی زیادہ مفید ہے۔

---

[١] إكفار الملحدين، ص٢.

کیونکہ ان حضرات نے عام طور پر جو تعریف ذکر کی ہے جو "اکفارالملحدین" کے حوالے سے اُوپر ذکر ہوچکی، اس کے مطابق اس میں کوئی حصر نہیں، بلکہ ہر زمانے اور مختلف ماحول کے ساتھ ساتھ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اس لئے حصر بیان کرنا تو ممکن نہیں، تاہم تقریباً تمام کتابوں میں اس کی کچھ مثالیں بیان کی گئی، اگر ان تمام مثالوں کو یکجا جمع کیا جائے تو اس سے اس مبحث کے مزید بند دروازے کھل سکتے ہیں اوراس اصطلاح کے حوالے سے در پیش مشکلات کا حل بھی سامنے آسکتا ہے۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ کا ایک مفید مقالہ

آج سے باسٹھ (٦٢) سال پہلے سن ۱۳۷۴ھ میں محدث العصر حضرت علامہ محمد یوسف بَنّوری صاحب رحمہ اللہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے موضوع پر ایک مفید مقالہ تحریر فرمایا تھا، جو اِسی سال ہندوستان کے مشہور رسالہ "صدق" میں شائع ہوا تھا، اس مقالہ میں آپ نے "ضروریاتِ دین" کے موضوع پر بھی خاصی مفید بحث فرمائی تھی، اس مقالہ میں اُنہوں نے علمِ کلام اور اُصولِ فقہ کی متعدد کتابوں سے ان مثالوں کو جمع فرمایا تھا جن کو ضروریاتِ دین کی مثال کے طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

> "ضروریاتِ دین کی مثال میں علماءِ اُمت اپنی اپنی کتابوں میں دوچار مثالیں ذکر کردیتے ہیں۔ ناظرین کو یہ غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ ضروریاتِ دین بس یہی ہیں۔ آگے سلسلہ ختم ہوگیا، یہ چیز جے پوری صاحب کو پیش آرہی ہے۔ حالانکہ ان اکابر کا مقصود محض مثال پیش کرنا ہے، نہ استقصاء، نہ حصر، نہ تخصیص۔ اس غلط فہمی کے ازالے کے لئے ذیل میں ہم ان مثالوں کو ایک جگہ جمع کردیتے ہیں جو سرسری محنت سے مل سکیں۔ تاکہ اس مختصر فہرست سے خودبخود یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ مقصود تمثیل تھی نہ پوری فہرست۔

کتب فقہ، اُصول فقہ، کتب کلام اُصول حدیث میں ذیل کی مثالیں ملتی ہیں:

اثبات علم الٰہی، قدرت محیط، ارادہ کاملہ، صفت کلام قرآن کریم، قدم قرآن، قدم صفات باری، حدوث عالم، حشر اجساد، عذاب قبر، جزاء و سزا، رؤیت باری قیامت میں، شفاعت کبریٰ، حوض کوثر، وجود ملائکہ، وجود کراماً کاتبین، ختم نبوت، نبوت کا وہبی ہونا، مہاجرین وانصار کی اہانت کا عدم جواز، اہل بیت کی محبت، خلافت شیخین (رضی اللہ عنہما) پانچ نمازیں، فرض رکعات کی تعداد، تعداد سجدات، رمضان کے روزے، زکوۃ، مقادیر زکوۃ، حج، وقوف عرفات، تعداد طواف، جہاد، نماز میں استقبال کعبہ، جمعہ، عیدین، جواز مسح خفین، عدم جواز سب رسول، عدم جواز سب شیخین، انکار جسم، انکار حلول اللہ، عدم استحلال محرمات، رجم زانی محض، حرمت لبس حریر (ریشم پہننا) جواز بیع، غسل جنابت، تحریم نکاح امہات، تحریم نکاح بنات، تحریم نکاح ذوی المحارم، حرمت خمر، حرمت قمار۔ اس وقت یہ اکیاون مثالیں پیش کی گئی ہیں۔"[۱]

امام ابنِ حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے بھی ضروریاتِ دین پر کافی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور ضروریاتِ دین کی دو قسمیں بیان فرمائی: اعتقادی اور عملی، پھر اس کے بعد دونوں قسموں کی بہت سے مثالیں بیان فرمائی۔

اگر ان مثالوں کا حضرت بنّوری رحمہ اللہ کی مثالوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان میں سے بعض مثالیں تو وہی ہیں جو حضرت بنّوری کے کلام میں ذکر ہو چکی، لیکن بہت سی مثالیں ایسی بھی ہیں جو اس کلام میں مذکور نہیں ہیں، بلکہ تقریباً چالیس

[۱] احتساب قادیانیت، ج ١٦ ص ٢٤٤.

(۴۰) سے زائد اُمور وہ ہیں جن کو حضرت بَنّوری رحمہ اللہ نے ذکر نہیں فرمایا۔[۱] اگر ان دونوں حضرات کی ذکر کردہ مثالوں کو بھی یکجا جمع کیا جائے تو تقریباً سو (۱۰۰) تک تعداد پہنچ جاتی ہے۔

ضروریاتِ دین کے انکار کا حکم

یہاں تک "ضروریاتِ دین" کی جو تشریح کی گئی، اس کے بارے میں اُمت کے متکلمین اور مستند فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ اس طریقہ سے ثابت شدہ تمام شرعی احکام پر ایمان لانا لازم ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار کرنا یا اس میں تردد کرنا بھی کفر ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قد اختلف في تكفير المخالف بعد الاتفاق علي أن ما كان من أُصول الدين وضرورياته يكفر المخالف فيه.

"اُصول دین اور ضروریاتِ دین میں اختلاف کرنے والے کے کافر ہونے پر اتفاق ہے ان کے علاوہ دیگر مسائل میں اختلاف کرنے والے کی تکفیر میں اختلاف ہے۔"[۲]

علامہ ابو البقاء ایوب بن موسی الحنفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أما منكر شيء من ضروريات الدين فلا نزاع في إكفاره

"ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کے انکار کرنے کے کفر ہونے میں کوئی

---

[۱] الفتاویٰ الحديثية، مطلب فى أصول الدين، ص٢٦٦، ٢٦٧.

[۲] المسايرة في العقائد المنجية في الآخرة، ص٣٠٣.

اختلاف نہیں ہے"[۱]

علامہ قاضی عضد الدین رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

لا نكفر أحدا من أهل القبلة إلا بما فيه نفي للصانع-أو ما علم مجيئه ضرورة أو لمجمع عليه كاستحلال المحرمات.

"ہم اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہیں کرتے مگر باری تعالیٰ کے انکار کرنے کی وجہ سے یا ضروریاتِ دین کے انکار کرنے کی وجہ سے، یا اس امر کے انکار کرنے سے جس پر اجماع منعقد ہو۔"[۲]

امام ابن حجر الہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اعلم أن التردد في المعلوم من الدين بالضرورة كالإنكار-

"جان لو: ضروریاتِ دین میں تردد کرنا بھی انکار کرنے کی طرح ہے۔"[۳]

ضروریاتِ دین میں اپنی طرف سے تاویل کرنے کا حکم

اسی طرح ضروریاتِ دین کا جو مفہوم امت کے درمیان متوارث چلا آرہا ہو، اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، بلا دلیل متواتر مفہوم کو چھوڑ کر اپنی طرف سے کوئی تاویل و توجیہ کرنا بھی الحاد و زندقہ ہے۔

مثلاً قرآن و سنت کے متواتر نصوص سے عقیدہ "ختم نبوت" واضح طور پر ثابت

[۱] الكليات ، فصل الكاف، مصطلح "كفر" ص: ٧٦٥.

[۲]المواقف، الفرقة السابعة المشبهة،ج٣ص٧١٧.

[۳]الفتاوى الحديثية لابن حجر الهيثمي،ص: ١٤٢.

ہوتا ہے اور اُمت کے درمیان اس کا مفہوم بھی بالکل سادہ اور بے غبار طریقہ سے تواتر کے ساتھ متوارث چلا آرہا ہے، اب اگر کوئی شخص ان نصوص کے ہوتے ہوئے ختم نبوت کا انکار کرے تو وہ کافر ہے، کیونکہ وہ ضروریاتِ دین کا منکر ہے اور ضروریاتِ دین کا انکار یقیناً کفر ہے۔

اسی طرح اگر کوئی دعوی کرے کہ میں ان نصوص کو بالکل درست تسلیم کرتا ہوں، اور ان نصوص کے مطابق حضور ﷺ یقینا خاتم النبیین ہیں، لیکن اس کے بعد "ختم نبوت" کے متواتر و متوارث مفہوم میں اپنی طرف سے توجیہات شروع کرے اور ظلی، بروزی وغیرہ کی بے جا تاویل کرتا پھرے تو یہ بھی کافر ہے، کیونکہ جس طرح ان نصوص کے الفاظ متواتر اور قطعی ہیں، بعینہ اسی طرح اس کا مفہوم و مصداق بھی متواتر ہے جو اُمت کے درمیان قرنِ اوّل سے آج تک متوارث چلا آرہا ہے۔

علامہ ابن الوزیر الیمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا خلاف في كفر من جحد ذلك المعلوم بالضرورة للجميع وتستر باسم التأويل فيما لا يمكن تأويله كالملاحدة في تأويل جميع الأسماء الحسنى بل جميع القرآن والشرائع والمعاد الأخروي من البعث والقيامة والجنة والنار

"جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی حکم کا انکار کرے اور ناقابل تاویل مسائل میں تاویل کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو چھپائے تو اس کے کافر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، جیسے ملحدین جو اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء حسنی میں تاویل کرتے

ہیں بلکہ پورے قرآن مجید، دین اور آخرت کے اُمور میں تاویل کا سہارا لیتے ہیں۔"[۱]

اکفار الملحدین کا خلاصہ

امام العصر حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ خاص اس مسئلہ کے متعلق "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" کے نام سے ایک پوری تحقیقی کتاب تحریر فرمائی ہے جس پر ہندوستان کے اکابر علماء کی تقریظات موجود ہیں، اس کتاب کے آخر میں خود مؤلف رحمہ اللہ کتاب لکھنے کی وجہ بیان فرمائی جو در حقیقت پوری کتاب کا خلاصہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

أن التصرف في ضروريات الدين، والتأول فيها، وتحويلها إلى غير ما كانت عليه، وإخراجها عن صورة ما تواترت عليه كفر، فإن ما تواتر لفظاً أو معنى، وكان مكشوف المراد، فقد تواتر مراده، فتأويله رد للشريعه القطعية، وهو كفر بواح، وإن لم يكذب صاحب الشرع، وإنه ليس فيه إلا الإستتابة.

"ضروریاتِ دین میں تصرف و تاویل کرنا اوراس کے متواتر اور اُمت کے درمیان معروف مفہوم سے نکال کر دوسری طرف پھیرنا کفر ہے، کیونکہ جو چیز لفظی یا معنوی لحاظ سے متواتر ہو اور اس کا معنیٰ بھی واضح ہو تو بس اس کا معنیٰ مراد بھی متواتر ہو گیا، اب اس کے بعد اس کی تاویل کرنا در حقیقت شریعت کے قطعی

[۱] إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات،ج۱ ص ۳۷۷.

حکم کو رد کرنا ہے جو کہ صریح کفر ہے۔" [۱]

ضروریاتِ دین کے علاوہ قطعی احکام کے انکار کا حکم اور فقہاء کرام کا مؤقف

متکلمین حضرات عام طور پر جب یہ بحث ذکر کرتے ہیں کہ کن اُمور کے انکار سے کوئی کافر ہو جاتا ہے اور کونسے ایسے اُمور ہیں جن کے انکار سے کسی کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا؟ تو اس میں یہ قید بھی ذکر فرماتے ہیں کہ شریعت کا جو حکم قطعی ہو اور وہ "ضروریاتِ دین "میں سے بھی ہو، اس کا انکار کفر ہے۔

اس قید کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر شریعت کا کوئی حکم اُصولی طور پر تو قطعی ہو لیکن وہ ضروریاتِ دین کے قبیل سے نہ ہو تو اس کا انکار فسق و گمراہی تو ہے لیکن محض اس کی بنیاد پر کسی کو کافر قرار دینا درست نہیں، چنانچہ شریعت کے بہت سے احکام کا یہی حال ہے کہ وہ اپنے ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے قطعی ہیں لیکن عوام میں مشہور نہ ہونے کی وجہ سے کسی نے ان کو "ضروریاتِ دین" کی اصطلاح میں داخل نہیں فرمایا، اس لئے اس کی بناء پر تکفیر بھی درست نہیں ہونی چاہئے۔

مذاہبِ اربعہ میں سے بعض فقہاء احناف کے علاوہ اکثر فقہاء کرام کی ذکر کردہ تفصیلات و جزئیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن بہت سے فقہاء احناف نے اس قید کو غیر ضروری قرار دیا ہے اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ جب شریعت کا کوئی حکم اُصولی طور پر قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہو تو اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس کا انکار کرنا کفر ہے جس کی وجہ سے انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، اگرچہ یہ حکم اصطلاحی طور پر

---

[۱] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، خاتمة، ص۱۲۸.

ضروریاتِ دین میں داخل نہ ہو۔

چنانچہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أما ما ثبت قطعا ولم يبلغ حد الضرورة كاستحقاق بنت الابن السدس من البنت بإجماع المسلمين فظاهر كلام الحنفية الإكفار بجحده لأنهم لم يشترطوا سوي القطع في الثبوت.

"جو بات قطعی طور پر ثابت ہو مگر "ضرورۃ" کی حد تک نہ پہنچی ہو۔۔ تو احناف کے کلام کا مقتضی یہ ہے کہ ان جیسے احکام کا انکار بھی کفر ہے کیونکہ ان کے نزدیک قطعی ثبوت کے علاوہ تکفیر کے لئے کوئی شرط نہیں ہے۔"[۱]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ اس مؤقف کو ذکر کرنے کے بعد اسی کو ترجیح دی اور لکھا کہ دلیل کے اعتبار سے یہ مؤقف مضبوط ہے۔[۲]

علامہ بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

الحق أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة إلا بإنكار متواتر من الشريعة عن صاحبها فأنه يكون حينئذ مكذبا للشرع وليس مخالفة القواطع مأخذ التكفير، وإنما مأخذه مخالفة القواعد السمعية القطعية طريقا و دلالة. وعبر بعض الأصوليين عن هذا بما معناه أن من أنكر طريق إثبات الشرع لم يكفر كمن أنكر

---

[۱]المسايرة، الخاتمة: ص۳۰۰

[۲] إكفار الملحدين، مقدمة، ص:۷

الإجماع، ومن أنكر الشرع بعد الاعتراف بطريقة كفر، لأنه مكذب-

"حق بات یہ ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہا جائے، مگر یہ کہ وہ ایسے حکم کا انکار کرے جو صاحب شریعت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو، کیونکہ تواتر کے ساتھ ثبوت کے بعد وہ شریعت کی تکذیب کرنے والا بن جائے گا۔"[۱]

جن فقہاء کرام کے نزدیک صرف ضروریاتِ دین کا انکار کفر ہے

اس کے برعکس بعض حضرات نے تکفیر کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ذکر فرمائی کہ جس چیز کے انکار کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جا رہا ہو، وہ "ضروریاتِ دین" میں سے بھی ہو، اگر کوئی شخص کسی ایسے حکم شرعی کا انکار کر بیٹھے جو اُصولی لحاظ سے تو قطعی ہو، لیکن "ضروریاتِ دین" میں سے نہ ہو تو محض اس کے انکار سے کوئی کافر نہیں ہو گا۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأما الفقهية فالقطعية منها وجوب الصلوات الخمس والزكاة والحج والصوم وتحريم الزنا والقتل والسرقة والشرب، وكل ما علم قطعا من دين الله فالحق فيها واحد وهو المعلوم والمخالف فيها آثم. ثم ينظر فإن أنكر ما علم ضرورة من مقصود الشارع كإنكار تحريم الخمر والسرقة ووجوب الصلاة والصوم فهو كافر؛ لأن هذا الإنكار لا يصدر إلا عن مكذب بالشرع، إن

[۱] المنثور في القواعد الفقهية، حرف الكاف، الكفر، ۳/ ۹۱

علم قطعا بطريق النظر لا بالضرورة ككون الإجماع حجة وكون القياس وخبر الواحد حجة وكذلك الفقهيات المعلومة بالإجماع فهي قطعية فمنكرها ليس بكافر لكنه آثم مخطئ. [۱]

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد بطورِ خلاصہ ذکر کرتے ہیں کہ:

الحاصل أن المذهب عدم تكفير أحد من المخالفين فيما ليس من الأصول المعلومة من الدين ضرورة.

"خلاصہ یہ ہے کہ اصل مذہب کے مطابق ضروریاتِ دین کے علاوہ مسائل میں اگر کوئی اختلاف کرے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔" [۲]

متاخرین حضرات فقہاء کرام نے اس قید کو مزید اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فقہاء شافعیہ میں سے امام رافعی رحمہ اللہ اجماعی حکم کے انکار کرنے والے کو کافر قرار دیا، کیونکہ اجماعی حکم قطعی ہوتا ہے اور قطعی کا انکار کفر ہے، اس لئے مزید کوئی شرط نہیں لگائی کہ وہ حکم ضروریاتِ دین میں سے بھی ہو، تو علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس اطلاق کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ بڑی وضاحت کے ساتھ یہ تحریر فرمایا کہ یہ حکم تب ہی ہوگا جب کہ وہ حکم ایسا ہو جو عوام اور خواص کے درمیان مشہور ہو، ورنہ صرف اجماع ہونے (یا قطعی ہونے) کی وجہ سے کسی کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا۔

---

[۱] المستصفى،القطب الرابع، الفن الأول، النظر الثاني، ص: ٣٤٨.

[۲] البحر الرائق مع منحة الخالق، كتاب الصلاة،باب الإمامة،ج١ ص٣٦٤.

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قلت: أطلق الإمام الرافعي القول بتكفير جاحد المجمع عليه، وليس هو على إطلاقه، بل من جحد مجمعا عليه فيه نص، وهو من اُمور الإسلام الظاهرة التي يشترك في معرفتها الخواص والعوام، كالصلاة، أو الزكاة، أو الحج، أو تحريم الخمر، أو الزنا، ونحو ذلك، فهو كافر. ومن جحد مجمعا عليه لا يعرفه إلا الخواص، كاستحقاق بنت الابن السدس مع بنت الصلب، وتحريم نكاح المعتدة، وكما إذا أجمع أهل عصر على حكم حادثة، فليس بكافر، للعذر، بل يعرف الصواب ليعتقده. ومن جحد مجمعا عليه، ظاهرا، لا نص فيه. ففي الحكم بتكفيره خلاف يأتي – إن شاء الله تعالىٰ – بيانه في باب الردة- [۱]

سابقہ تفصیلات کا حاصل

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حضرات متکلمین اور فقہاء کرام سے دونوں قسم کی عبارات ملتی ہیں ، بعض عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ کسی شخص کو اس وقت ہی کافر کہا جاسکتا ہے، جب وہ ضروریاتِ دین میں سے کسی حکم کا انکار کر بیٹھے جب کہ بعض دیگر عبارات میں یہ عموم ملتا ہے کہ شریعت کا جو بھی حکم اس حد تک ثابت ہو کہ شارع ﷺ سے اس کا ثبوت اور اپنے مفہوم پر دلالت کرنے میں وہ بالکل محکم اور قطعی ہو تو اس

[۱] روضة الطالبين وعمدة المفتين، كتاب الجنائز،باب تارك الصلاة،ج۲ص ۱٤٦.

کا انکار کرنا کفر ہے، اگرچہ وہ ضروریاتِ دین کی حد تک مشہور نہ ہو۔

قولِ فیصل

مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر بظاہر یہی مؤقف راجح معلوم ہوتا ہے کہ نفس تکفیر کے لئے ضروریاتِ دین میں سے ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی امر شرعی اُصولی اصطلاح کے مطابق قطعی الثبوت والدلالۃ ہو تو اس کا انکار بھی کفر ہے، اگرچہ وہ ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو، تاہم تکفیر سے پہلے مخاطب کو مسئلہ کی حقیقی صورت حال سمجھانا ضروری ہے جیسا کہ علامہ ابن ہمام، علامہ ابن حجر اور علامہ کشمیری رحمہم اللہ علیہم کے حوالہ سے پہلے ذکر کیا جاچکا۔

پہلی وجہ: اساسِ تکفیر موجود ہے

ایمان و کفر کا دار مدار دل کی تصدیق وعدم تصدیق یا تکذیب کرنے پر ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حکم شرعی کا انکار کفر ہو، یہاں تک کہ اس میں قطعی اور غیر قطعی کی تفریق بھی قرین عقل نہیں، اسی طرح متواتر طریقے پر ثابت ہونے اور نہ ہونے کی تمیز بھی قیاساً درست نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن حجر الہیثمی رحمہ اللہ اور علامہ بن الہمام نے بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھا آپ ﷺ کے دربار اقدس میں حاضر تھا، وہ آپ ﷺ کے کسی بھی قول کا انکار کرے تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا لیکن بعد کے ادوار میں ہر حکم کا انکار موجب کفر نہیں رہا بلکہ کم از کم متواتر ہونا ضروری ہے۔

دونوں کے انکار میں فرق یہی ہے کہ دربارِ اقدس میں حاضر شخص یقیناً حضور ﷺ

ہی کے ارشاد کا انکار کررہا ہے جو خود اس نے آپ ﷺ سے سنا اور بعد کے زمانے میں مختلف واسطے آجانے کی وجہ سے تواتر کے بغیر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ حکم خود حضور ﷺ نے ہی دیا تھا، اس لئے "الیقین لایزول بالشک" کے تقاضے کے مطابق اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔[۱]

اس اُصول کا تقاضا یہ ہے کہ مطلقاہر حکم شرعی کا انکار کفر ہو لیکن چونکہ ہم تک احکام شریعت پہنچنے میں متعدد واسطے بھی درمیان میں آگئے ہیں، احکامِ شرعیہ کا نزول و صدور ہم نے براہ راست نہیں دیکھا، بلکہ نقل در نقل ہوتے ہوئے ہم تک پوری شریعت پہنچی، جس کے مختلف درجات ہیں مثلاً خبر واحد، خبر مشہور اور خبر متواتر وغیرہ۔

ہمارے پاس شریعت اسلام کے پہنچنے کے یہ مختلف درجات ہیں، نقل کی ان تمام صورتوں میں سے بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جس کے بارے میں سو فیصد یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں حکم حضرت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

واضح رہے کہ ثقہ اور بااعتماد راویوں کی نقل کرنے کی وجہ سے بہر حال غالب گمان حاصل ہو ہی جاتا ہے جو وجوبِ عمل کے لئے کافی ہے، کوئی بھی شخص اپنے معاشرتی زندگی میں بھی ہر بات کے لئے یقین ہی کو معیار نہیں بناتا بلکہ بسا اوقات ایک دو نیک لوگوں کی بات سن کر بھی اکثر لوگ مطمئن ہو ہی جاتے ہیں اور اسی کے مطابق کام کرنے لگتے ہیں، یہی حال شرعی احکام کا بھی ہے کہ بہت سے احکام یقینی دلائل سے ثابت ہیں اور عملی مسائل کے لئے

---

[۱] الفتاویٰ الحدیثیة، مطلب فی أصول الدین، ۲۶۷، والمسامرة مع المسایرة، الخاتمة في بحث الإیمان، ص:۲۹۹.

یقین کو معیار نہیں بنایا گیا بلکہ غالب گمان اور اطمینان بخش دلائل کو بھی اس باب میں قبول کیا گیا ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے یہ بات واضح کی گئی کہ تکفیر کے باب میں ظن غالب کافی نہیں، کیونکہ جس شخص کی تکفیر کی جارہی ہے، پہلے سے اس کا مسلمان ہونا بالکل یقینی ہے، تو اس یقینی اسلام کو یقینی کفریہ عمل ہی کی وجہ سے ختم کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس باب میں غالب گمان یقین کے برابر نہیں۔

"ضروریاتِ دین" کی قید لگانے کی اصل وجہ

حضرات متکلمین اور فقہاء کرام کی بعض عبارات سے بھی یہی علت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ثم ينظر فإن أنكر ما علم ضرورة من مقصود الشارع كإنكار تحريم الخمر والسرقة ووجوب الصلاة والصوم فهو كافر؛ لأن هذا الإنكار لا يصدر إلا عن مكذب بالشرع، وإن علم قطعا بطريق النظر لا بالضرورة ككون الإجماع حجة وكون القياس وخبر الواحد حجة وكذلك الفقهيات المعلومة بالإجماع فهي قطعية فمنكرها ليس بكافر لكنه آثم مخطئ.

"اگر کسی نے ایسے مقصود شرعی کا انکار کیا جو ضروریاتِ دین میں سے تھا مثلاً شراب اور چوری کی حرمت کا انکار، نماز روزے کے وجوب کا انکار، تو وہ کافر ہے، کیونکہ ایسا انکار شریعت کی تکذیب کرنے والے سے ہی صادر ہو سکتا ہے اور اگر کسی ایسے حکم کا انکار کیا کہ جو قطعاً تو ثابت ہو، مگر ضروری کی حد تک نہ پہنچا ہو، مثلاً اجماع کی حجیت، قیاس اور خبر واحد کی حجیت یہ اور ان کے علاوہ دیگر فقہی

مسائل جن پر اجماع ہے، تو ان اُمور کا منکر کافر نہیں ہو گا تاہم گناہگار اور خطاکار ضرور ہے۔"[۱]

خط کشیدہ قید سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام اور خواص کے درمیان مشہور ہونے کی قید اس لئے لگائی جاتی ہے کہ تکذیب شرع کا ہونا متیقن ہو جائے، کیونکہ اگر شریعت کا حکم اس حد تک مشہور نہ ہو تو اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ شارع کی تکذیب نہیں کر رہا اور ظاہر ہے کہ تکفیر کے باب میں توشبہات کا بڑا دخل ہے، اس لئے ضروریاتِ دین میں سے ہونے کی قید لگائی جاتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ معاشرے میں اتنا مشہور ہو کہ عوام و خواص اس کو برابر جانتے ہوں، تو اس کا انکار در حقیقت شریعت ہی کا انکار تصور ہو گا۔

اس تفصیل سے قطعیت کی قید کا فائدہ تو واضح ہوا لیکن ضروریاتِ دین میں سے ہونے کی کوئی اس طرح مضبوط بنیاد معلوم نہیں۔

دوسری وجہ: قطعی اور ضروری کے درمیان اصل فرق

جن احکام کو ضروریاتِ دین کہا جاتا ہے، ان میں قطعی احکام کے مقابلے میں یہ صفت زائد پائی جاتی ہے کہ وہ عوام اور خواص کے درمیان مشہور ہوتے ہیں، اور عام طور پر ہر دیندار شخص کو اس کا حکم شرعی ہونا معلوم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عام طور پر حضرات متکلمین قطعی اور ضروریاتِ دین کے درمیان عموم و خصوص من وجہ کی نسبت قرار دیتے ہیں، قطعی اعم مطلق ہے اور ضروری اخص، ہر ضروری قطعی ہے لیکن ہر قطعی حکم کا ضرویات دین میں سے ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ کوئی حکم تب ہی ضروریاتِ دین کی فہرست میں جگہ

---

[۱] المستصفی، القطب الرابع، الفن الأول فی الاجتهاد، ص: ۳۴۸.

پا سکتا ہے جب وہ قطعی ہونے کے ساتھ ساتھ خواص اور دیندار عوام میں مشہور بھی ہو۔

معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان اسی ایک نکتہ میں فرق ہے جبکہ شہرت کا یہ فرق کوئی ایسی منضبط بنیاد نہیں ہے جس پر ہر حال میں کفر کے پورے باب کا مدار رکھا جا سکے۔

تیسری وجہ:

جن حضرات نے ضروریاتِ دین اور غیر ضروریات کے درمیان اس مسئلہ میں تفریق کی ہیں، ان کے کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا منشا یہ نہیں ہے کہ تکفیر ہر حال میں ضروریاتِ دین کے انکار کے ساتھ خاص ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی حکم کا انکار کر بیٹھے تو اتمام حجت اور تبلیغ احکام سے پہلے اس کی تکفیر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ گویا ان حضرات کے کلام میں جس تکفیر کو ضروریاتِ دین کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ تبلیغ احکام سے پہلے انکار کرنے والے کے کفر کا فیصلہ کیا جائے۔

اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ جو حکم عوام اور خواص کے درمیان اس قدر مشہور ہو کہ جس کے لئے کسی زیادہ علم و فہم کی بھی ضرورت نہ ہو بلکہ معاشرے کا ہر عالم و جاہل اس کو جانتا ہو، اگر کوئی شخص ایسے حکم کا انکار کر گزرتا ہے تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ شریعت کا قطعی حکم ہے، عوام و خواص اور پورے معاشرے میں شہرت کے باوجود علم نہ ہونے کا دعویٰ مکابرہ ہی ہے جو قابل قبول نہیں۔

علامہ احمد بن محمد حموی حنفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

الجهل بالضروريات في باب المكفرات لا يكون عذرا بخلاف غيرها، فإنه يكون عذرا على المفتى به كما تقدم والله أعلم.

"تکفیر کے باب میں ضروریاتِ دین سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں بخلاف دیگر

مسائل کے کہ مفتی بہ قول کے مطابق ضروریاتِ دین کے علاوہ مسائل میں جہل عذر ہے۔"[۱]

اس کے برعکس جو احکام قطعی ہوں لیکن معاشرے میں ان کو شہرت کا ایسا مقام حاصل نہ ہو، اس کا معلوم نہ ہونا البتہ عذر بن سکتا ہے کیونکہ ایمان کے لئے تمام احکام کی تفصیلی تصدیق تو ضروری ہے نہیں بلکہ صرف اجمالی تصدیق بھی کافی ہے اور جب حکم بھی ایسا غیر معروف ہو تو کم از کم تکفیر کے باب میں، جہاں کمزور احتمال کی موجودگی میں بھی احتیاط کا حکم دیا جاتا ہے، یہ عذر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

علامہ مرتضی یمانی رحمہ اللہ کی عبارت

علامہ مرتضی ابن الوزیر الیمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

أن المتواترات نوعان: أحدهما: ما عَلِمَهُ العامة مع الخاصة، كمثل كلمة التوحيد، وأركان الإسلام، فيكفُرُ جاحده مطلقاً، لأنه قد بلغه التنزيل، وإنما رده بالتأويل، وإن لم يعلم هو ثبوت ما جحده من الدين بسبب ما دخل فيه من البدع والشُّبه التي ربما أدت إلى الشك في الضرورات، ودفع العلوم والحجة على التكفير بذلك مع الشكِّ قوله تعالىٰ: {لقد كفر الذين قالوا إن الله ثالثُ ثلاثةٍ} والمعلوم أنهم ما قصدوا تكذيب عيسى، بل

[۱] غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر، كتاب السير، باب الردة، قبيل كتاب اللقيط واللقطة،ج۲ص۲۰۷.

قصدوا تصديقه، ويدل على هذا التعليل بالبلوغ، وعلى أن الجهل قبله عذرٌ لا بعده قوله تعالى: {ذلك أنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ مهلكَ القُرى بظُلْمٍ وأهلُها غافلون} وهي من أوضح الأدلة على ذلك ولله الحمد.

وثانيهما: ما لا يعرف تواتره إلاَّ الخاصة، فلا يُكفرُ مستحلُّه من العامة، لأنه لم يبلُغه، وإنما يكفر من استحلَّه وهو يعلم حرمته بالضرورة، مثل: تحريم الصلاة على الحائض إلى أمثالٍ لذلك كثيرة، وقد شرب الخمر مُستحلاً متأولاً قُدامة بن مظعون الصحابي البدري فجلده عمر، ولم يقتله ويجعل ذلك رِدّةً، وأقرت الصحابة عمر على ذلك، وكان شبهته في ذلك قوله تعالى بعد آية الخمر في المائدة: { لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا } فدلَّ على أنَّ الشُّبهة قد تدخلُ في بعض الضروريات. [١]

ترجمہ: "متواتر کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم وہ ہے جسے خواص و علماء کے ساتھ ساتھ عوام الناس بھی جانتے ہوں جیسا کہ کلمہ توحید اور اسلام کے دیگر بڑے ارکان۔ چنانچہ ان اُمور کا منکر کافر ہے، کیونکہ قرآن مجید اسے پہنچا ہے اور انہوں نے باطل تاویل کر کے اسے ردّ کر دیا۔ اگرچہ یہ انکار ضروریات دین میں شبہات

[١]العواصم والقواصم في الذب عن سنة أبي القاسم، الفصل الثالث: في الإشارة إلى حُجة من كفَّر هؤلاء، ج٤ ص ١٧٣.

یا بدعات کی وجہ سے کیوں نہ ہو۔ جس کی وجہ سے بسا اوقات انکار کی نوبت نہیں آتی ہے، علم اور حجت شک کی بنیاد پر ختم ہو کر اس کی وجہ سے تکفیر سے لاعلمی پیدا ہوتی ہے۔(اس عذر کی وجہ سے بھی کوئی تکفیر سے نہیں بچتا) چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "بے شک کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تینوں میں ایک ہے۔" یہ بات واضح ہے کہ نصاریٰ نے حضرت عیسی علی نبینا وعلیہ السلام کی تکذیب کا ارادہ نہ کیا تھا بلکہ ان کی تصدیق کا ارادہ کیا تھا (اس کے باوجود وہ کافر بن گئے۔) اس کی وجہ یہ ہے کہ حق بات ان کو پہنچی تھی، حق بات پہنچنے سے پہلے وہ معذور سمجھے جاسکتے تھے نہ کہ بعد میں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے "ہم کسی قوم کو کسی گناہ، ظلم پر اس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک وہ بے خبر ہو۔"

متواتر کی دوسری قسم وہ ہے جسے صرف خواص (علماء) جانتے ہوں، چنانچہ عوام الناس میں جو اس حرام کو حلال کہے اسے لاعلمی کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیا جاتا، کیونکہ حرام کو حلال سمجھنے والا تب کافر ہوتا ہے جب باوجود علم کے اسے حلال سمجھے۔ مثلاً حیض کی حالت میں نماز کا حرام ہونا اور جیسا کہ قدامہ بن مظنون بدری صحابی نے شراب کو تاویل کی بنیاد پر حلال سمجھ کر پیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوڑوں کی سزا دی، تاہم انہیں مرتد ٹھہرا کر قتل نہ کیا، اور تمام صحابہ نے بھی اس فیصلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اتفاق کیا۔ ان کے شبہ کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ تھی "لیس علی الذین "الخ معلوم ہوا کہ بعض ضروریات دین میں بھی کبھی کبھار بعض لوگوں کو شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

چوتھی وجہ

جیسا کہ سابقہ تفصیلات سے واضح ہو چکا کہ ضروریاتِ دین کا کوئی جامع ومانع معیار شریعت مطہرہ نے مقرر نہیں فرمایا، جن حضرات فقہاء کرام یا متکلمین نے اس پر بحث فرمائی ہیں، اُنہوں نے بھی اپنے زمانے اور معاشرے کے دینی اور علمی فضا کو دیکھ کر اسکی وضاحت کی۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم متکلمین نے ضروریاتِ دین کی جو مثالیں ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے بعض ایسے بھی مثالیں موجود ہیں جو آج کل بہت سے علم دوست لوگوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہتی ہیں، اور اسی بناء پر اس کو موجودہ زمانے میں ضروریاتِ دین میں سے شمار کرنا بھی اہل علم کے لئے ایک قابل غور نکتہ ہے۔ لہٰذا تکفیر جیسے اہم باب کو اس پر موقوف کرنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے۔

پانچویں وجہ: قطعی اور ضروری مترادف ہیں یا نہیں؟ تحقیقی مبحث

بہت سے مستند فقہاء کرام اور معتمد متکلمین نے "قطعی" کو "ضروری" کے مترادف قرار دیا ہے، ان حضرات کا مؤقف یہ ہے کہ شریعت کا جو حکم بھی ثبوت اور دلالت دونوں کے اعتبار سے قطعی ہو وہ ضروریاتِ دین میں سے بھی ہے، اور اس کا حکم بھی ضروریاتِ دین والا ہی ہے کہ اگر کوئی اس کا انکار کرے یا اس کے متوارث مفہوم کے خلاف کوئی بے جا تاویل کرے تو کافر ہو جائے گا۔

وہ حضرات جن کے نزدیک قطعی اور ضروری مترادف الفاظ ہیں:

علامہ ابوالشکور سالمی رحمہ اللہ

علامہ ابوالشکور السالمی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قال أهل السنة والجماعة شرائط الإيمان مايجب الإيمان به ولايصح بدونه ويكفر بالإنكار والرد وهو كل ماثبت بالنص أو بالمتواتر أو بإجماع الأمة فإنه يوجب القبول والاعتقاد به-[۱]

"اہل سنت والجماعت نے کہا کہ ایمان کی شرائط وہ ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس کے بغیر ایمان درست نہیں ہوتا، اس کے رد کرنے اور اس سے انکار کرنے کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے، اور (اس معنیٰ میں ایمان کی شرائط میں) ہر وہ حکم داخل ہے جو نص، یا متواتر یا اجماع امت سے ثابت ہو کیونکہ اس کو قبول کرنا اور اس کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔"

قاضی عیسیٰ بن ابان

امام محمد رحمہ اللہ کے مایہ ناز شاگرد رشید اور بصرہ کے دوررس اور عمیق النظر فقیہ و قاضی عیسیٰ ابن ابان رحمہ اللہ حدیث متواتر کا حکم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قال عيسى رحمه الله: والعلم بهذه الأشياء علم اضطرار وإلزام، لما ذكرنا من جملة هذه الشرائع، ردا على النبي عليه السلام كأنه سمع النبي عليه السلام يقول ذلك فرده عليه، فيكون بذلك كافرا، خارجا عن ملة الإسلام، لأن العلم كان علم ضروري، كالعلم بالمحسوسات والمشاهدات، وكالعلم بأنه قد كان قبلنا في هذه الدنيا قوم، وأن الموجودين أولاد أولئك،

[۱]تمهيد أبي شكور السالمي، القول الرابع في شرائط الإيمان، ص۹۸.

وكالعلم بأن السماء كانت موجودة قبل ولادتنا، وما جرى مجرى ذلك.[۱]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ تواتر سے علم اضطراری وبدیہی حاصل ہو جاتا ہے اور متواتر امر محسوس ومشاہد اشیاء کی طرح یقینی ہوتی ہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی اس کا انکار کرے تو گویا اس نے خود حضور ﷺ کی بات سنی اور پھر اس کی تردید کر دی، تو اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

حضرت شاہ عبد العزیز کا مؤقف

برصغیر کے مشہور فقیہ ومحدث حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ضروريات الدين عندهم منحصرة فی ثلاثة:

۱- مدلول الكتاب بشرط أن يكون نصا صريحا لايمكن تأويله كتحريم الخمر والميسر وإثبات العلم والقدرة والإرادة و الكلام له تعالىٰ وكون السابقين الأولين من المهاجرين والأنصار مرضيين عند الله تعالى و أنه لايجوز إهانتهم والاستخفاف بهم.

۲-مدلول السنة المتواترة لفظا أو معنا سواء كان من الاعتقاديات أومن العمليات وسواءكان فرضا أو نفلا

[۱]الفصول في الأصول،باب ذكر وجوه الأخبار ومراتبها وأحكامها،ج۳ص۳۵.

كوجوب محبة أهل البيت من الأزواج والبنات والجمعة والعيدين.

۳- والمجمع عليه إجماعا قطعيا كخلافة الصديق والفاروق و نحو ذلك، ولا شبهة أن من أنكر أمثال هذه الأُمور لم يصح إيمانه بالكتاب والنبيين- [۱]

"خلاصہ عبارت: "ضروریاتِ دین تین ہیں:

۱۔ کتاب اللہ کا مدلول بشرطیکہ صریح نص ہو جس میں تاویل ممکن نہ ہو جیسے شراب اور جوا کا حرام ہونا، اللہ تعالیٰ کیلئے علم، قدرت، اراہ اور کلام ثابت کرنا، پہلے مہاجرین وانصار کا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ ہونا اور یہ کہ ان کی توہین اور تذلیل جائز نہیں۔

۲۔ سنت متواترہ کا لفظاً اور معنیٰ مدلول ہو، چاہے اس کا تعلق اعتقادی مسائل کے ساتھ ہو یا عملی مسائل کے ساتھ، چاہے فرض ہو یا نفل جیسے اہل بیت یعنی حضور ﷺ کے ازواج وبنات کی محبت کا ضروری ہونا، جمعہ اور عیدین۔

۳۔ قطعی اجماع سے ثابت شدہ مسائل جیسے حضرت صدیق وفاروق رحمہ اللہ کی خلافت، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو کوئی ان جیسی چیزوں کا انکار کرے تو کتاب اللہ اور انبیاء کرام پر اس کا ایمان درست نہیں ہوتا۔"

---

[۱] فتاوى عزيزي، ص: ۳۹۷.

علامہ کشمیری کا مؤقف

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "إکفار الملحدین فی ضروریات الدین" میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس عبارت کو نقل فرما کر یہی مؤقف اپنایا کہ ہر قطعی حکم ضروری بھی، ہے کیونکہ ضروری کا مفہوم یہی ہے کہ شارع سے اس کا ثبوت اتنا محکم ہو کہ جس میں مزید خوض وکلام کی ضرورت پیش نہ آئے بلکہ جو شخص بھی شریعت کا معتقد ہو، اس کے نزدیک اس حکم کا ثبوت گویا بالکل بدیہی ہو۔

اور ظاہر ہے کہ جو حکم ثابت ہونے کے لحاظ سے بھی قطعی ہو، اپنے مفہوم ومدلول پر دلالت کرنے کے اعتبار سے بھی بالکل قطعی ہو اس میں دیگر احتمالات موجود نہ ہوں، تو ایسے حکم کو یہی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

علامہ بنوری کی تحقیق

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

> "جو چیز متواتر ہو جائے وہ دین میں "ضروری" ہو جاتی ہے، کیونکہ متواتر کا افادہ علم ضروری قطعی مسلمات میں سے ہے۔ پس اگر کسی کو علم ہو جائے کہ یہ حدیث احادیث متواترہ میں سے ہے یا یہ بات حدیث متواتر سے ثابت ہے تو اس پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق کائنات ماضیہ سے ہو یا مغیبات مستقبلہ سے، خواہ عقائد کے متعلق ہو خواہ احکام کے بارے میں ہو، تصدیق رسالت کے لئے اس سے چارہ نہیں، ورنہ تکذیب رسول کا کفر ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ بہر حال تصدیق رسول کا ایمان کے لئے ضروری ہونا اور تکذیب

سے کفر کا لازم آنا یہ خود دین کی ضروریات میں داخل ہے۔"[۱]

ایک بنیادی اشکال اور اس کا حل

اس مؤقف پر اگرچہ یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ شریعت کے قطعی احکام کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے بہت سے احکام ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ ہر فرد کا کوئی واسطہ پیش نہیں آتا، ممارست نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات اس میں بہت غموض پایا جاتا ہے جس کے نہ جاننے میں عوام معذور ہیں، تو اس کے باوجود ان کو کافر کیسے قرار دیا جائے؟

لیکن اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اس دوسرے مؤقف اختیار کرنے والوں نے یہ شرط لگائی کہ جو شخص کسی ایسے قطعی حکم کا انکار کرے، تو پہلے اس کو بتلایا جائے کہ جس حکم کا آپ انکار کر رہے ہو، یہ شریعت کا ہر لحاظ سے قطعی حکم ہے وغیرہ وغیرہ، اس کے بعد بھی اگر وہ انکار ہی پر مصر رہا تو یقیناً یہ ایک حکم شرعی ہی کا انکار تصور ہو گا جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

حنفیہ کے مؤقف کی توجیہ محققین کی نظر میں

علامہ ابن الہمام کی توجیہ

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ حنفیہ کے اس مؤقف کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ویجب حمله على ما إذا علم المنكر ثبوته قطعا لأن مناط

---

[۱] عقیدہ نزول مسیح، ص۲۱۔

التكفير، وهو التكذيب أو الاستخفاف عند ذلك يكون أما إذا لم يعلم فلا إلا أن يذكر له أهل العلم ذلك فيلج- [۱]

ضروری ہے کہ اس قول کو اس صورت پر حمل کیا جائے جبکہ خود منکر کو بھی اس حکم کے قطعیت کے ثابت ہونے کا علم ہو، کیونکہ تکفیر کا دار مدار (جو کہ یا تکذیب ہے یا استخفاف) تبھی متحقق ہو سکتا ہے، اگر منکر کو اس درجہ ثبوت کا علم نہ ہو تو تکفیر کرنا درست نہیں، البتہ اگر اہل علم اس کو بتائے اور پھر وہ انکار پر اصرار کرتا رہے (تو پھر البتہ تکفیر کی جائے)۔

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کی توجیہ

علامہ احمد بن حجر الہیثمی رحمہ اللہ نے احناف کے مؤقف کا یہی محمل بیان فرمایا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

ولا يكفر بإنكار قطعي غير ضروري كاستحقاق بنت الابن السدس مع بنت الصلب، وظاهر كلام الحنفية كفره ويجب حمله أي بناء على قواعدهم على منكر علم أنه قطعي وإلا فلا يكفر إلا إذا ذكر له أهل العلم أنه من الدين، وأنه قطعي، فتمادى فيما هو عليه عنادا فيكفر لظهور التكذيب منه حينئذ كما دل عليه كلام إمام الحرمين.

---

[۱] كذا في المسايرة في العقائد المنجية في الأٰخرة، الخاتمة في بحث الإيمان، ص:۳۰۰ و كذلك في حاشية ابن عابدين على الدر المختار (كتاب الجهاد، باب المرتد، ج ٤ ص۲۲۳.

"حنفیہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قطعی غیر ضروری حکم کا انکار بھی موجب کفر ہے، لیکن خود ان کے قواعد کے مطابق اس بات کو اس صورت پر حمل کرنا ضروری ہے کہ جہاں انکار کرنے والے کو اس حکم کے قطعی ہونے کا علم ہو ورنہ تو اس کو کافر نہیں کہا جائے گا الّا یہ کہ اہل علم اس کو بتادیں کہ یہ دینی حکم ہے اور قطعی ہے اور اس کے بعد بھی وہ اپنے انکار پر ہٹ دھرمی کے ساتھ اصرار کرے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا کیونکہ اس صورت میں اس سے تکذیب سرزد ہوئی جیسا کہ امام الحرمین نے ذکر فرمایا ہے۔[۱]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إن إنكار القطعي كفر، ولا يشترط أن يعلم ذلك المنكر قطعيته ثم ينكر فيكون بذلك كافراً على ما يتوهمه الخائلون، بل يشترط قطعيته في الواقع، فإذا جحد شخص ذلك القطعي استتيب، فإن تاب وإلا قتل على الكفر، وليس وراء الاستتابة مذهب كما قال القائل: وليس وراء الله للمرء مذهب.

"قطعی حکم کا انکار کرنا کفر ہے اور اس میں یہ کوئی شرط نہیں کہ انکار کرنے والے کو اس حکم کا قطعی ہونا معلوم بھی ہو اس کے بعد انکار کرے جیسا کہ خیال کرنے والوں کا وہم ہے، بلکہ کسی حکم کا حقیقت میں قطعی ہونا ہی کافی ہے، جب کوئی شخص اس جیسے قطعی حکم کا انکار کرے گا تو اس سے توبہ طلبی کی جائے

[۱] الفتاوى الحديثية، مطلب: أصول الدين، ص: ٢٦٣

گی، اگر توبہ کی تو بہت اچھا ورنہ قتل کیا جائے گا۔"[۱]

علامہ محمد زاہد الکوثری کی توجیہ

علامہ کوثری رحمہ اللہ نے قراءات متواترہ اور اس کے انکار کرنے کے متعلق ایک مختصر سا مقالہ لکھا، اس میں انکار کے حکم میں یہ تفصیل لکھی کہ قراءات کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم ان متواتر قراءات کی ہے جو متواتر ہونے کے ساتھ ساتھ جمہور اہل اسلام کو معلوم بھی ہیں اور دوسری قسم ان قراءات کی ہے جو اگرچہ سنداً تو متواتر ہے مگر اتنی مشہور نہیں کہ عام اہل اسلام کو معلوم ہو سکے، پھر ان دونوں قسموں کے انکار کا حکم لکھتے ہوئے تحریر فرمایا:

فإنكار شيئ من القسم الأول كفر بالاتفاق و أما الثاني فإنما يعدّ كفرا بعد إقامة الحجة على المنكر وتعنّته بعد ذلك-

"پہلی قسم قراءات کا انکار تو بالاتفاق کفر ہے اور دوسری قسم کی قراءات کے انکار کو تب کفر کہا جا سکتا ہے جبکہ انکار کرنے والے کے سامنے دلیل قائم کی جائے (کہ یہ قراءات متواتر ہے) اور اس کے بعد بھی وہ ہٹ دھرمی کرے (اور متواتر قراءات کا انکار کرے)"[۲]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جس طرح ضروریاتِ دین کا انکار کفر ہے، اسی طرح اس شرعی حکم کا انکار کرنا بھی کفر ہے جو تواتر کے ساتھ شریعت سے ثابت ہو، تاہم دونوں

---

[۱] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، ص: ۳۳.

[۲] مقالات الكوثرى، ص۲۱.

میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کا انکار تو مطلقاً کفر ہے اور دوسری قسم احکام کے انکار کو تب تک کفر نہیں قرار دیا جائے گا جب تک منکر کے سامنے حجت قائم نہ کی جائے، جب اس کو تسلی بخش طریقے سے اصل حقیقت حال سے آگاہ کر دیا جائے تو اگر اس کے بعد بھی وہ خدانخواستہ انکار ہی پر قائم رہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

علامہ ابن الہمام، علامہ ہیثمی اور علامہ کشمیری رحمہم اللہ علیہم کی مندرجہ بالا عبارات سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات نے جو صورت بیان فرمائی ہے اس میں صرف فقہاء حنفیہ ہی کا یہ مؤقف نہیں بلکہ دیگر فقہاء کرام کا بھی اس پر اتفاق ہے کیونکہ اتمام حجت کے بعد متواتر چیز کے انکار پر اصرار کرنا در حقیقت تکذیب رسالت ہے جس کا کفر ہونا اور اس کا بنائے تکفیر ہونا شاید خود ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

چھٹی وجہ: تواتر علمِ ضروری کے لئے مفید ہے

متواتر کے بارے میں ابتداء سے اختلاف چلا آرہا ہے کہ آیا یہ مفید یقین ہے یا نہیں ؟ اور اگر مفید یقین ہے تو یہ یقین کس درجہ کا ہے؟ اصطلاحی الفاظ میں یہ یقین نظری ہے یا ضروری؟

خبرِ متواتر کے متعلق جمہور اُمت کا مؤقف

جمہور اُمت کا ہمیشہ سے یہ مؤقف رہا ہے کہ خبر متواتر مفید یقین ہے، اس کا مفہوم قطعی اور یقینی ہوتا ہے اور یقین بھی "ضروری" ہے، یہاں ضروری کا معنٰی یہ ہے کہ اس میں غور و فکر کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ جوں ہی تواتر کا علم ہو جائے تو ساتھ ہی یقین حاصل ہو جاتا ہے اس میں مزید مقدمات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

واضح رہے کہ ان جیسے مباحث میں اُصولیین "ضروری" کی اصطلاح استعمال

فرماتے ہیں لیکن اس کا یہ معنیٰ نہیں ہوتا ہے کہ یہ حکم بدیہی ہے بلکہ ان حضرات کے بحث کا موضوع "کسی حکم کا ثبوت" ہے اور جہاں یہ اُصول بیان کرتے ہیں کہ متواتر سے حاصل شدہ علم ضروری ہے تو اس کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ثبوت ایسا یقینی ہے جیسا کہ آنکھ، کان وغیرہ حواس خمسہ سے حاصل شدہ بات کا علم ہو، اور اس میں مزید کلام کرنے کی ضرورت نہ ہو۔

علامہ صفی الدین ہندی

علامہ صفی الدین الہندی رحمہ اللہ نے اس پر کافی تفصیل سے بحث فرمائی ہے کہ تواتر مفید یقین ہے اور یہ یقین ضروری ہے استدلالی نہیں، بعض حضرات نے تواتر سے حاصل شدہ علم کو جو نظری قرار دیا ہے، ان کا مؤقف درست نہیں بلکہ حق یہی ہے کہ اس سے حاصل شدہ علم ضروری ہے۔ اس باب میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

> اختلف القائلون بأن التواتر يفيد العلم، اختلفوا في أن ذلك العلم ضروري أو نظري؟ فذهب الجمهور من الفقهاء والمتكلمين من الفريقين إلى أنه ضروري وهو الحق، وذهب الكعبي وأبو الحسين البصري من المعتزلة والدقاق منا إلى أنه نظري وهو قول إمام الحرمين، لأنه جعل العلم الحاصل عقيبه من باب العلم المستند إلى القرائن-

> "جو حضرات تواتر کو مفید علم مانتے ہیں، ان کا آپس میں اختلاف ہے کہ اس سے حاصل شدہ علم ضروری ہے یا نظری؟ دونوں فریقوں کے جمہور فقہاء و متکلمین کے نزدیک یہ علم بدیہی ہے اور یہی حق مذہب ہے، جبکہ معتزلہ میں سے کعبی، ابو الحسین بصری اور اہل سنت میں سے علامہ دقاق کا مؤقف یہ ہے کہ یہ علم نظری ہے، حضرت امام الحرمین کا بھی یہی قول (معلوم ہوتا) ہے کیونکہ اس نے

تواتر سے حاصل ہونے والے علم کو ان علوم میں سے قرار دیا ہے جو کہ قرائن سے حاصل ہوتے ہیں۔"[۱]

علامہ عبد العلی رحمہ اللہ، علامہ بہاری رحمہ اللہ کے کلام کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

مسئلة: الجمهور على أن ذلك العلم الحاصل من المتواتر ضروري غير متوقف علي النظر حاصل بالعادة.

"جمہور کے نزدیک تواتر سے حاصل ہونے والا علم ضروری (بدیہی) ہوتا ہے جو کہ نظر واستدلال کے بغیر یوں ہی عام عادت کے مطابق حاصل ہوتا ہے۔"[۲]

امام غزالی رحمہ اللہ وغیرہ بعض حضرات سے اس مسئلہ میں جو اختلاف منقول ہے، علامہ عبد العلی رحمہ اللہ نے مندرجہ بالا عبارت کے بعد اس اختلاف میں ایک مناسب تطبیق بھی دی ہے۔

جن حضرات نے شریعت کے ہر قطعی حکم کو "ضروری" قرار دیا ہیں جن کی عبارات پہلے ذکر کی جاچکی، اُصولیین حضرات کی ان تفصیلات سے ان حضرات کی فی الجملہ تائید ہوتی ہے۔

ساتویں وجہ: فقہاء کرام کی تصریحات

بہت سے حضرات فقہاء کرام اور متکلمین نے اُصولی بحث کے دوران کفر کی بنیاد

[۱] نهاية الوصول في دراية الأصول، المسئلة الثالثة، ص: ۲۷.

[۲] فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، الأصل الثاني :السنة، ج۲ص۱۳۹.

قطعیات کے انکار پر رکھی، اور یہ قید نہیں لگائی کہ کسی قطعی کا انکار تب ہی موجب کفر ہو گا جب وہ ضروریاتِ دین میں سے بھی ہو، حالانکہ اگر ان حضرات کے کلام کا تتبع کیا جائے تو فی الجملہ اس قید کے یہ حضرات بھی قائل ہیں اور متعدد مسائل کی تفصیل کرتے ہوئے یہ قید لگائی بھی ہے۔

ان حضرات کے اس طرز عمل سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ کفر کی اصل بنیاد شریعت کے کسی قطعی الثبوت والدلالۃ حکم کا انکار کرنا ہے اور بس۔ جہاں تک ضروریاتِ دین میں سے ہونے کی شرط ہے تو اس کا اضافہ صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان جیسے احکامات کے مشہور ہونے کی وجہ سے منکر کے لئے عذر کی کوئی گنجائش نہیں رہ پاتی، جس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے۔

اس قسم کی چند عبارتیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں۔

علامہ بدرالرشید کی تصریح

۱۔ فقہاءِ احناف میں سے علامہ بدرالرشید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فی المحیط: من أنكر الأخبار المتواترة في الشريعة كفر مثل حرمة لبس الحرير علي الرجال.

"جو شخص شرعی احکام کے باب میں متواتر احادیث کا انکار کرے وہ کافر ہے جیسا کہ کوئی مردوں کے لئے ریشم پہننے کی حرمت کا انکار کرے۔"[۱]

---

[۱]كتاب ألفاظ الكفر للعلامة البدرالرشيد مع شرح الإمام علي القاري ، ص۱۱۸.

۲۔ فتاویٰ ہندیہ میں خبر متواتر، مشہور اور خبر واحد کا حکم بیان کیا گیا جس سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اصل موجب تکفیر تواتر کا انکار ہی ہے۔

چنانچہ اس میں لکھا ہے:

ومن أنكر المتواتر فقد كفر، ومن أنكر المشهور يكفر عند البعض، وقال عيسى بن أبان: يضلل ولا يكفر، وهو الصحيح ومن أنكر خبر الواحد لا يكفر غير أنه يأثم بترك القبول هكذا في الظهيرية.

"جو متواتر امر کا انکار کرے وہ کافر ہے اور جو حدیث مشہور کا انکار کرے وہ بعض کے نزدیک تو کافر ہے لیکن قاضی عیسی ابن ابان نے فرمایا کہ کافر تو نہیں البتہ گمراہ ہے اور یہی قول صحیح ہے، جو شخص خبر واحد کا انکار کرے وہ بھی کافر تو نہیں البتہ اس کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے گناہگار ہو گا۔"[۱]

۳۔ علامہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وكذلك نقطع بتكفير كل من كذب وأنكر قاعدة من قواعد الشرع وما عرف يقينا بالنقل المتواتر من فعل الرسول ووقع الإجماع المتصل عليه كمن أنكر وجوب الصلوات الخمس و عدد ركعاتها وسجداتها ويقول إنما أوجب الله علينا في كتابه الصلاة على الجملة وكونها خمسا وعلى هذه الصفات والشروط

[۱] الفتاوى الهندية ، كتاب السير، الباب التاسع فى أحكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر،ج۲ص ۲٦٥.

لا أعلمه.

"ہم ہر اس شخص کی تکفیر پر جزم کرتے ہیں جو شریعت کے کسی قاعدے کی تکذیب وانکار کرے یا حضور ﷺ کے کسی ایسے فعل کا انکار کرے جو یقین و تواتر کے ساتھ ثابت ہو اور اس پر اجماع ہو چکا ہو، جیسا کہ کوئی پنج وقتہ نمازوں اور ان کی رکعات وسجدات کا انکار کر بیٹھے اور کہے کہ ہم پر تو صرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز فرض کی ہے، اس سے زیادہ باتیں (مثلاً پانچ وقت ہونا وغیرہ وغیرہ) میں نہیں جانتا۔" [۱]

۴۔ شیخ الاسلام تقی الدین بن دقیق العید الشافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والحق أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة، إلا بإنكار متواتر من الشريعة عن صاحبها، فإنه حينئذ يكون مكذبا للشرع، وليس مخالفة القواطع مأخذا للتكفير و إنما مأخذه مخالفة القواعد السمعية القطعية طريقا ودلالة.

"حق بات یہ ہے کہ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کی جائے مگر جب کوئی کسی دین کے ایسے حکم کا انکار کرے جو تواتر کے ساتھ صاحب شریعت ﷺ سے ثابت ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ شریعت کو جھٹلانے والا ہو گا۔" [۲]

---

[۱] الشفاء بتعريف حقوق المصطفى، فصل في بيان ما هو من المقالات كفر ، ج۲ ص۲۸۷.

[۲]إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام،كتاب اللعان، من وصف غيره بالكفر، ج۲ ص۲۱۰

۵۔ علامہ عبد الوہاب بن احمد شعرانی الشافعی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

الكفر هو التكذيب لأنه مخالفة نص مقطوع به أو مخالفة الإجماع، وفيهما جميعا تكذيب الرسول-

"کفر تکذیب ہی تو ہے کیونکہ (تکذیب کی طرح کفر بھی) قطعی نص اور اجماع کی مخالفت کو کہا جاتا ہے اوران دونوں صورتوں میں حضور ﷺ کی تکذیب ہوتی ہے۔" [۱]

۶۔ علامہ محمد علی ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

من قال بنبيّ بعد النبي عليه الصلاة والسلام أو جحد شيئا صح عنده بأن النبي صلى الله عليه وسلم قاله فهو كافر.

"جو کوئی نبی کریم ﷺ کے بعد دوسرے نبی آنے کو جائز سمجھے یا کسی ایسے دینی حکم کا انکار کرے جو اس کے نزدیک حضور ﷺ سے ثابت ہو تو وہ کافر ہے۔" [۲]

آٹھویں وجہ: ضروریاتِ دین کی تقسیم

امام تقی الدین سبکی اور امام ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے ضروریاتِ دین کی دو قسمیں بیان فرمائیں:

الف۔ ایک وہ اُمور جو ہر دین دار عوام اور خواص کو معلوم ہوں۔

ب۔ وہ مسائل جن کا علم خواص کو پوری طرح حاصل ہو لیکن عوام سے بعض

[۱] اليواقيت والجواهر في بيان عقائد الأكابر، ج۲ص۱۱۰.

[۲] الفصل في الملل والأهواء والنحل، ج۳ص ۱۴۲.

اوقات مخفی رہتا ہو۔

پہلی قسم کا حکم یہ بیان فرمایا کہ اس کا انکار مطلقاً کفر ہے، خدانخواستہ عوام انکار کریں تو بھی کافر، اور خواص انکار کریں تو بھی تکفیر کی جائے گی، لیکن دوسری قسم کا حکم یہ بیان فرمایا کہ اس کا انکار خواص کے حق میں تو موجب کفر ہے، کیونکہ خواص کے حلقہ تک اس کا علم ضروریات میں سے بن گیا۔

لیکن عوام اگر اس کا انکار کریں تو فوراً ان کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا، کیونکہ جب ان کو پوری طرح مسئلہ معلوم نہیں اور اس مسئلہ کے حکم شرعی ہونے سے وہ واقف نہیں ہیں تو ان کے انکار کو شارع ﷺ کی تکذیب پر محمول کرنا درست نہیں ہے، اس لئے اس کو پہلے تحقیق کرنے کا کہا جائے گا تاکہ "جہل" کا یہ عذر ختم ہو جائے۔

امام سبکی کی تفصیلی عبارت

امام تقی الدین سبکی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۵۶ھ) تحریر فرماتے ہیں:

لكني أنبه هنا على شيء وهو أن المعلوم بالضرورة من الشرع قسمان: أحدهما يعرفه الخاص والعام، والثاني: قد يخفى على بعض العوام، ولا ينافي هذا قولنا: إنه معلوم بالضرورة؛ لأن المراد أن من مارس الشريعة وعلم منها ما يحصل به العلم الضروري بذلك وهذا قد يحصل لبعض الناس دون بعض بحسب الممارسة وكثرتها أو قلتها أو عدمها فالقسم الأول من أنكره العوام أو الخواص فقد كفر؛ لأنه مكذب للنبي صلى الله عليه وسلم في خبره.....والقسم الثاني من أنكره من العوام

الذين لم يحصل لهم من ممارسته الشرع مما يحصل له به العلم الضروري وإن كانت كثرة الممارسة أوجبت للعلماء العلم الضروري بذلك، ومن هذا القسم عموم رسالته صلى الله عليه وسلم إلى الجن فإنا نعلم بالضرورة ذلك لكثرة ممارستنا لأدلة الكتاب والسنة وأخبار الأمة.

وأما العامي الذي لم يحصل له ذلك إذا أنكر ذلك فإن قيد الشهادة بالرسالة إلى الإنس خاصة خشيت عليه الكفر كما قدمته في أول هذه الفتوى، وإن أطلق الشهادة بأن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله ولم ينتبه؛ لأن إنكاره لعموم الدعوى للجن يخالف ذلك فلا أرى الحكم بكفره ولكن يؤدب على كلامه في الدين بالجهل ويؤمر بأن يتعلم الحق في ذلك لتزول عنه الشبهة التي أوجبت الإنكار. [ا]

ترجمہ: "شریعت کے واضح احکام کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم وہ ہے جسے ہر خاص وعام جانتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو بعض عوام کو معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ شریعت کے واضح احکامات سے خارج نہیں ہوتے۔ کیونکہ عوام سے مراد وہ عوام ہیں جو شریعت اور دین کے ساتھ لگاؤ رکھیں، ضروری احکام جاننے کی فکر کریں، چنانچہ لگاؤ کی کمی بیشی کی وجہ سے معلومات میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے۔

[ا] فتاوى السبكي، الدلالة على عموم الرسالة،ج٢ص٦٢١. وكذا فى الفتاوىٰ الحديثية، مطلب فى إيمان المقلد، ص٢٤٩.

لہذا پہلی قسم کا منکر خواص میں سے ہو یا عوام میں سے وہ کافر سمجھا جائے گا، کیونکہ ایسا شخص آپ ﷺ کی تکذیب کا ارتکاب کرتا ہے۔ متواتر کی دوسری قسم وہ ہے جس کا انکار بعض وہ لوگ کرتے ہیں جن کا دین کے ساتھ زیادہ لگاؤ نہ ہو، اگرچہ علماء کرام کے لئے وہ بھی واضح دینی حکم ہوتا ہے مثلاً آپ ﷺ کا جنات کی طرف بھی مبعوث ہونے کا عقیدہ کہ علماء کرام شریعت کے ساتھ زیادہ لگاؤ کی وجہ سے اسے بھی بالکل واضح سمجھتے ہیں۔ اگر عام شخص جسے اس کا علم نہ ہو اگر وہ اس کا انکار کرے تو یہ خطرناک بات ہے، تاہم اس کی وجہ سے اس کافر نہیں ٹھہرایا جاتا۔ لیکن کچھ سزا دینی ضروری ہے۔ (تاکہ آئندہ دین کے واضح مسائل کے بارے میں جاننے سے کوتاہی نہ برتی جائے۔)

"ضروریاتِ دین" کی اس تقسیم سے زیر بحث مسئلہ بالکل صراحت سے معلوم ہے کہ شریعت کے قطعی احکام کا انکار کفر ہے، تاہم تمام قطعیات کا علم ہر مسلمان پر فرضِ عین نہیں، اس لئے اگر کسی کو کسی ایسے حکم شرعی کا علم نہ ہو اور وہ اس کا انکار کر بیٹھے تو اس کو معذور سمجھا جائے گا اور اسی نکتہ کی خاطر حضرات متکلمین نے تکفیر کیلئے عام طور پر "ضروریاتِ دین" میں سے ہونے کی قید لگائی ہیں، ورنہ نفس تکفیر کے لئے اس قید کی کوئی اہمیت نہیں۔

لہذا اگر کسی شخص کو شریعت کا کوئی قطعی حکم معلوم ہے اور اس علم کے باوجود وہ اس کا انکار کر بیٹھے تو اس انکار کی وجہ سے وہ کافر ہو جائے گا، اگرچہ وہ حکم ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو، فقہاء کرام نے متعدد جزئیات میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔

نویں وجہ: اُصولیین کا ضابطہ

حضرات اُصولیین کی ذکر کردہ تفصیلات پر اگر مجموعی طور پر غور کیا جائے تو بھی

اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ شریعتِ اسلام کے تمام قطعی احکام کا انکار موجبِ کفر ہے، تاہم اگر کسی کو اس کا حکم شرعی ہونا معلوم نہ ہو تو اولاً اس کو سمجھایا جائے گا، اس کے بعد بھی اگر وہ انکار پر مصر رہا تو کافر قرار دیا جائے گا، کافر ہونے کے لئے صرف ضروریاتِ دین میں سے کسی حکم کا انکار کرنا ہی کوئی شرطِ لازم نہیں۔

اُصول فقہ میں مسئلہ تکفیر کی ضمنی مباحث

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ اُصول فقہ میں کفر کی بحث ضمنی طور پر مندرجہ ذیل مباحث کے تحت کی جاتی ہے:

۱. فرض اور واجب کے تحت۔

۲. سنت کی بحث میں۔

۳. اجماع کی بحث میں۔

فرض اور واجب کے درمیان فرق کی ضمن میں تکفیر کا مسئلہ

فقہاءِ احناف کے نزدیک فرض اور واجب دونوں مختلف اصطلاحات ہیں، دونوں کے ثبوت اور حکم میں فرق ہے، فرض کا ثبوت کتاب و سنت کے کسی ایسے قطعی دلیل سے ہوتا ہے جو ثبوت اور دلالت دونوں اُمور کے لحاظ سے قطعی ہو، جبکہ واجب کے لئے ایک طرح کی قطعیت بھی کافی ہے لہٰذا اگر کوئی نص صرف ثبوت یا صرف دلالت کے لحاظ سے قطعی ہو تو اس سے بھی وجوب ثابت ہو سکتا ہے، ثبوت کے لحاظ سے دونوں کے درمیان یہی فرق ہے۔

اور حکم کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ فرض کے انکار کو تمام احناف اُصولیین کفر قرار دیتے ہیں اور واجب کے انکار کو گمراہی اور فسق و فجور تو کہتے ہیں لیکن کفر نہیں بتاتے۔

امام سرخسیؒ

امام سرخسی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

الفرض اسم لمقدر شرعا لا يحتمل الزيادة والنقصان وهو

مقطوع به لكونه ثابتا بدليل موجب للعلم قطعا من الكتاب أو السنة المتواترة أو الإجماع---وحكم هذا القسم شرعا أنه موجب للعلم اعتقادا باعتبار أنه ثابت بدليل مقطوع به ولهذا يكفر جاحده--فما كان ثابتا بدليل موجب للعمل والعلم قطعا يسمى فرضا لبقاء أثره وهو العلم به أدى أو لم يؤد وما كان ثابتا بدليل موجب للعمل غير موجب للعلم يقينا باعتبار شبهة في طريقه يسمى واجبا.

"فرض شریعت کے اس مقررہ قطعی حکم کو کہا جاتا ہے جس میں کمی وزیادتی کا احتمال نہ ہو، کیونکہ وہ کتاب اللہ، سنت متواترہ یا اجماع کے کسی قطعی حکم سے ثابت ہوتا ہے۔اس کا حکم یہ ہے کہ یہ اعتقاد کی حد تک بھی یقین کا فائدہ دیتا ہے اس لئے اس کا منکر کافر ہو گا۔۔لہٰذا جو حکم بھی ایسی دلیل سے ثابت ہو جو قطعی طور پر علم و عمل کا موجب ہو تو اس کو فرض کہا جائے گا، کیونکہ اس کا لازمی اثر یعنی علم بر قرار رہتا ہے چاہے عملی طور پر اسکی ادا بجالائی جائے یا نہیں۔۔"[۱]

حنفیہ ہی میں سے ایک اور مشہور اُصولی امام بزدوی رحمہ اللہ نے اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ فرض اور واجب کے درمیان اس فرق کی وضاحت کی، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

أما الفرض فحكمه اللزوم علما وتصديقا بالقلب، وهو الإسلام وعملا بالبدن، وهو من أركان الشرائع ويكفر جاحده

[۱] أصول السرخسي،فصل في بيان المشروعات من العبادات وأحكامها، ج۱ ص۱۱۰.

ويفسق تاركه بلا عذر، وأما حكم الوجوب فلزومه عملا بمنزلة الفرض لا علما على اليقين لما في دليله من الشبهة حتى لا يكفر جاحده-

"فرض کا حکم یہ ہے کہ وہ علماً بھی لازم ہے اور دل میں اس کی تصدیق کرنا بھی ضروری ہے اور اعضاء کے ذریعے اس کی ادا بجالانا بھی واجب ہے (اسی کو اسلام کہتے ہے) اور یہ شرائع کے ارکان میں سے ہے، اس کا منکر کافر اور بلا عذر چھوڑنے والا فاسق ہے، اس کے مقابلے میں وجوب ہے کہ عمل میں تو فرض کی طرح وہ بھی لازم ہے مگر علم ویقین کا موجب نہیں کیونکہ اس کی دلیل میں شبہ موجود ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا منکر کافر نہیں ہے۔[۱]

ان دونوں عبارات کا حاصل یہ ہے کہ فرض اور واجب میں ثبوت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ واجب کے لئے ثبوت یا دلالت کسی ایک لحاظ سے قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے، اور فرض کے لئے ہر لحاظ سے قطعی دلیل ضروری ہے اور حکم کے لحاظ سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ فرض کا منکر کافر ہے اور واجب کا منکر کافر نہیں، البتہ فاسق ضرور ہے۔

اس تفصیل اور دونوں اصطلاحات کے درمیان اس تفریق سے واضح ہوا کہ اُصولیین کے نزدیک کفر کا اصل مدار قطعی حکم کے انکار پر ہی ہے، اسی لئے فرض کے انکار کو کفر کہا اور واجب چونکہ ہر لحاظ سے قطعی نہیں ہے بلکہ قطعیت نہ ہونے کی وجہ اس میں شبہات بھی موجود ہوسکتے ہے، اسی لئے اس کے انکار کو کفر نہیں کہا جاتا۔

---

[۱] أصول البزدوي مع شرحه كشف الأسرار ، باب العزيمة والرخصة، ج۲ ص۳۰۳.

سنت اور اجماع کی ضمن میں تکفیر کی بحث

اس کے علاوہ سنت اور اجماع کے مباحث میں بھی اُصولیین حضرات ضمنی طور پر اپنی کتابوں میں تکفیر کا مسئلہ بیان فرماتے ہیں، اوران سب مقامات پر اُصولیین نے کفر کا مدار قطعیت اوریقین کے انکار پر ہی رکھا ہے بلکہ بعض اُصولیین نے توقطعیت اور تواتر کے بعد لفظ کفر پر "ف" داخل کیا ہے جس سے صراحت کے ساتھ یہی مفہوم حاصل ہو جاتا ہے۔

اُصولیین کی چند عبارات

چنانچہ یہاں اس قسم کی چند عبارات ذکر کی جاتی ہیں:

اجماع کی بحث میں نورالانوار میں لکھا ہے کہ:

الإجماع في أمور الشريعة في الأصل يفيد اليقين والقطعية فيكفر جاحده- [۱]

خبر متواتر اور مشہور کے بحث میں لکھا کہ:

وأنه(المتواتر) يوجب علم اليقين كالبيان علماضروريا- ثم قال في بحث الخبر المشهور- وقال الجصاص أنه أحد قسمي المتواتر فيفيد علم اليقين ويكفر جاحده كالمتواتر علي مامر- [۲]

---

[۱] نور الأنوار، باب الإجماع، ص:۶۲۹

[۲] نفس المصدر، ص:۵۰۳

اُصول الشاشی میں تحریر ہے کہ:

ثم المتواتر یوجب العلم القطعي ویکون رده کفرا- [۱]

اُصول فقہ کی مبسوط کتابوں میں ان تمام مباحث کی تفصیلات مذکور ہیں جو ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، یہاں صرف اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ حضرات اُصولیین کے اس طرز نگارش سے معلوم ہوتا ہے کہ تکفیر کا موجب قطعی اور یقینی احکام ہی کا انکار ہے۔

تواتر کی شرائط

کوئی حکم ثبوت کے لحاظ سے کب تواتر کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے؟ حضرات اُصولیین نے اس کو تفصیل سے ذکر فرمایا ہے اوراس کے لئے مختلف شرائط مقرر فرمائی ہے جن میں سے بعض شرائط تو اتفاقی ہیں اور بعض شرائط ایسی ہیں جن کی شرط ہونے میں خود اُصولیین کا اختلاف ہے، لیکن علامہ ابن الہمام، ، علامہ شامی اوران کے علاوہ بہت سے فقہائے اُصولیین کا مؤقف یہ ہے کہ اگر کہیں مندرجہ ذیل تین شرائط پائی جائیں تو وہ حکم متواتر شمار ہو گا:

۱۔ نقل کرنے والے اتنے زیادہ ہوں کہ عقل عام طور پر ان کے جھوٹ پر متفق ہو جانے کو تسلیم نہ کرے۔

۲۔ کسی محسوس بات کو نقل کریں مثلاً حضور ﷺ سے کچھ سنا یا آپ ﷺ کو کچھ کرتے دیکھا، اگر ناقلین کسی عقلی بات پر متفق ہو جائیں تو اس کو درجہ تواتر حاصل نہیں ہو گا۔

---

[۱]أصول الشاشي، البحث الثانی فی أقسام الخبر، ص: ۲۷۲.

۳۔ حضور ﷺ کے دور مبارک سے لے کر بعد کے ادوار تک یہ سلسلہ اتنی ہی کثرت کے ساتھ برابر نقل ہوتا رہا ہو، اگر درمیان میں نقل کرنے والوں کی تعداد اس معیار سے کم ہوگئی ہو یا اول و آخر میں کم ہوئی ہو تو بھی وہ روایت متواتر نہیں کہلائے گی۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

والحاصل أن شروطه ثلاثة كما في التحرير: تعدّد النقلة بحيث يمتنع التوطؤ على الكذب عادة، والاستناد إلى الحسّ، واستواء الطرفين والوسط في ذلك. [۱]

تواتر کی قسمیں

پھر تواتر کی بھی قسمیں ہیں، بعض اوقات تو کوئی حکم اسناداً متواتر ہوتا ہے مثلاً ایک حکم کا ثبوت کسی ایسی روایت سے ہے جو سنداً درجہ تواتر تک پہنچ چکی ہو یعنی حضور ﷺ کے دور مسعود سے لے کر آخر تک اس کی روایت کرنے والے اتنے زیادہ لوگ ہوں کہ عقل ان کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کا وہم نہیں کرتی جیسے کہ حدیث مبارک " من كذب عليّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النّار "اور اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کے ختم نبوت کی احادیث۔

بعض اوقات کوئی چیز متواتر تو ہوتی ہے لیکن اس کے اسناد دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ طبقہ در طبقہ اور نسل در نسل کثرت کے ساتھ منتقل ہوتی رہتی ہے جیسے کہ قرآن کریم اور اس کے تمام الفاظ کا تواتر ہے، کہ حضور ﷺ کے دور مبارک سے لے کر آج تک تمام مسلمان قرآن کو پہلے کی طرح پڑھ رہے ہیں اور سب اس کو کلام الٰہی یقین کرتے ہیں،

[۱] نسمات الأسحار على إفاضة الأنوار، باب في بيان أقسام السنة، ص۱۷۷.

اسی طرح کبھی عمل اور توارث کے ساتھ بھی تواتر کا ثبوت ہوتا ہے۔[۱]

یہ سب اقسام تواتر کی ہیں اور سب کا حکم یہ ہے کہ ان طرق سے ثابت شدہ حکم کا انکار کرنا موجب کفر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جس چیز کا انکار کیا جارہا ہے وہ حکم شرعی ہو کیونکہ احکام شریعت کے علاوہ متواترات کا اگر کوئی انکار کرے تو اس کو جاہل، ناواقف یا متعصب وہٹ دھرم تو کہا جاسکتا ہے لیکن کافر قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ کفر شارع کی تکذیب کا نام ہے نہ کہ ہر متواتر کا، لہٰذا اگر کوئی یہاں پاکستان میں رہ کر بغداد وبصرہ یا امریکہ وبرطانیہ کا انکار کرے کہ کرہ ارض پر یہ مقامات موجود ہی نہیں ہیں تو اس کی بناء پر اس کی تکفیر کرنی جائز نہیں ہے کیونکہ اس نے شارع کی تکذیب نہیں کیا اگرچہ یہ خبر متواتر ہے۔

---

[۱] انظر إكفار الملحدين، ص٥و٦.

اُصول تکفیر

بنیادی طور پر کفر کے تین اسباب ہیں:

۱۔ اعتقاد

۲۔ قول

۳۔ عمل

کسی مسلمان شخص کو ان ہی تین چیزوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے کافر قرار دیا جاسکتا ہے، بعض اوقات کوئی ایسا عقیدہ رکھا جاتا ہے جو اسلام کے بالکل منافی ہوتا ہے، بسا اوقات اسلام کا کوئی ضروری عقیدہ ہوتا ہے جس پر ایمان واسلام لانا ضروری ہوتا ہے اور کوئی شخص اسی میں متردد ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کو کافر کہا جاتا ہے، اسی طرح کبھی کبھار کوئی شخص ایسا قول و فعل اختیار کرتا ہے جس کی بنیاد پر حضرات فقہاء کرام اس کی تکفیر کرتے ہیں۔

اعتقاد سے متعلق تفصیلات تو مندرجہ بالا مباحث میں ذکر ہوں چکی، یہاں قول و عمل کے متعلق تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں۔

تکفیر کی دوسری اور تیسری بنیاد: قول و عمل

جن افعال واقوال کی وجہ سے متکلمین اور فقہاء کرام کسی مسلمان شخص کی تکفیر کرتے ہیں، اس کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

الف: ایک قسم ان افعال واقوال کی ہے جن کا کرنا ہی کفر ہے، اور جب کوئی شخص وہ قول و فعل اختیار کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ اس میں

جائز یا مباح سمجھنے کی کوئی شرط نہیں۔

واضح رہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک ایمان چونکہ دلی تصدیق کا نام ہے اس لئے ان حضرات کے نزدیک کوئی فعل و عمل بذات خود موجب کفر نہیں ہوتا جب تک وہ دلی تصدیق ختم ہونے پر دلالت نہ کرے، یہاں اس قسم سے بھی ایسے ہی اعمال واقوال مراد ہیں جو یقینی طور پر دلی تصدیق فوت ہونے پر دال ہوں۔

ب: دوسری قسم میں وہ افعال واقوال داخل ہیں جو بذات خود کفر نہیں ہوتے بلکہ ان میں کفر کا اصل دارومدار دوسرے اُمور پر ہوتا ہے، اس لئے فقہاء کرام جہاں بھی اس کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں تو وہ قید بھی ضرور ذکر فرماتے ہیں۔

پہلی قسم افعال واقوال کی تفصیلی بحث و تحقیق تو اسی باب کے فصل دوم میں ذکر کی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں دوسری قسم سے متعلق فقہاء کرام کے ذکر کردہ مباحث کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

قول وفعل کے موجب کفر بننے کی اصل وجوہات

فقہاء کرام نے اس قسم کے افعال واقوال کی ایک بڑی لمبی فہرست ذکر فرمائی ہے بلکہ فقہ کے اکثر مبسوط کتابوں میں کلمات الکفر وغیرہ عنوان کے نام سے ایک مستقل باب ذکر کیا جاتا ہے جس میں زندگی کے مختلف مشاغل سے متعلق ان تمام کلمات وافعال کو جمع کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو سکتا ہے، بعض کتابوں میں اس طرح کی ذکر کردہ جزئیات کی تعداد تقریباً چار سو (۴۰۰) تک پہنچتی ہے، لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے کہ ان میں اکثر وہ اُمور ہوتے ہیں جو بذاتِ خود کفر کے موجب نہیں ہوتے بلکہ دیگر قیودات وشرائط کی وجہ سے وہ کفر کا سبب بنتے ہیں۔

فقہ حنفی کی جامعیت

مذاہب اربعہ میں سے یہ فقہ حنفی کا ایک امتیاز اور بڑی خصوصیت ہے کہ اس باب کی طرف سب سے زیادہ توجہ فقہ حنفی میں دی گئی ہے اور بنیادی کام بھی تقریباً فقہاء حنفیہ ہی نے کیا، محققین کے نزدیک علامہ محمد بن اسماعیل بدرالرشید رحمہ اللہ وہ پہلی شخصیت ہے جس نے اس بحث کو باقاعدہ ایک رسالہ کی شکل میں مرتب فرمایا اس کے بعد سے یہ باب باقاعدہ بحث و تمحیص کا موضوع بنا، اور دیگر حضرات نے بھی اس پر تحقیق فرمائی، فجزاھم اللہ تعالیٰ عنّا وعن جمیع الأمة خیر الجزاء۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق اس پر سب سے جامع اور منضبط کام علامہ نشانجی زادہ رحمہ اللہ نے کیا جس نے باقاعدہ ایک کتاب لکھی اور تمام فقہاءِ حنفیہ کی تحقیقات کو نقد و نظر کے اُصول کے ساتھ منضبط طور پر جمع فرمایا، آپ نے اس مفید رسالے کا نام "تنویر الجنان فی بیان حفظ الإیمان" رکھا اور اپنی کتاب "نور العین فی إصلاح جامع الفصولین" کے آخر میں اپنا یہ پورا رسالہ بھی ضم کیا۔

اس کے علاوہ فتاویٰ ہندیہ میں بھی اس قسم کے تقریباً اکثر جزئیات جمع کی گئیں، اور چونکہ فتاوی ہندیہ کا زمانہ تالیف کافی بعد کا ہے اس لئے اس میں تمام جزئیات و فروعات کو سمیٹنے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی گئی۔

قول و عمل کے موجب کفر بننے کے متعلق تحقیق کا حاصل

راقم الحروف ان دونوں کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ان تفصیلات میں بنیادی طور پر مندرجہ بالا دو قسم کے اعمال واقوال ذکر کئے جاتے ہیں، ایک وہ اعمال واقوال جو ایمان کے لوازم اوراس کی شرائط کے سراسر منافی ہوں، ان میں تو خود اس فعل کو موجب کفر قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دل میں تصدیق باقی نہیں رہی، یا اگر نام کی تصدیق برقرار بھی ہو تو شریعت میں اس کا اعتبار نہیں۔

اور جو افعال واقوال ایمان یا اس کے لوازم وشرائط کے منافی نہیں ہیں، اس کو حضرات فقہاء کرام مندرجہ ذیل تین اُمور کی وجہ سے موجب کفر قرار دیتے ہیں اوراس کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں۔

۱۔استحلال

۲۔استخفاف

۳۔استہزاء

ان تینوں اُمور کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ بدرالرشید رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الفاظ الکفر" میں صرف جزئیات ہی ذکر فرمائے ہیں، ان کے دلائل ذکر نہیں کیئے نہ ہی اس بات کی طرف تعرض فرمایا کہ کسی جزئیہ میں کفر کا حکم کیوں لگایا گیا ہے؟ اہمیت کے باوجود ان دلائل کو ذکر نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ آپ خود ہی مقدمہ میں اس کی وجہ تحریر فرماتے ہیں:

وما أوردت الدلائل لأن دلائلها لاتخلو من احدي الثلاثة، إما

بالاستهزاء أو بالاستخفاف أو بالاستحلال.

"میں نے اس کتاب میں دلائل ذکر نہیں کئے کیونکہ دلائل یہی تین اُمور ہی ہیں: ا۔ استہزاء۔ ۲ : استخفاف۔ ۳: استحلال" [۱]

ذیل میں ان ہی تین اُمور کی وضاحت کی جاتی ہے۔

استحلال کی تحقیق اور اس کا مفہوم

استحلال "حل" سے مشتق ہے جس کا بنیادی معنیٰ" کھولنا، آزاد ہونا اور "رہائی" ہے، جب کوئی شخص گرہ کھولتا ہے تو عرب کہتے ہیں کہ "حلّ العقدة"اس نے گرہ کھولی، شریعت مطہرہ نے جن چیزوں کو جائز قرار دیا ہے، ان کو بھی حلال اسی لئے کہتے ہیں کہ ان میں انسان آزاد ہے،اس کے کرنے اور نہ کرنے میں مکلف پر کوئی پابندی نہیں، بلکہ اگر چاہے تو شریعت کی طرف سے بلا روک ٹوک وہ کام کر سکتا ہے۔

استحلال باب استفعال سے مصدر کا صیغہ ہے جس کی خاصیات میں سے یہاں "وجدان "یا" حسبان" پایا جا سکتا ہے یعنی کسی چیز کو صاحب ماخذ خیال کرنا، وجدان اور حسبان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وجدان کی صورت میں متکلم یقین کرتا ہے اور حسبان کی صورت میں صرف صاحب ماخذ ہونے کا خیال ہوتا ہے، متکلم کو اس کا یقین نہیں بلکہ صرف گمان ہوتا ہے جس کے لئے وہ باب استفعال کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

اس تفصیل کے مطابق "استحلال" کا معنیٰ ہوا کسی چیز کو حلال سمجھنا، یا کسی چیز کو حلال خیال کرنا، یعنی جن اُمور کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے ان کے کرنے میں اپنے آپ

---

[۱] كتاب ألفاظ الكفر، مخطوط، لوحة:۳.

کو آزاد خیال کرنا، اسی کا نام استحلال ہے جو کہ کفر ہے۔

استحلال کا حکم

شریعت اسلام نے جن چیزوں کو معاصی قرار دیا، ان کو اعتقاداً معصیت سمجھنا اور عملاً اس سے کنارہ کش رہنا ضروری ہے اگر کہیں لاپرواہ کی وجہ سے اس کا ارتکاب کیا جائے تو اس کی وجہ سے آدمی عاصی اور گناہگار بن جاتا ہے، لیکن ۔ خدانخواستہ۔ اگر کہیں اعتقاد میں تزلزل آئے اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھا جائے تو یہ ایک نہایت خطرناک جرم ہے، ایسا کرنا صرف معصیت ہی نہیں ہے بلکہ کفر ہے جس کی وجہ سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اس پر تقریباً پوری اُمت کا اتفاق ہے کہ "استحلالِ حرام" کفر ہے، لیکن یہ قاعدہ اتنا مطلق نہیں ہے جتنا عام طور پر بیان کیا جاتا ہے، بلکہ اس کے لئے کچھ حدود و شرائط ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر تکفیر جیسا حساس اقدام کرنا کئی غلطیوں اور منکرات کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، ان شرائط کے نہ سمجھنے کی وجہ سے آج پورے عالم اسلام میں افراط و تفریط کی نہایت خطرناک اور افسوس ناک لہر جاری ہے جو ہزاروں معصوم جانوں کو اپنے چنگل میں لے کر موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد بھی روز افزوں عروج پر جاتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اس لئے مسئلہ تکفیر کو کماحقّہ سمجھنے کے لئے اس بحث کو سمجھنا بھی ناگریز ہے اور اس عقدہ کو حل کئے بغیر "اُصول تکفیر" کا کوئی بھی کام شاید ادھورا ہی ہے۔

یہاں اُنہی شرائط کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ ذکر کر دیا جاتا ہے۔ ان شرائط کو آسانی کی خاطر مندرجہ ذیل تین عنوانات کے اندر تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ وہ شرائط جن کا مستحِل (معصیت کو حلال سمجھنے والے) میں پایا جانا ضروری ہے۔

۲۔ وہ شرائط جن کا مستحل (معصیت) میں پایا جانا ضروری ہے۔

۳۔ نفس استحلال کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل۔

مستحِل کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

استحلال کی بنیاد پر چونکہ مستحل کو کافر قرار دیا جاتا ہے اس لئے اُصولی لحاظ سے اس بنیاد پر تکفیر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مستحل کے اندر وہ تمام شرائط پائی جائیں جن کا اس شخص کے اندر پایا جانا ضروری ہے جس کو اس کی کسی اقدام کی وجہ سے کافر قرار دیا جاتا ہے اس کی تفصیل اسی کتاب کے باب سوم میں تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے، اس لئے یہاں مزید تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے ، یہاں خصوصیت کے ساتھ ان شرائط کو بیان کیا جاتا ہے جن کی طرف عام طور پر توجہ دیئے بغیر لوگ استحلال کو کفر سمجھ بیٹھتے ہیں۔

پہلی شرط: مسئلہ کا علم ہونا

کسی کو استحلال کی بنیاد پر کافر قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اس معصیت کی معصیت ہونے کا علم ہو جس کو وہ حلال سمجھ رہا ہے، اگر کوئی شخص لاعلمی میں حرام چیز کو حلال کہے تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہو گا۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لو قال للحرام: هذا حلال، لترويج السلعة أو بحكم الجهل لا يكفر.

"اگر کوئی اپنے سودا بیچنے کے لئے یا ناواقفی کی وجہ سے حرام چیز کو حلال کہہ ڈلے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائیگی۔"

علامہ فرہاروی رحمہ اللہ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

لترويج السلعة أو بحكم الجهل أو عدم العلم بكونه حراما لا يكفرلعدم تكذيب الشارع. [۱]

"سودا بیچنے کے لئے، جہالت کی وجہ سے یا حرمت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے حرام کو حلال کہنے والے کی تکفیر اس لئے نہیں کی جاتی کہ اس نے (دراصل) شارع کی تکذیب (ہی) نہیں کی۔"

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ولا بقوله لحرام هذا حلال من غير أن يعتقده فلا يكفر السوقي بقوله هذا حلال للحرام ترويجا لشرائه- [۲]

"اگر کوئی شخص کسی حرام کو کہے کہ یہ حلال ہے لیکن یہ عقیدہ نہ رکھے تو کافر نہیں ہو گا، لہٰذا اگر بازاری آدمی اپنا سامان فروخت کرنے کے لئے حرام کو حلال کہے تو اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔"

اُنہی کی کتاب "الأشباه والنظائر" میں یتیمۃ الفتاویٰ سے نقل فرمایا ہے کہ:

ظن لجهله أن ما فعله من المحظورات حلال له، فإن كان مما يعلم من دين النبي صلى الله عليه وسلم ضرورة، كفر وإلا فلا. [۳]

"اگر کسی نے اپنی جہالت کی وجہ سے گمان کیا کہ جن محرمات کا اس نے ارتکاب

---

[۱] النبراس، ص٥٤٥.

[۲] البحر الرائق ،كتاب السير، باب أحكام المرتدين،ج٥ص ١٣٢.

[۳] الأشباه والنظائر ، الفن الثالث، أحكام الجهل،ص: ٢٦٢.

کیا ہے وہ حلال ہیں، تو اگر یہ محرمات ضروریاتِ دین میں سے ہوں تو کافر ہو جائے گا ورنہ نہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ناواقفیت کی وجہ سے شریعت کے کسی حرام چیز کو حلال کہے تو اس کی تکفیر کرنا غلط ہے جبکہ وہ حکم ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو، کیونکہ کفر تکذیبِ شارع کا نام ہے اور جب دل میں پورے اعتقاد کے باوجود محض کسی دنیوی لالچ یا ناواقفیت کی وجہ سے حرام کو حلال کا نام دے تو اس صورت میں شارع کے ساتھ معارضہ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی جس کو تکذیب شارع اور کفر کہا جاسکے، اس لئے اس کو کفر نہیں کہا گیا۔

یہاں یہ سوال کہ خواہ مخواہ یہ شرط کیوں لگائی گئی ہے؟ نیز ہر معصیت کو حلال سمجھنے کا یہ حکم ہے یا اس میں کچھ تفصیل بھی ہے؟ تو ان باتوں کی تفصیل باب سوم "موانعِ تکفیر" کے ضمن میں پہلے گزر چکی ہے، وہیں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری شرط: استحلال تاویل کے ساتھ نہ ہو

اگر کوئی شخص کسی دلیل کی بنیاد پر ناجائز چیز کو جائز سمجھے تو اس کی بھی تکفیر نہیں کی جائیگی، اس کا استدلال اُصول فقہ کے لحاظ سے غلط سہی، لیکن بہر حال اس کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا، حضرات مجتہدین کے باہمی اختلافات میں ایک طویل فہرست ان مسائل کی بھی ہے جہاں کسی چیز کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں ہی اختلاف ہے، ایک مجتہد کے نزدیک کوئی چیز جائز ہوتی ہے دوسرے کے ہاں وہی چیز ناجائز و حرام، ایک امام کسی چیز کو دلائل کی بنیاد پر معصیت اور حرام سمجھتا ہے جبکہ دوسرے امام کے نزدیک وہی چیز بالکل مباح ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود چونکہ سب کا سرچشمہ قرآن و سنت کے دلائل ہی ہیں

اس لئے ان اختلافات کی وجہ سے تکفیر تو در کنار، کسی کو گمراہ قرار دینا بھی جائز نہیں ہے۔

خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے درمیان ایسے کئی واقعات سامنے آئے، لیکن ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان مسائل کی وجہ سے کسی شخص کی تکفیر کی ہو، امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ اُنہوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے آیت کریمہ " لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا " سے یہ استدلال کیا کہ اگر کوئی مسلمان شخص شراب نوشی کرے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کی یہ تفسیر و تاویل غلط ہے اور اس کے بعد اس پر حد بھی قائم کر دی۔[۱]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کسی غلط تاویل کی وجہ سے استحلال معصیت کا مرتکب ہو جائے تو اس سے وہ کافر نہیں ہو گا، ورنہ تو شراب کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس کو مباح سمجھنے کی وجہ سے حد شراب قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کو ارتداد قرار دیکر دوبارہ دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دینی چاہئے تھی ورنہ اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں اس کو قتل کرنا ضروری تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاویل کو غلط قرار دیدینے کے باوجود اس کو ارتداد نہیں سمجھا اور آپ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرام نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر خاموشی اختیار کر کے اس کی تائید کی جو ایک گونہ اجماع سکوتی ہے۔

خوارج مسلمانوں کو قتل کرنے، ان کا مال لوٹنے اور ان کے خلاف لڑنے کو حلال

---

[۱] السنن الكبرى للبيهقي،كتاب الأشربة والحد فيها، باب من وجد منه ريح شراب أو لقي سكران، رقم الحديث:١٧٥١٦،ج٨ص ٥٤٧.

سمجھتے تھے حالانکہ ان اُمور کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں لیکن یہ سب کچھ وہ تاویل کے سہارے کرتے تھے بعض اُصولی باتوں میں غلط فہمی یا کج فہمی کی وجہ سے وہ ان محرمات کو حلال کہتے اور سمجھتے تھے اس لئے جمہور اُمت نے ان کو کافر نہیں کہا۔

علامہ کمال ابن الہمام رحمہ اللہ خوارج کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکالمہ سے استنباط کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

في هذا دليل على أن ما لم يكن للخارجين منعة لا نقتلهم، وأنهم ليسوا كفارا لا بشتم علي ولا بقتله. قيل إلا إذا استحله،فإن من استحل قتل مسلم فهو كافر، ولا بد من تقييده بأن لا يكون القتل بغير حق أو عن تأويل واجتهاد يؤديه إلى الحكم بحله، بخلاف المستحل بلا تأويل، وإلا لزم تكفيرهم؛ لأن الخوارج يستحلون القتل بتأويلهم الباطل- [۱]

"یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر بغاوت کرنے والوں کے پاس کوئی طاقت نہ ہو تو ہم ان کو قتل نہیں کریں گے اور وہ کافر نہیں نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سب وشتم کرنے کی وجہ سے نہ ہی ان کو قتل کرنے کی وجہ سے، بعض حضرات نے کہا کہ اگر اس کو حلال سمجھیں تو کافر ہوں گے کیونکہ جو کوئی بھی کسی مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے تو وہ کافر بن جاتا ہے، اوراس میں یہ قید ضروری ہے کہ قتل ناحق نہ ہو اور کسی تاویل واجتہاد کے بغیر نہ ہو، برخلاف اس شخص کے جو کسی تاویل کے بغیر ہی حلال سمجھتا ہے، ورنہ (اگر یہ قید نہ لگائی جائے) تو خوارج

[۱] فتح القدير، كتاب السير،باب البغاة،ج٦ ص ١٠٠.

کی تکفیر لازم آئیگی، کیونکہ وہ اپنے باطل تاویل کے سہارے قتل مسلم کو حلال سمجھتے تھے۔"

یاد رہے کہ تاویل اگرچہ تکفیر سے مانع ہے لیکن ہر تاویل کا یہ حکم نہیں ہے، اس بات کی مزید تفصیل باب سوم کے "موانع تکفیر" میں ذکر کردی گئی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

بدعتی کی تکفیر کا مسئلہ

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شرعی دلائل سے جس چیز کا معصیت ہونا ثابت ہو اس کو جائز اور مباح سمجھنا موجب کفر ہے، بعض لوگوں نے اسی اُصول پر بدعت کو مطلقاً کفر قرار دیا کیونکہ بدعت کی بنیاد عام طور پر کسی ناجائز چیز کو جائز سمجھنے پر ہوتی ہے، مبتدع صرف اس کو جائز نہیں سمجھتا بلکہ بعض اوقات اس کو مستحسن بھی خیال کرتا ہے لہٰذا ان حضرات نے ہر مبتدع کو کافر کہا کیونکہ معصیت کو جائز قرار دیا۔

لیکن جمہور اُمت نے اس مؤقف سے بالکل ہی اتفاق نہیں فرمایا، یہ اُصول بالکل مسلم ہے کہ استحلال معصیت کفر ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ استحلال کسی شرعی دلیل کے بغیر صرف عناد و مکابرہ کے بنیاد پر کیا جائے، جبکہ مبتدع دلیل کا سہارا لے کر کسی چیز کو جائز کہتا ہے اس لئے اس کو کافر کہنا بالکل غلط ہے اگرچہ مبتدع کے پاس دلیل بھی غلط اور بے بنیاد ہی ہوتی ہے لیکن دلیل کی غلطی کی وجہ سے تکفیر کرنا درست نہیں، اسی طرح حضرات ائمہ مجتہدین کے درمیان آپس میں مختلف اُمور کے متعلق جائز وناجائز، افضل و غیر افضل کے جو اختلافات ہیں کہ کوئی عمل ایک مجتہد کے نزدیک جائز ہوتا ہے اور دوسرا مجتہد اس کو ناجائز قرار دیتا ہے، اس اختلاف کی بنیاد بھی چونکہ شرعی دلیل ہے اس لئے محض اس کی بنیاد پر تکفیر کی جسارت کرنا نہایت خطرناک اور بڑی جرأت کی بات ہے۔

علامہ ابن الہمام کی صراحت

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

(وأورد استباحة المعصية كفر) وكثير منهم إن لم يكن عامتهم يستبيحها فيكونون كفارا(وأجيب) بأن عد فعلها مباحا إنما يكون كفرا (إذا كان عن مكابرة وعدم دليل بخلاف ما) يكون (عن دليل شرعي) ، فإنه لا يكون كفرا (والمبتدع مخطئ في تمسكه) بما ليس عند التحقيق بدليل لمطلوبه (لا مكابر) لمقتضى الدليل.

"اعتراض وارد ہوتا ہے کہ گناہ کو مباح سمجھنا کفر ہے اور ان مبتدعہ میں سے بہت سے لوگ اس کو جائز سمجھتے ہیں تو اس اُصول کے مطابق وہ کافر قرار پائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کو مباح سمجھنا تب کفر ہے جبکہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہو اور کسی دلیل کے بغیر ہو، اگر دلیل شرعی کی وجہ سے ایسا کیا جائے تو کفر نہیں اور مبتدع شخص غلطی اور خطا کا تو مرتکب ہے کہ اس نے غیر دلیل سے استدلال کیا لیکن دلیل کے مفہوم سے ہٹ دھرم نہیں ہے (اس لئے اس کو مطلقاً کافر کہنا درست نہیں) "[۱]

---

[۱] التقرير والتحبير علي تحرير الكمال بن الهمام، المقالة الثالثة، مسألة المسألة الاجتهادية أي التي لا قاطع فيها من نص أو إجماع، ج۳ص۳۱۸.

مستحل کے اعتبار سے شرائط کا بیان

ہر معصیت کو حلال سمجھنا کفر نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

معصیت کا ثبوت قطعی ہو

جس گناہ کو حلال سمجھنے کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جارہی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس گناہ کا گناہ ہونا قطعی ہو، یعنی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ دلائل سے اس کا معصیت ہونا ثابت ہو، لہٰذا جن گناہوں کا ثبوت اس درجہ قطعی نہ ہو تو اس کو مباح سمجھنا کفر نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مکروہ تحریمی بھی ایک معصیت ہے لیکن اگر کوئی اس کو مباح سمجھے تو کافر نہیں ہوگا کیونکہ اس کا ثبوت جن دلائل سے ہوتا ہے وہ ثبوت اور دلالت دونوں کے لحاظ سے قطعی نہیں ہوتے بلکہ صرف ایک جہت سے قطعیت بھی اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

علامہ قاسم قونوی حنفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

والمكروه: ما ثبت النهي فيه مع العارض، وحكمه: الثواب بتركه وخوف العقاب بالفعل، وعدم الكفر بالاستحلال. [۱]

"مکروہ وہ حکم ہے جس کی ممانعت ثابت ہو مگر ساتھ کوئی عارض بھی ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ چھوڑنا ثواب ہے اور کرنے کی صورت میں سزا کا اندیشہ ہے اور حلال سمجھنا کفر نہیں ہے۔"

---

[۱] أنيس الفقهاء في تعريفات الألفاظ المتداولة بين الفقهاء، باب الوتر والنوافل، ص:۳۲.

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے جہاں کسی معصیت کی استہانت کو کفر قرار دیا ہے تو وہاں ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ:

ولا خفاء في أن المراد ما يثبت بقطعي.

"اور اس بات میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے کہ یہاں مقصود وہ حکم ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو۔"[۱]

اس شرط کو ضروری قرار دینے کی وجہ وہی ہے جو شرائط تکفیر کی بحث میں ذکر کی گئی ہے کہ بنائے کفر کا یقینی ہونا ضروری ہے، احتمالات کی بنیاد پر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں بلکہ جس چیز کی بنیاد پر کسی کو کافر کہا جارہا ہے اس کا یقینی طور پر شریعت کی طرف سے ثابت ہونا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض متکلمین نے کسی معصیت کے استحلال کو کفر قرار دینے کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس کا معصیت ہونا متفق علیہا ہو، اگر کسی عمل کی معصیت ہونے میں ہی ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو تو اس کا استحلال کفر نہیں ہے۔

علامہ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

المحرم: ما ثبت النهي فيه بلا عارض، وحكمه الثواب بالترك لله تعالى، والعقاب بالفعل والكفر بالاستحلال، في المتفق. [۲]

"حرام اس کام کو کہا جاتا ہے جس کی ممانعت بغیر کسی عارض کے ثابت ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑنا موجب ثواب ہے، اس کا ارتکاب کرنا

[۱] شرح المقاصد في علم الكلام،ج۲ص:۲۷۰.
[۲] التعريفات ،باب الميم،ص: ۲۰۵.

موجب عقاب ہے اور اس کو حلال سمجھنا کفر ہے ان باتوں پر اتفاق ہے۔"

حرام کی حرمت لعینہ ہو

حرام کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ حرام جس کی حرمت کی اصل وجہ خود اس عمل کی ذات میں موجود ہو کہ جب بھی وہ عمل پایا جائے گا تو حرمت کی بنیاد بھی ساتھ موجود ہو گی اور اس کا کرنا حرام قرار ہو گا، اس کو حرام لعینہ کہا جاتا ہے، بعض اوقات کوئی کام خود ناجائز نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ کوئی اور چیز متصل ہوتی ہے اور اسی غیر کی وجہ سے اصل کام میں حرمت پیدا ہو جاتی ہے اس کو حرام لغیرہ کہا جاتا ہے مثلاً اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنا بذات خود کوئی ناجائز کام نہیں ہے لیکن حالت حیض میں چونکہ اس کے ساتھ "اذی" موجود ہوتی ہے اس غیر کی وجہ سے حالت حیض میں جماع کرنے سے ممانعت کر دی گئی۔

فقہائے کرام کی آراء

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس حرام کو حلال سمجھنے کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے کیا اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حرام لعینہ ہی ہو یا حرام لغیرہ کو حلال سمجھنا بھی کفر ہے؟

یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے، جس کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاءِ احناف میں سے امام سرخسی، علامہ ابن مازہ بخاری، علامہ موصلی، علامہ ابن الہمام وغیرہ بہت سے فقہاءِ کرام کے نزدیک اس کا حرام لعینہ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، بلکہ حرام لغیرہ کا انکار کرنا یا اس کو مباح سمجھنا بھی کفر ہے جبکہ حرمت ثبوت و دلالت کے لحاظ سے قطعی ہو، علامہ طاہر بن عبد الرشید اور علامہ حصکفی ؒ وغیرہ فقہاء کرام کے نزدیک استحلال حرام کے کفر ہونے کے لئے یہ بھی ایک لازمی شرط ہے کہ اس کی حرمت لعینہ ہو۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

(و) وطؤها (يكفر مستحله) كما جزم به غير واحد، وكذا مستحل وطء الدبر عند الجمهور مجتب (وقيل لا) يكفر في المسألتين، وهو الصحيح خلاصة (وعليه المعول) ؛ لأنه حرام لغيره- [۱]

"حائضہ (بیوی) کے ساتھ جماع کو حلال سمجھنے والے کو کافر کہا جائے گا جیسا کہ ایک سے زائد فقہاء کرام نے جزم کے ساتھ فرمایا ہے اور جمہور کے نزدیک دبر میں وطی کو حلال سمجھنے والا کا بھی یہی حکم ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ ان دونوں صورتوں میں تکفیر نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ (دونوں کام) حرام لغیرہ ہیں۔"

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اگر کوئی حرام کو حلال جانے تو اگر اس کی حرمت لعینہ ہو اور دلیل قطعی سے ثابت ہو تو اس کی وجہ سے حلال جاننے والا کافر ہو جائے گا ورنہ تو اگر حرمت لغیرہ ہو یا دلیل ظنی سے ثابت ہو تو کافر نہیں ہو گا، اور بعض فقہاء نے حرام لعینہ اور حرام لغیرہ کے درمیان (اس مسئلہ میں) کوئی فرق نہیں فرمایا۔۔" [۲]

راجح بات

دونوں مؤقف کے دلائل پر غور کرنے سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا ہی

[۱]الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الطهارة، باب الحيض،ج ١ ص٢٩٧.

[۲] شرح العقائد،ص: ٥٤٤.

مؤقف راجح ہے کیونکہ تکفیر کا دار مدار تکذیب پر ہے اور جب ایک چیز کی حرمت قطعیت کے ساتھ ثابت ہو اور شریعت کے اس حکم کو جاننے کے باوجود کوئی اس کو حلال سمجھتا ہے تو وہ شریعت کی تکذیب اور اس کا انکار ہی ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، خود تکذیب کے متحقق ہونے کے لئے حرام لعینہ ہونا کوئی ضروری نہیں اور یہی در حقیقت مدارِ تکفیر ہے۔

علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ثم المختار أن المعصية أعم من أن تكون بعينها كأكل الدم أو بغيرها كأكل المسروق.[۱]

"پسندیدہ بات یہ ہے کہ معصیت عام ہے چاہے بعینہ ہو جیسے خون پینا یا بغیرہ معصیت ہو جیسے چوری کی ہوئی چیز کھانا (دونوں معاصی کو حلال سمجھنا کفر ہے)۔"

تاہم یہ ضرور ہے کہ ایسی چیز کو فی نفسہ حلال سمجھنا اور چیز ہے اور اس کو کلی طور پر مباح سمجھنا اور ہے ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے، اسی طرح جس غیر کی وجہ سے حرمت پیدا ہو جاتی ہو، وہ اگر وصف مفارق کے قبیل سے ہو تو اس کو حلال سمجھنے کی وجہ سے تبھی کسی کو کافر کہا جا سکتا ہے جب وہ اِس غیر کے ہوتے ہوئے بھی اس کو حلال جانے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ مردار کھانا اور شراب پینا قطعاً حرام اور معاصی ہیں، عام حالات میں اس کو مباح سمجھنا کفر ہے، لیکن اگر کوئی شخص حالت اضطرار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو حلال کہے تو اس کو کافر نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح اذان جمعہ کے بعد خرید و فروخت ناجائز ہے، لیکن فی نفسہ خرید و فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر

[۱] النبراس شرح شرح العقائد، ص: ٥٤٤.

اذان جمعہ کا عارض موجود نہ ہو تو خرید و فروخت بالکل جائز ہے۔

عالم و غیر عالم کا فرق

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ وغیرہ بعض فقہاء نے اس مسئلہ میں عالم اور غیر عالم کا جو فرق ذکر فرمایا ہے کہ اگر کوئی عالم حرام کو حلال کہے تو اس میں مندرجہ بالا تفصیل ہے، لیکن اگر کوئی عام آدمی ایسا کرے تو اس کے لئے حرام لعینہ اور حرام لغیرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں، بلکہ اگر حرمت قطعی ہو تو ہر صورت میں اس کی تکفیر کی جائے گی، دونوں کے درمیان اس فرق کی بنیاد بھی شاید یہی بات ہے کہ عوام لعینہ ولغیرہ کے حدود و قیود سے ناواقف ہوتے ہیں، لہٰذا اگر وہ کسی حرام کو حلال کہے تو یہ براہ راست تکذیب شارع ہے جو یقینی کفر ہے اور علماء کو عام طور پر ان دونوں قسم احکام کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ وہ اس غیر سے قطع نظر اصل حکم کے اعتبار سے حلال کہہ رہا ہو۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

والأصل أن من اعتقد الحرام حلالا فإن كان حراما لغيره كمال الغير لا يكفر. وإن كان لعينه فإن كان دليله قطعيا كفر وإلا فلا وقيل التفصيل في العالم أما الجاهل فلا يفرق بين الحلال والحرام لعينه ولغيره وإنما الفرق في حقه إنما كان قطعيا كفر به وإلا فلا فيكفر إذا قال الخمر ليس بحرام وقيده بعضهم بما إذا كان يعلم حرمتها. [۱]

---

[۱] البحر الرائق ،كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ج۵ ص ۱۳۲ .

"قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص حرام کو حلال اعتقاد کرے تو (دیکھا جائے گا) اگر حرام لغیرہ ہو جیسا کہ دوسرے شخص کے مال کو کوئی حلال کہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائیگی اور اگر حرام لعینہ ہو تو پھر (مزید دیکھا جائے گا) اگر اس کی دلیل قطعی ہو تو (اس کو حلال سمجھنے والا) کافر ہو گا ورنہ نہیں، اور یہ بھی ایک قول ہے کہ عالم اور جاہل کے درمیان فرق ہے، جاہل شخص حرام لعینہ ولغیرہ میں فرق نہیں کرتا اس کے حق میں تو بس یہی فرق ہے کہ اگر قطعی حرام ہو تو اس کے حلال سمجھنے سے اس کی تکفیر کی جائے گی اور اگر قطعی نہ ہو تو تکفیر نہیں ہو گی جیسا کہ وہ کہے کہ شراب حرام نہیں ہے (تو اس کو کافر کہا جائے گا کیونکہ اس کی حرمت قطعی ہے) بعض حضرات نے اس میں یہ قید بھی لگائی کہ جاہل کو تب ہی اس کافر قرار دیا جائے گا جبکہ اس کو پہلے سے اس چیز کا حرام ہونا معلوم ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں قیدیں اپنی جگہ ضروری ہیں، تکفیر کے لئے حرمت کا قطعی ہونا بھی ضروری ہے اور اگر کوئی عام آدمی اس کو حلال سمجھے تو اس پر کفر کے احکام جاری کرنے سے پہلے اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ پہلے سے اس مسئلہ کو جانتا بھی ہو، جس کی پوری تفصیل موانعِ تکفیر کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

ضروریاتِ دین میں سے ہونا

بعض متکلین حضرات نے یہ تصریح بھی فرمائی ہیں کہ کسی معصیت کو حلال سمجھنا تبھی کفر ہے جبکہ اس کا معصیت ہونا ضروریاتِ دین میں سے ہو، یعنی عوام وخواص میں اس کا گناہ ہونا مشہور ہو اور اس کے باوجود کوئی اس کو گناہ سمجھنے کی بجائے مباح کہے تو کفر ہے، اس بات کی پوری تفصیل اور اس قید لگانے کی ضرورت پس منظر باب دوم اور سوم میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

استحلال کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

استحلال کے اعتبار سے بنیادی شرط یہی ہے کہ استحلال اپنے اصل مفہوم کے ساتھ موجود ہو یعنی اعتقاداً کسی حرام کو حلال سمجھا جائے، کیونکہ جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں تحریر کیا گیا کہ استحلال کسی چیز کو جائز اور مباح سمجھنے کا نام ہے اور استحلالِ معصیت سے مراد یہ ہے کہ معصیت کو اعتقاداً حلال جانے، اس مفہوم کے اعتبار سے استحلال کے کفر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کیونکہ کسی چیز کے حرمت پر قطعی دلائل کے موجود ہونے کے باوجود اس کو مباح سمجھنا در حقیقت ان تمام قطعی دلائل کی تکذیب وانکار کرنا ہے اور قطعیات کا انکار کفر ہے۔

استحلال کسی چیز کو جائز سمجھنے اور مباح قرار دینے کا نام ہے، جب کوئی شخص کسی چیز کو جائز سمجھتا ہے تو عرب کہتے ہیں" استحله"، اہل لغت میں سے علامہ ابو نصر اسماعیل فارابی جوہری نے "الصحاح" میں، علامہ ابن سیدہ مرسی رحمہ اللہ "المخصص" علامہ زین الدین رازی رحمہ اللہ "مختار الصحاح" اور علامہ سید مرتضی زَبیدی رحمہ اللہ نے اپنی جامع کتاب "تاج العروس "میں استحلال کا یہی معنیٰ لکھا ہے۔ [۱]، اس کے علاوہ قدیم وجدید کتب لغت نے بھی تقریباً استحلال کا یہی مفہوم لکھا ہے۔

اہل لغت کے علاوہ حضرات فقہاء کرام اور متکلمین نے بھی استحلال کا یہی مفہوم مراد لیا ہے اور اسی کو موجب کفر سمجھا ہے، چنانچہ شرح العقائد میں جہاں علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے استحلال کو کفر قرار دیا ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ فرہاروی رحمہ اللہ

---

[۱] الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية،ج٤ ص ١٦٧٥ .

لکھتے ہیں:

واستحلال المعصية أي اعتقاد كونها حلالا صغيرة كانت أو كبيرة كفر لأنه تكذيب للشارع.[۱]

"استحلال معصیت یعنی گناہ کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھنا کفر ہے چاہے یہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، کیونکہ یہ شارع کی تکذیب ہے۔"

علامہ شاطبی رحمہ اللہ ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ثم لفظ الاستحلال إنما يستعمل في الأصل فيمن اعتقد الشيء حلالا۔[۲]

"لفظ استحلال دراصل اس شخص کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی چیز کو حلال سمجھے۔"

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أن من فعل المحارم مستحلا لها فهو كافر بالاتفاق فإنه ما آمن بالقرآن من استحل محارمه وكذلك لو استحلها بغير فعل و الاستحلال اعتقاد أن الله لم يحرمها وتارة بعدم اعتقاد أن الله حرمها وهذا يكون لخلل في الإيمان بالربوبية أو لخلل في الإيمان

[۱]النبراس،ص۵٤۳.

[۲] الاعتصام للشاطبي،الباب السابع، فصل أفعال المكلفين التي تكون من قبيل العادات هل يدخل فيها البدع ،ج۲ص۵۸۲.

بالرسالة- [۱]

"جو کوئی استحلال کے ساتھ حرام کاموں کا ارتکاب کرے تو وہ بالاتفاق کافر ہو جاتا ہے کیونکہ (جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ) جو کوئی قرآن کے حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھے، وہ (گویا) قرآن پر ایمان ہی نہیں لایا، اور استحلال (کی دو صورتیں ہیں، ایک) یہ ہے کہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام ہی نہیں قرار دیا اور یا (دوسری صورت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس چیز کے حرام نہ ہونے کا خیال رکھا جائے، ایسا تب ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت یا حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے میں کوئی خلل باقی ہو۔"

حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

"استحلال معصیت یہ ہے کہ اس کو مباح جانے، لہٰذا خوف اس پر عذاب کا مطلقاً جائز ہے بلکہ جائز جانے، نہ یہ کہ دل میں غیر جائز جان کر کچھ اندیشہ غالب نہ ہو یا اس قدر علم ہو کہ یہ فعل اچھا نہیں، یہ بھی استحلال نہیں، اور استحلال بھی اس معصیت کا کفر ہے کہ ثبوت معصیت کا نص قطعی الثبوت قطعی الدلالة سے ہو اور حرمت بھی اس کی لعینہ ہو نہ لغیرہ، [۲] اگر ان قیود میں سے کوئی مرتفع ہو جائے تو کفر نہ ہو گا، لہٰذا کم ایسے لوگ ہوں گے جو کفر کے درجہ تک پہنچیں گے۔" [۳]

---

[۱] الصارم المسلول علی شاتم الرسول، ص: ۵۲۱.

[۲] بہت سے حضرات فقہاء کرام اور متکلمین نے استحلال کی بنیاد پر تکفیر کیلئے یہ شرط بھی لگائی ہے جس کی پوری بحث پہلے گذر چکی ہے۔

[۳] فتاوٰی رشیدیہ (محقّق ومدلّل)، کتاب الإیمان والکفر، ص ۶۲.

استحلالِ عملی

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ استحلال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے جس کو استحلالِ عملی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے چنانچہ بہت سے متکلمین نے استحلال کا یہی مفہوم ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص برملا زبان سے تو کسی حرام کو حلال نہ کہے، لیکن معصیت کا ارتکاب ہی اس ڈھنگ سے کرے جس سے ناظرین کو یہی دکھائی دے کہ یہ شخص اس عمل کو حرام اور معصیت سمجھتا ہی نہیں، تو یہ بھی استحلال میں داخل ہے، کیونکہ استحلال شارع کی براہ راست تکذیب وانکار کو نہیں کہا جاتا، بلکہ یہ تکذیب کی ایک علامت اور پہچان کا نام ہے جہاں خود تکذیب کرنے والا اپنی تکذیب پر کسی کو اطلاع نہیں دیتا، بلکہ اس کی حرکات وسکنات ہی اس کی ترجمان بن جاتی ہیں۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"مجرد الإقدام على الكبيرة لغلبة شهوة أو حمية أو أنفة أو كسل خصوصاً إذا اقترن به خوف العقاب ورجاء العفو والعزم على التوبة لا ينافيه، نعم إذا كان بطريق الاستحلال والاستخفاف كان كفراً لكونه علامة للتكذيب." [۱]

"شہوت کے غلبہ، غیرت وحمیت یا سستی کی وجہ سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنا ایمان وتصدیق کے منافی نہیں ہے خصوصاً اگر اس کی اخروی سزا کا بھی خوف اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کی اُمید اور توبہ کرنے کا عزم بھی شامل ہو، تاہم

[۱] شرح العقائد النسفية ، مبحث مرتكب الكبيرة، ٦٣.

استحلال واستخفاف کے طور پر کبیرہ کا ارتکاب کرے تو یہ کفر ہے کیونکہ یہ اندرونی تکذیب کی علامت ہے۔"

اس کی وضاحت کرتے ہوئے شرح عقائد کے مشہور شارح علامہ خیالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

بطريق الاستحلال على وجه يفهم منه عنده حلالا، فإن الكبيرة على هذا الوجه علامة عدم التصديق القلبي.

""استحلال" سے مقصود اس طور پر ارتکاب کرنا ہے جس سے سمجھا جائے کہ وہ اس کو حلال جان رہا ہے، کیونکہ کبیرہ کا اس طور پر ارتکاب کرنا دلی تصدیق نہ ہونے کا قرینہ ہے۔"

علامہ خیالی کی اس عبارت کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ اللہ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

يعني أنه ليس المراد بالاستحلال عنده حلالا لأنه نفس تكذيب الشارع، والكلام فيما جعله الشارع علامة التكذيب-

"استحلال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی اس کو حلال سمجھے کیونکہ حلال سمجھنا تو شارع کی (صریح) تکذیب ہے اور ہماری بحث تو ان اُمور کے متعلق ہے جن کو شارع نے تکذیب کی علامت قرار دیا (نہ کہ بعینہ تکذیب کے متعلق، لہٰذا اس سیاق میں اس کو ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے)۔"

شرح العقائد ہی کے ایک اور مستند شارح علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ بھی علامہ خیالی کے اس نکتہ کے ساتھ اتفاق کیا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"بطريق الاستحلال والاستخفاف" أي بوجه يدل علي أنه يعتقدها حلالا أو خفيفا، كذا فسّرهما المحققون لأن الاستحلال والاستخفاف إن حملا علي ظاهرهما فهما عين التكذيب والكلام في أماراته" [۱]

یہ چند عبارات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ صرف اعتقاداً استحلال ہی کفر نہیں بلکہ بعض اوقات عملی استحلال بھی موجب کفر بن جاتا ہے، یعنی استحلال کے لئے اعتقاداً مباح سمجھنا کوئی ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب اس انداز سے کرے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا، بلکہ جائز سمجھتا ہے تو وہ بھی کافر ہے۔

---

[۱] النبراس شرح شرح العقائد، ص۲۲۷.

عملی استحلال کے متعلق ایک ضروری وضاحت

یہ حضرات متکلمین کی چند عبارات ہیں اور حضرات فقہائے کرام نے بھی مختلف جزئیات کے ضمن میں اس کی فی الجملہ تائید فرمائی ہے، البتہ بسا اوقات ان عبارات کی بناء پر ایسے استدلالات کئے جاتے ہیں جو اس مسئلہ کی نزاکت اور اس میں غیر معمولی احتیاط سے سراسر متصادم ہوتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قطعی دلائل سے ثابت شدہ گناہ کو گناہ نہ سمجھنا کفر ہے لیکن جیسا کہ "شرائط تکفیر" کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ یہ بات تحریر کی گئی ہے کہ کسی معین شخص کو کافر قرار دینے سے پہلے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مدار تکفیر اس شخص میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر اطمینان بخش دلائل مثلاً گواہوں یا خود اس شخص کے زبانی اعتراف واقرار سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ بنائے تکفیر کا قائل ہے اور بنائے تکفیر بھی ایسی ہو کہ اس میں کفریہ پہلو کے علاوہ اور کوئی قابلِ التفات پہلو نہ ہو، تو اس کے بعد اس بات کی بھی تحقیق ضروری ہے کہ "موانع تکفیر" میں سے کوئی مانع موجود تھا یا نہیں؟ اگر تکفیر کے موانع میں سے کوئی مانع بھی موجود نہ ہو تب ہی اس کی تکفیر کرنا درست ہے، محض افواہوں اور اندازوں سے کسی کا نام لے کر تکفیر کرنا شرعاً جائز نہیں۔

اس ضابطہ کو ملحوظ رکھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرے اور ارتکاب بھی کچھ ایسی بے پرواہی کے ساتھ ہو کہ بظاہر اس گناہ کی شناعت وقباحت ہی گویا دل ودماغ میں برقرار نہ ہو تو یہ اگرچہ نہایت خطرناک اور افسوسناک اقدام ہے جس کی شریعت میں کسی طرح گنجائش نہیں ہو سکتی، بلکہ ایسا لااُبالی پن کفر کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے، لیکن ہر جگہ اس کو تکذیب واستحلال کی کوئی ایسی یقینی دلیل سمجھنا

درست نہیں کہ جس میں کوئی اور احتمال موجود ہونے کا خیال نہ کرے، اس لئے محض اس بناءپر قطعی تکفیر کرنا درست معلوم نہیں ہوتی، بلکہ جیسا کہ پہلے مندرجہ بالا عبارات سے واضح ہوا کہ اگر کوئی زبان سے بھی حرام کو حلال کہے، لیکن اس کہنے کی بنیاد کوئی دنیوی لالچ یا ناواقفیت ہو تو بھی اس کی تکفیر کرنا درست نہیں، جیسا کہ شرح عقائد اور البحر الرائق وغیرہ کی عبارات سے پہلے واضح ہو چکا، حالانکہ اقوال کی بنسبت افعال میں اس سے زیادہ احتمالات موجود ہوتے ہیں۔

اس لئے محض کسی کے عمل سے ہر حال میں اس قسم کا استدلال کرنا اور بہر صورت اس پر تکفیر کی بنیاد رکھنا درست نہیں ہے، جبکہ اس بات کا اچھی طرح اطمینان حاصل نہ ہو جائے کہ وہ عملی کوتاہی کے ساتھ ساتھ اس کو حلال بھی سمجھتا ہے، ہاں البتہ اگر خود عامل کا یہی خیال ہو اور وہ دل میں بھی اس کو حلال سمجھتا ہو تو البتہ یہ ایسا کرنا موجبِ کفر ہے اوراس سے وہ کافر ہو سکتا ہے لیکن کسی کے متعلق محض ایسا گمان رکھنا تکفیر کے لئے کافی نہیں یعنی ایسا کرنا کفر کا موجب تو ہو سکتا ہے لیکن تکفیر کا نہیں، اسی طرح اگر کسی کو دوسرے ایسے قرائن سے اس بات کا یقین ہو جائے جس میں دوسرے پہلو کا کوئی قابل توجہ پہلو موجود ہی نہ ہو تو بعض شرائط کی رعایت رکھنے کے ساتھ اس کا حکم مختلف ہو سکتا ہے جیسا کہ نبراس وخیالی وغیرہ کی عبارات سے معلوم ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ متکلمین حضرات کی مندرجہ بالا عبارات سے عام قانون بنانا اور ہر جگہ معصیت کے ارتکاب کو دیکھ کافر قرار دینا درست نہیں جب تک کہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ اس کو جائز سمجھ رہا ہے، متکلمین حضرات جس دلیل استخفاف کی بناء پر تکفیر کا ذکر کرتے ہیں اس سے ہر دلیل مراد نہیں بلکہ ایسی دلیل ضروری ہے جو قطعیت کے ساتھ اپنے مدلول یعنی استحلال پر دلالت کرے، اگر معصیت کے ساتھ ساتھ کوئی ایسی

دلیل پائی جائے تب ہی تکفیر کی جاسکتی ہے۔ ورنہ اگر یوں ہی کسی کے عمل سے اس کے جائز سمجھنے کا دروازہ کھلا رہا تو اُمتِ مرحومہ کے اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں افراد ضرور تکفیر کی ضد میں آجائیں گے، پھر اگر اس طرح استدلال کرنے میں مزید کچھ سخاوت سے کام لیا جائے جیسا کہ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے تو خطرہ ہے کہ اُمت مسلمہ کی اکثریت ہی کو اپنے اصل سرمایہ نجات سے محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑے، اللہ تعالیٰ ہی اپنے حبیب ﷺ کی اس لاڈلی اُمت کا حامی وناصر ہو۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بعض معاصی ومظالم کے عملی استحلال کی بنیاد پر جب بعض لوگوں نے یزید کو کافر کہا اور اس پر لعنت کرنے کی اجازت دیدی، تو بہت سے متکلمین نے یہ کہہ کر اس کی تردید فرمائی کہ "استحلال" تو ایک ظنی وقلبی معاملہ ہے اس لئے محض ظاہری کوتاہی کو دیکھ کر قطعیت کے ساتھ کسی خاص شخص کی تکفیر کرنا مشکل ہے۔ حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ اسی مسئلہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

"ولا يخفى أنّ الاستحلال أمر قلبي ظنّي غائب عنْ ظاهر الحال، ولو فُرض وجودُه أوّلا يحتمل أنّه مات تائبا عنه أخرا فلا يجوز لعنُه لا باطنا ولا ظاهرا."[۱]

علامہ شاطبی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں کہ لوگ عورتوں کی شرمگاہوں اور ریشم کے کپڑوں کا استحلال کریں گے، تحریر فرماتے ہیں:

ولم يرد بالاستحلال مجرد الفعل، فإن هذا لم يزل موجودا في

[۱] ضوء المعالي لبدء الأمالي، ص۸۲

الناس، ثم لفظ الاستحلال إنما يستعمل في الأصل فيمن اعتقد الشيء حلالا.[ا]

استخفاف

"استخفاف" خف سے بنا ہے جو ہلکے پن اور پست ہو جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے، استخفاف چونکہ باب استفعال کا صیغہ ہے جس کی خاصیات میں سے وجدان یا حسبان بھی ہے، اس لئے اس کا معنٰی ہوا کسی چیز کو ہلکا سمجھنا، حقیر سمجھنا، ذلیل خیال کرنا، اسی طرح کسی چیز کی توہین اور تذلیل کرنے کو بھی "استخفاف" کہا جاتا ہے۔"

استخفاف کی صورتیں

استخفاف کی دو شکلیں ہیں:

ا۔ جن چیزوں کو شریعت نے عزت واحترام بخشا ہے اس کو حقیر سمجھنا یا اس کی توہین کرنا، مثلاً قرآن کریم ہے اگر کوئی (نعوذ باللہ) اس کی توہین کرے اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے یا اس کو حقارت یا عناد کے ساتھ زمین پر پھینک مارے تو اس نے اس کا استخفاف کیا اور اس کی وجہ سے اس کی تکفیر کی جائے گی، یہی حکم تمام شعائر اللہ کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تعظیم واحترام کے مقابلے میں اس کی توہین وتذلیل کفر ہے۔

۲۔ جن اُمور کو شریعت نے معاصی قرار دیا ہے، ان کے کرنے پر وعید سنائی ہے اور اس کو سنگین جرم قرار دیا ہے، اگر کوئی شخص جاننے کے باوجود اس کام کو بالکل معمولی

[ا]الاعتصام للشاطبي، الباب السابع،ج٢ص٤٥٢،ت الشقير والحميد والصيني.

بات سمجھے، استخفاف کا اعتقاد رکھے اور معصیت کے بارے میں شریعت کی بیان کی ہوئی سزا اور سنگینی کو کوئی اہمیت نہ دے تو یہ بھی شریعت کے حکم کا استخفاف ہے جو موجبِ کفر ہے۔

اور فقہاءِ کرام ایسے شخص کی تکفیر کرتے ہیں، کیونکہ شریعتِ مطہرہ نے جس چیز کو احترام وعزت دی ہے اس کو ذلیل سمجھنا خود شریعت کے ساتھ معارضہ ہے اسی طرح جس کام کو شریعت نے ایک سنگین جرم قرار دیا، اس کی سنگینی پر یقین نہ کرنا خود شارع کی تکذیب ہے اور شارع کی تکذیب یقیناً کفر ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أعلم أن من استخف بالقرآن أو المصحف أو بشئ منه أو سبهما أو جحده أو حرفا منه أو آية أو كذب به أو بشئ منه أو كذب بشئ مما صرح به فيه من حكم أو خبر أو أثبت ما نفاه أو نفى ما أثبته على علم منه بذلك أو شك في شئ من ذلك فهو كافر عند أهل العلم بإجماع..

"جان لو کہ جو شخص قرآن کریم، مصحف یا اس کے کسی حصہ کا استخفاف کرے یا اس کی گستاخی کرے یا اس کا انکار کرے، اس کے کسی حرف یا آیت کا انکار کرے، جس حکم، خبر وغیرہ کی تصریح قرآن نے کی ہے اس کی تکذیب کرے، جس چیز کے قرآن نے نفی کی ہے اس کو کوئی ثابت کرے یا جس کو ثابت کیا ہے کوئی جاننے کے باوجود اس کی نفی کرے یا اس میں شک کرے تو تمام اہل علم کے اتفاق سے وہ کافر ہو جائے گا۔"[۱]

---

[۱] الشفاء بتعريف حقوق المصطفى،الباب الثالث في حكم من سب الله تعالىٰ وملائكته

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وأما استحلال المعصية بمعنى اعتقاد حلها فكفر صغيرة كانت أو كبيرة وكذا الاستهانة بها بمعنى عدها هينة ترتكب من غير مبالاة وتجري مجرى المباحات.

"استحلال اگر جائز سمجھنے کے معنٰی میں لیاجائے تو یہ کفر ہے چاہے گناہ کبیرہ کا استحلال ہو یا صغیرہ کا، اسی طرح استہانت کا معنٰی ہے سستا اور ہلکا سمجھنا کہ پرواہ کے بغیر مباح کام کی طرح اس کا ارتکاب کرتا رہے۔"[۱]

امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قد بينا في المبسوط أن أهل الذمة يمنعون من إظهار بيع الخمور والخنازير في أمصار المسلمين، ومن إدخال ذلك في الأمصار على وجه الشهرة والظهور. هكذا نقل عن عمر وعلي - رضي الله عنهما -: ولأن هذا فسق، وفي إظهار الفسق في أمصار المسلمين استخفاف بالدين، وما صالحناهم على أن يستخفوا بالمسلمين. وكذلك إن حضر لهم عيد يخرجون فيه صليبهم فليفعلوا ذلك في كنائسهم القديمة، فأما أن يخرجوا ذلك من الكنائس حتى يظهروه في المصر فليس لهم ذلك، لما فيه من

وأنبيائه، فصل،ج۲ص۳۰٤.

[۱] شرح المقاصد في علم الكلام،ج۲ص:۲۷۰.

الاستخفاف بالمسلمين.[۱]

"اہل ذمہ کو مسلمانوں کی شہروں میں شراب وخنزیر کی خرید وفروخت ظاہر کرنے اور کھلے عام ان چیزوں کو شہر میں لانے سے منع کیا جائے گا، حضرت عمر وعلی رحمہ اللہ سے ایسا ہی منقول ہے۔ اور چونکہ یہ فسق ہے اور مسلمانوں کی شہروں میں کھلے عام فسق کرنے میں دین کا استخفاف ہے جبکہ ہم نے ان سے اس بات پر کوئی صلح نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کا استخفاف کریں گے۔۔۔"

"محیط" میں ہے:

قال أبو يوسف: إذا امتنعوا عن إقامة الفرض، نحو صلاة الجمعة وسائر الفرائض وأداء الزكاة يقاتلون، ولو امتنع واحد ضربته، وأما السنن نحو صلاة العيد، وصلاة الجماعة والأذان فإني آمرهم وأضربهم ولا أقاتلهم لتقع التفرقة بين الفرائض والسنن. ومحمد رحمه الله يقول: الأذان وصلاة العيد، ونحو ذلك، وإن كانت من السنن إلا أنها من إعلام الدين، فالإصرار على تركها استخفاف بالدين، فيقاتلوا على ذلك.[۲]

" امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ جمعہ اور دیگر فرض نماز کے قائم کرنے سے رک جائیں تو ان سے قتال کیا جائے گا اور کوئی ایک شخص ایسا

[۱] شرح السير الكبير، باب ما لا يكون لأهل الحرب من إحداث الكنائس والبيع وبيع الخمور،ص ۱۵۳۲.

[۲] المحيط البرهاني في الفقه النعماني،كتاب الصلاة،--- ج۱ ص۳۳۹.

کرے تو میں بطور سزا اس کو ماروں گا۔ جو لوگ نماز عید، باجماعت نماز اور اذان وغیرہ سنتوں کے تارک ہوں تو میں ان کو حکم تو دیتا ہوں اور ان احکام کے چھوڑنے پر مار پیٹ کی سزا بھی دیتا ہوں لیکن ان کے خلاف قتال نہیں کرتا، تاکہ فرض اور سنن میں فرق واضح ہو جائے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اذان، نماز عید وغیرہ اگرچہ سنن میں سے ہیں لیکن دین کے شعار وعلامات ہیں تو ان کے چھوڑنے پر اصرار کرنا دین کا استخفاف ہے اس لئے ان کے خلاف قتال کیا جائے گا۔"

حضرت مفتی رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے ایک سکول کے متعلق استفسار کیا گیا جس میں عیسائی مشنری ہندوستان کے اندر مسلمان عورتوں سے حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق کفریہ کلمات کہلواتی تھی، اس سوال کے جواب میں حضرت رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اوران سخت کلمات کی پروانہ کرنا اور سہل جاننا بھی یہ کفر ہے "الاستهانة بالمعصية بأن يعدها هينة و يرتكبها من غير مبالاة بها ويجريها مجرى المباحات في ارتكابها كفر" [۱]

استخفاف کی ایک صورت لاپرواہی

البتہ فقہی کتابوں میں بعض اوقات لفظِ استخفاف ایک اور معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے جہاں شریعت کا معارضہ وعناد مقصود ہوتا ہے نہ ہی شرعی نصوص میں وارد شدہ

[۱] تألیفات رشیدیہ، عنوان "عمداً کلمہ کفر بولنا" ص۶۶.

وعیدات کا انکار یا اس کا تمسخر کرنا منظور ہوتا ہے، بلکہ یوں ہی کوئی شخص کسی گناہ یا حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے، مثال کے طور پر ایک شخص کوئی فریضہ چھوڑتا ہے یا سود وغیرہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، ان دونوں گناہوں کے متعلق جو کچھ وعیدیں قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں، ان کا انکار نہیں کرتا اور نہ ہی ان شرعی احکام کا معارضہ یا مقابلہ کرنا مقصود ہوتا ہے، بلکہ ان تمام باتوں کا یقین ہوتا ہے لیکن اپنی عملی کوتاہی کی وجہ سے اپنے آپ کو گناہ وسزا کا مستحق سمجھتا ہے اور یہ دونوں کام چونکہ اس کے معمول میں شامل ہیں، اس لئے ہر مرتبہ اس کے ارتکاب کرنے پر کوئی زیادہ پرواہ بھی نہیں کرتا، تو ایسے شخص کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا گو اس کا رویہ سرسری نظر میں "استخفاف" معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے بعض کتابوں میں اس کو لفظِ استخفاف کے ساتھ تعبیر بھی کیا گیا ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نماز کے ایک مسئلہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

قلت: لكن كونه سنة مؤكدة لا يستلزم الإثم بتركه مرة واحدة بلا عذر، فيتعين تقييد الترك بالاعتياد والإصرار توفيقا بين كلامهم كما قدمناه، فإن الظاهر أن الحامل على الإصرار على الترك هو الاستخفاف بمعنى التهاون وعدم المبالاة، لا بمعنى الاستهانة والاحتقار، وإلا كان كفرا كما مر خلافا لما فهمه في النهر فتدبر.[۱]

ترجمہ: "سنت مؤکدہ ہونے کے باوجود ایک مرتبہ چھوڑنے سے بندہ گنہگار نہیں ہوتا (البتہ جن فقہاء نے سنتِ مؤکدہ چھوڑنے کو گناہ بتایا ہے اس کا مطلب یہ

---

[۱] رد المحتار على الدر المختار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ج۱ ص ٤٧٤.

ہے کہ باربار چھوڑے اوراس کی عادت بنائے۔) لہذاباربار چھوڑنے اورعادت بنانے کی قید ضروری ہے۔اس کے ساتھ فقہاء کرام کی عبارات بھی باہم متفق ہوں گی، کیونکہ جو کوئی سنت باربار چھوڑتا ہے وہ اہمیت کا حامل نہ سمجھنے کی وجہ سے ایسا کرتا ہے نہ یہ کہ وہ اسے حقیر سمجھتا ہے، کیونکہ اسے حقیر سمجھنا تو کفر ہے۔"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ استخفاف کی دو صورتیں ہیں: ایک احتقار اور استہانت کے معنٰی میں جو کہ کفر ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ احتقار کے بغیر یوں ہی لا پرواہی برتی جائے، یہ کفر نہیں ہے۔

استہزاء

"استہزاء" ہزء سے مشتق ہے، جو اگرچہ لغت میں کئی معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر بنیادی طور پر یہ لفظ کسی کے ساتھ مذاق اور مسخرہ پن کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، خود قرآن کریم نے بھی متعدد جگہوں پر اس مادے کو اسی معنٰی میں استعمال فرمایا ہے۔

علامہ ابن فارس رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

(هزأ) الهاء والزاء والهمزة كلمة واحدة. يقال: هزئ واستهزأ، إذا سخر. [۱]

علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ فرمایا کہ استہزاء اگرچہ باب استفعال کا صیغہ ہے جس میں عام طور پر طلب کا معنٰی پایا جاتا ہے جس کے مطابق اس کا" معنٰی مذاق اڑانے کو طلب کرنا" ہونا چاہئے، لیکن یہاں اس سے یہ معنٰی مراد نہیں لیا جاتا، بلکہ مذاق

---

[۱]مقاييس اللغة،ج٦ ص:٥٢.

اُڑانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔[۱]

استہزاء کیا ہے؟

قرآن وسنت کے متعدد دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا مذاق اُڑانا کفر ہے، حضرات فقہاء کرام نے دین کے تمام ثابت شدہ احکام کو بھی اس میں داخل فرمایا کہ دین کے کسی بھی حکم کے ساتھ استہزا کرنا کفر ہے، استہزاء چونکہ کوئی مشکل یا کوئی نیا لفظ نہیں تھا ،اس لئے اس کی تعریف کرنے کی کوئی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی، عام عادت میں لوگ جس چیز کو استہزاء ومذاق سمجھتے ہیں اسی کو استہزاء قرار دیا جائے گا، اسی طرح کسی کی کمزوری، اس کے عیوب ونقائص کو مسخرانہ انداز میں بیان کرنا بھی استہزاء کی شکل ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ومعنى السخرية الاستهانة والتحقير والتنبيه على العيوب و النقائص على وجه يضحك منه. [۲]

"سخریہ کا معنیٰ مذاق اُڑانا، حقارت کرنا، اور عیوب ونقائص کی طرف ایسے انداز میں اشارہ کرنا ہے جس سے ہنسا جائے۔"

نیز استہزاء کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ خاص زبان سے کوئی مضحکہ خیز بات نکالی جائے، بلکہ بعض اوقات اشارات اور حرکات وسکنات کے ذریعے بھی کسی کا مذاق اُڑایا

[۱] المفردات في غريب القرآن ،ص ۸۴۱.
[۲] إحياء علوم الدين ، كتاب آفات اللسان،ج۳ص۱۳۱ .

جاتا ہے اوراس کو مذاق کہا اور سمجھا جاتا ہے، ایسی تمام صورتیں استہزاء کے عموم میں داخل ہیں، اگر کوئی شرعی احکام یا شعائر اللہ کے ساتھ اس طرح استہزاء سے پیش آئے تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔

امام غزالی رحمہ اللہ مندرجہ بالا عبارت کے بعد لکھتے ہیں:

وقد يكون ذلك بالمحاكاة في الفعل والقول وقد يكون بالإشارة والإيماء.

" کبھی یہ مذاق کام یا گفتگو میں نقل اتارنے کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی اشارہ کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔ "[۱]

شرعی احکام کا مذاق کفر ہے

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو ملک شام فتح ہونے اور وہاں کے خزانے غنیمت میں آنے کی پیش گوئی فرمائی، تو چند منافقین بطور استہزاء یہ کہنے لگے کہ "اس شخص" کا یہ خیال ہے کہ ملک شام فتح ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو منافقین کے ان کرتوت کی اطلاع دیدی، اور حضور ﷺ نے ان منافقین کو واضح فرمایا کہ ایسا کہنا کفر ہے۔

چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللهِ وَآيَاتِهِ

[۱] أيضا.

وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ (٦٥) لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ (٦٦)

"اور اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہدینگے کہ ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کررہے تھے آپ (ان سے) کہدیجئے گا کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے۔ تم اب (یہ بیہودہ) عذر مت کرو تم اپنے کو مؤمن کہہ کر کفر کرنے لگے، اگر ہم تم میں سے بعض کو چھوڑ بھی دیں تاہم بعض کو تو (ضرور ہی) سزا دینگے بسبب اس کے کہ وہ (علم ازلی) میں مجرم تھے۔"

اس آیت کریمہ میں منافقین کی اس تضحیک کو کفر قرار دیا گیا، امام ابو بکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

فيه الدلالة على أن اللاعب والجاد سواء في إظهار كلمة الكفر على غير وجه الإكراه لأن هؤلاء المنافقين ذكروا أنهم قالوا ما قالوا لعبا فأخبر الله عن كفرهم باللعب بذلك وروي عن الحسن وقتادة أنهم قالوا في غزوة تبوك أيرجو هذا الرجل أن يفتح قصور الشام وحصونها هيهات هيهات فأطلع الله نبيه على ذلك فأخبر أن هذا القول كفر منهم على أي وجه قالوه من جد أو هزل فدل على استواء حكم الجاد والهازل في إظهار كلمة الكفر ودل أيضا على أن الاستهزاء بآيات الله وبشيء من شرائع دينه كفر فاعله-

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکراہ کے بغیر کلمہ کفر کہنے میں سنجیدگی کیساتھ کہنے والے اور مذاق کرنے والے کا حکم ایک ہے۔۔اوراس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور دین کے احکام کیساتھ استہزاء کرنا کفر ہے۔" [۱]

استہزاء کے موجب کفر بننے کی اصل وجہ

اس سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کا استہزا کفر ہے جس کی وجہ سے کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعظیم و محبت ایمان کے ان بنیادی لوازمات میں سے ایک ہے جن کے نہ ہونے سے ایمان کا اعتبار نہیں ہوتا، اوراستہزا کرنے کی صورت میں چونکہ تعظیم باقی نہیں رہتی اس لئے اس کو بالاتفاق کفر قرار دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ استہزاء کے موجب کفر ہونے کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ فرائض واجبات کا مذاق اڑائے بلکہ اگر سنت کا بھی کوئی مذاق اڑائے تو بھی کافر ہو جائے گا بشرطیکہ اس کو اس کے مسنون ہونے کا علم ہو۔

علامہ داماد آفندی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ومن استخف بسنة أو حديث من أحاديثه عليه الصلاة والسلام.. كفر.

"جو شخص کسی سنت یا حضور ﷺ کی احادیث میں سے کسی حدیث کا مذاق اُڑائے تو وہ کافر ہے۔"[۲]

---

[۱] أحكام القرآن للجصاص،ج٤ ص ٣٤٨.

[۲] مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر ، كتاب السير، باب المرتد،ج١ ص ٦٩٢.

ایک اُصولی اشکال اور اس کا جواب

عام طور پر اُصولیین حضرات جب خبر واحد کا حکم ذکر فرماتے ہیں تو اس میں یہ تفصیل ذکر کرتے ہیں کہ استخفاف کے ساتھ اس کو چھوڑنا فسق ہے اور تاویل کے ساتھ ترک کرنا فسق نہیں ہے، اس سے یہ اشکال پیدا ہو جاتا ہے کہ فقہاء کرام کے نزدیک تو کسی بھی حدیث و سنت اور دینی احکام کا استخفاف بھی کفر ہے، یعنی اگر کسی کے علم کے مطابق کوئی حدیث یا سنت حضور ﷺ سے ثابت ہو اور اس کے باوجود اس کا استخفاف کرے تو فقہاء کرام کی جزئیات کے مطابق وہ کافر قرار پائے گا جبکہ اُصولیین کے نزدیک یہ فسق ہے کفر نہیں، جس سے خیال ہوتا ہے کہ فقہاء کرام کی یہ جزئیات خلاف اُصول ہیں۔

لیکن یہ شبہ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ فقہاء کرام کے نزدیک استخفاف کا معنیٰ اور ہے اور اُصولیین کے نزدیک اور، فقہاء صرف خبر واحد پر عمل نہ کرنے کو استخفاف نہیں کہتے، بلکہ اگر چھوڑنے کے ساتھ ساتھ استہزاء کا ارتکاب کیا جائے تو استخفاف کہلائے گا جبکہ اُصولیین صرف عمل نہ کرنے یا ثبوت سے انکار کرنے کو بھی استخفاف قرار دیتے ہیں، اگرچہ اس میں استہزاء کا کوئی پہلو موجود نہ ہو، لہٰذا یہ محض اصطلاحات کا فرق ہے حقیقت میں دونوں حضرات کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

فقہاء کرام جس چیز کو استخفاف سمجھتے ہیں وہ دونوں کے نزدیک کفر ہے اور اُصولیین کے نزدیک جو چیز استخفاف قرار پاتی ہے وہ دونوں کے نزدیک کفر نہیں، بلکہ فسق ہے۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وقد ظهر لي أنّ معنى الاستخفاف مختلف فمراد الأصوليين به

الإنكار بغير تأويل مع رسوخ الأدب ومراد الفقهاء الإنكار مع الاستهزاء ولا شكّ في كون الثاني كفرا. [۱]

" مجھے واضح ہوا کہ استخفاف کا معنیٰ مختلف ہے، اُصولیین کے نزدیک اس سے تاویل کے بغیر انکار کرنا مراد ہے جب وہ پورے ادب واحترام کے ساتھ ہو اور فقہاء کرام کے نزدیک اس سے استہزا کے ساتھ ترک کرنا مراد ہے، اور دوسرے مفہوم کے مطابق اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔"

استہزاء کی بناء پر تکفیر کرنے کی شرائط

استہزاء تب ہی موجب کفر بنے گا جب خود حکم شرعی پر استہزاء کی جسارت کی جائے، اگر دیگر عناصر کی وجہ سے کوئی استہزاء کرے خود حکم شرعی کا استہزاء کرنا مقصود نہ ہو تو جس چیز کا استہزاء کیا جارہاہے اگر اس کا شریعت سے کوئی نسبت ہو تو ایسی صورت میں استہزاء کرنا اگرچہ خطرہ سے خالی نہیں مگر محض اس کی بناء پر اس کو کافر قرار دینا بھی درست نہیں، مثلاً ایک شخص نے داڑھی رکھی ہے مگر اس کا پوری طرح خیال نہیں رکھتا جس کی وجہ سے بال اِدھر اُدھر بکھرے پڑے رہتے ہیں، اب اگر کوئی شخص اس بدحالی اور پراگندگی کی وجہ سے اس کا مذاق اُڑائے، خود داڑھی کا مذاق واستخفاف بالکل مقصود نہ ہو تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا، کیونکہ داڑھی رکھنا شریعت کا حکم ہے جس کا مذاق اُڑانا کفر ہے لیکن داڑھی والے کا مذاق کفر نہیں۔

یہی حکم علماءِ کرام کے مذاق اُڑانے اور ان کی توہین وتذلیل کرنے کا بھی ہے کہ

[۱] مشكوة الأنوار في أصول المنار، ص:۲۵۳. مكتبه إسلاميه كوئته.

اس منصب کی حامل شخصیات کا توہین و تحقیر کرنا بالکل ناجائز اور بڑی ناشکری ہے، لیکن اس اقدام کی وجہ سے کسی کو تبھی کافر قرار دیا جاسکتا ہے جب اسی علم دین کی وجہ سے مذاق اُڑائے، اگر کسی ذاتی رنجش یا دنیوی ناراضگی کی وجہ سے کوئی ایسا کرے تو اس کو کافر قرار دینا غلط ہے، البتہ اگر کہیں کسی کے بارے میں یقین ہو جائے کہ وہ محض دینی علم کی یا دینی نسبت کی وجہ سے مذاق اُڑا رہا ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

علامہ ابن قاضی سماوہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أبغض عالماً أو فقيهاً بلا سبب ظاهر خيف عليه الكفر..جلس على مكان مرتفع وتشبه بالمذكرين و يتمسخر و القوم يضحكون كفروا وكذا من تشبه بالمعلمين في مجمع ويضحك القوم كفروا جميعاً. [۱]

"اگر کسی ظاہری وجہ کے بغیر کسی فقیہ یا عالم (دین) سے نفرت کی تو اس پر کفر کا ڈر ہے۔۔ کوئی شخص کسی بلند جگہ بیٹھا، واعظ کی طرح مشابہت اختیار کر کے مذاق اُڑانے لگا اور لوگ اس کو دیکھ کر ہنسے تو سب کافر ہوئے، اسی طرح جو شخص کسی مجلس میں (دینی علوم کے) معلّمین کی طرف مشابہت اختیار کرے اور لوگ اس سے ہنسے تو سب کافر ہو جائیں گے۔"

پہلی صورت میں جزم کے ساتھ کافر نہ کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہاں خود علم دین کی توہین یقینی نہیں، جبکہ دوسری صورت میں چونکہ دین علم و تعلیم ہی کا مذاق مقصود ہے، اس

[۱] جامع الفصولين، الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية، ج۲ ص ۱۷۱.

لئے اس کو جزم کے ساتھ موجب کفر قرار دیا گیا۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ ان دونوں مسائل کو نقل کرنے کے بعد مزید فرمایا ہے۔

یکفر الجمیع لاستخفافھم بالشرع. وکذا لو لم یجلس علی مکان مرتفع ولکن یستھزئ بالمذکرین ویتمشی والقوم یضحکون. [۱]

"سب (مذاق اُڑانے والے اور ہنسنے والے ناظرین) کافر ہو جائیں گے، کیونکہ اُنہوں نے شریعت کا مذاق اُڑایا، اسی طرح اگر کوئی اُونچی جگہ تو نہ بیٹھے، لیکن واعظین کا استہزاء کرے، (تذلیل کے لئے ان کی طرح) چلے اور لوگ اس سے ہنسے (تو بھی سب کافر ہو جائیں گے۔)"

ان عبارات میں ہنسنے والے ناظرین کو بھی کافر قرار دیا گیا کیونکہ ہنسنا خوشی اور رضامندی کی دلیل ہے، لہٰذا اس موقع پر ہنسنے کا مطلب یہ ہے کہ مذاق اُڑانے پر خوش ہو رہا ہے اور چونکہ خود یہ مذاق اُڑانا کفر ہے، لہٰذا اس پر راضی ہونا بھی کفر ہے، لیکن اگر کہیں کوئی کلام ایسا مضحکہ خیز ہو کہ جس کے بعد ہنسنا اختیار میں نہ رہے تو البتہ اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ کفر وارتداد کیلئے اختیار ورضامندی شرط ہے۔

علامہ ملا خسرو رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ومن تکلم بکلمة الکفر وضحك غیره یکفر الضاحك إلا أن

---

[۱] البحر الرائق، کتاب السیر، باب أحکام المرتدین، ج۵ ص ۱۳۲.

يكون الضحك ضروريا بأن يكون الكلام مضحكا. [۱]

"جو کوئی کفریہ بات کہے اور دوسرا شخص سن کر ہنسے تو ہنسنے والا کافر ہو جائے گا، تاہم اگر ہنسنا ضروری ہو کہ مثلاً کلام مضحکہ خیز ہو (تو اس صورت میں ہنسنا کفر نہیں)۔"

دوسری شرط

استہزاء کے موجب کفر ہونے کے لئے دوسری بڑی شرط یہ ہے کہ مذاق اُڑانے والے کو یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا میں مذاق اُڑا رہا ہوں، وہ واقعۃً امر دینی ہے، اگر کسی نے لاعلمی میں کسی سنت کا مذاق اُڑایا تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی جیسا کہ موانعِ تکفیر کے ضمن میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

فقہاءِ کرام کی ذکر کردہ تفصیل پر اشکال کا جواب

بعض لوگوں کی طرف سے اس پر یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ ایمان و کفر کا دار مدار اصلاً قلب پر ہے جو ایک پوشیدہ امر ہے، اس لئے اصل مدار کو معلوم کئے بغیر محض قرائن کی بنیاد پر تکفیر جیسا بڑا اقدام جائز نہیں، اپنے اس خیال کے تحت وہ فقہاء کرام کی ان تفصیلات کو قابل توجہ نہیں سمجھتے بلکہ (معاذاللہ) ان کو بے احتیاطی اور حد سے تجاوز قرار دیتے ہیں، اور اپنے اس خیال کی بناء پر ان حضرات کی فیاضی کا یہ عالم ہے کہ شاید دنیا میں کسی کو بھی کافر نہیں کہتے۔

لیکن یہ اشکال بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ متعدد نصوص میں قرائن کی بناء پر کسی کو

[۱] درر الحكام شرح غرر الأحكام ، قبيل كتاب النكاح، ج١ ص ٣٢٤.

کافر قرار دیا گیا چنانچہ سورۃ براءۃ کی مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کو کافر قرار دیا، حالانکہ اُنہوں نے یہ بہانا بنایا تھا کہ ہم صرف خوش دلی اور مذاق کے طور پر یہ کہتے ہیں، حضور ﷺ کی تکذیب کرنا ہمارا مقصود نہیں، لیکن قرآن کریم میں ان کے باوجود ان کو کافر کہا گیا اور ان کا یہ بہانہ قابل التفات نہ ہوا۔

آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین اور اُمت کا اجماعی تعامل بھی یہی رہا کہ کسی کے دل کے اندر جھانک کر یہ معلوم نہیں کیا کہ تصدیق برقرار ہے یا اس کی جگہ تکذیب آگئی ہے، بلکہ اُمت نے ہمیشہ شریعت کے دیئے ہوئے معیار کے مطابق ایمان و کفر کا فیصلہ کیا اور اسی کے مطابق شرعی احکام کو جاری فرمایا ہے۔

منکرینِ زکوۃ کے متعلق حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے مکالمہ اور اس کے بعد تمام صحابہ کرام کے اتفاق کے بعد اس بات میں کوئی اشکال باقی نہیں رہ پاتا۔

ایک مسلمہ ضابطہ

اس کے علاوہ دین اور عقل دونوں کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ جو چیز پوشیدہ ہو جس کی حقیقی صورت حال معلوم کرنا انسان کے بس میں نہ ہو تو وہاں ظاہری قرائن ہی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے، مثلاً خوش ہونا دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے اسی طرح غمگین ہونا بھی ایک خاص دلی کیفیت ہے اور ظاہر ہے کہ دلی کیفیات کی یقینی صورت حال معلوم نہیں ہوسکتی، بلکہ اگر کوئی دل کھول کر بھی معلوم کرنا چاہے تو ناکامی ہی اس کی تقدیر بنے گی ، کیونکہ کیفیت آنکھ سے نظر آنے والی چیز ہے ہی نہیں، اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم اس دنیا میں کسی کو خوش یا غمگین نہ کہا جائے ورنہ یہ جھوٹ شمار ہوگا کہ دل کی حالت کا علم حاصل کئے بغیر ہی اس کا فیصلہ کیا اور جھوٹ کے گناہ کبیرہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کوئی نہیں کرتا، پوری انسانیت اس تکلف کا کوئی خیال نہیں کرتی، بلکہ انسان کی ظاہری صورت حال دیکھ کر بلا تکلف خوش ہونے یا ناخوش ہونے کے فیصلے کرتی رہتی ہے، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان جیسے پوشیدہ اُمور کے متعلق فیصلہ کرنے میں ظاہری قرائن ہی کافی ہیں، بس یہی حال کفر واسلام کا بھی ہے کہ ان دونوں کا اصل مدار اگرچہ دل کی تصدیق وتکذیب پر ہے لیکن چونکہ اس کا یقینی علم ہمیں حاصل نہیں ہوسکتا، اس لئے شریعت مطہرہ میں بعض مضبوط قرائن کو اس کے قائم مقام ٹھہرائے گئے ہیں۔

علامہ موصلی، قاسم قطلوبغا اور علامہ خیالی کی وضاحت

علامہ ابن مودود موصلی رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

أن الإتيان بخاصية الكفر يدل على الكفر، فإن من سجد لصنم أو تزيا بزنار أو لبس قلنسوة المجوس يحكم بكفره. [۱]

"کفر کے امتیازی کام کا ارتکاب کرنا کفر پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ جو شخص بت کو سجدہ کرے، یا زنار باندھے یا مجوسیوں والی ٹوپی پہنے تو اس کے کافر ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

علامہ زین الدین قاسم بن قطلوبغا رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أن الشارع اعتبر في إثبات الكفر وجود علامة التكذيب فقط

"شریعت نے کفر کے اثبات میں تکذیب کی علامت موجود ہونے کا اعتبار کیا

[۱] الاختيار لتعليل المختار ،كتاب السير،فصل فيما يصير به الكافر مسلما،ج٤ ص ١٥٠ .

ہے۔" [۱]

علامہ خیالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

أن إمارة الأمور الخفية كافية في صحة إطلاق اللفظ علي سبيل الحقيقة كالغضبان والفرحان- [۲]

"پوشیدہ اُمور کی نشانی کا موجود ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ حقیقی معنیٰ میں لفظ اس کے لئے استعمال کیا جائے جیسے غصہ اور خوشی کے نشانات دیکھ کر کسی کو غصہ آور یا خوش کہنا"۔

[۱]حاشية الإمام قاسم علي المسائرة، الخاتمة: في بحث الإيمان، ص۲۸۱.

[۲] خيالي على شرح العقائد، ص۱۳۳.

فصل دوم

یہاں تک جو تفصیلات ذکر کی گئی، ان میں تکفیر اور اُصول تکفیر کے متعلق مختلف مباحث ذکر ہوئے جن کو عام طور پر حضرات فقہاء کرام اور متکلمین مختصراً ذکر فرماتے ہیں، ان مختلف مباحث کے بعد تکفیر کے منضبط قاعدہ بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ، کیونکہ متفرق مباحث عام طور پر ان جیسے گھمبیر مسائل کا یقینی حل نہیں بنتے، نہ ہی ہر وقت ان کا استحضار ہو سکتا ہے، بلکہ عام طور پر ترتیب اور انضباط ہی سے یہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

تکفیر کے باب میں نہایت جامع اور منضبط ضابطہ

ایمان اور کفر دو متضاد حقائق ہیں ، ایمان حضور ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کے یقین اور تصدیق کرنے کو کہا جاتا ہے جس کا تقاضا شریعت کی موافقت اور اس کی اتباع ہے اور کفر نام ہے شریعت کی مخالفت کا، لیکن شریعت میں ہر مخالفت کو کفر قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس میں کچھ تفصیل مقرر کی گئی، اسی تفصیل کو یہاں ذکر کرنا مقصود ہے۔[۱]

شریعت کی مخالفت کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

۱۔ شریعت نے کسی کام کرنے کا حکم دیا، اس کو نہ کرنا یعنی شریعت کے اوامر اور مشروعات پر عمل نہ کرنا۔

---

[۱] اس ضابطہ کی تیاری میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ ابراہیم بن عامر الرحیلی صاحب کی کتاب "التکفیر وضوابطہ" سے بھی ایک حد تک استفادہ کیا گیا۔

۲۔ جن چیزوں سے روکا گیا ہے، ان سے نہ رکنا، یعنی نواہی اور ممنوعات کا ارتکاب کرنا۔

ان دونوں اقسام کی تین تین ذیلی قسمیں ہیں۔

چونکہ ایمان و کفر کا تعلق انسان کے تین چیزوں کے ساتھ ہے، اعتقاد، قول اور عمل، اس لئے شریعت کے احکام واوامر پر عمل نہ کرنے کی بھی یہی تین صورتیں ہیں:

الف: شریعت نے جن عقائد کا حکم دیا، اس میں شریعت کا حکم نہ ماننا، قرآن و سنت نے جن عقائد کے رکھنے کا حکم دیا وہ نہ رکھنا۔

ب: شریعت نے جن باتوں کے کہنے کا حکم دیا، اس کو بجا نہ لانا۔

ج: دین اسلام نے جن کاموں کے کرنے کا پابند بنایا، ان کی پابندی نہ کرنا یعنی ان پر عمل نہ کرنا۔

اعتقاد میں شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم

جن اُمور کے اعتقاد کا شریعتِ مطہرہ نے حکم دیا ہے، ان کا اعتقار کھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی پیغامِ ہدایت لے کر آئے، اس کو حق و سچ سمجھنا اور اس کی تصدیق کرنا شرعاً لازم ہے، ان ہی تعلیمات میں سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، توحید و عظمت، حضور ﷺ کی شخصیت، ان کی تعظیم و محبت، دین اسلام کی حقانیت، اہمیت و ضرورت اور قیامت قائم ہونے وغیرہ وغیرہ مختلف ضروری اور بنیادی عقائد ہیں جن کو متکلمین حضرات اپنی اپنی کتابوں میں ذکر فرماتے ہیں، شریعت نے مسلمان کو ان جیسے تمام ثابت شدہ عقائد رکھنے کا مکلف بنایا ہے۔

اگر کوئی شخص اس باب میں شریعت کی مخالفت کرے یعنی جن اُمور کے اعتقاد کو شریعت نے ضروری قرار دیا ہے، اور کوئی شخص وہ عقیدہ نہ رکھے، یا کوئی اس عقیدے کا

انکار کر بیٹھے تو اس کا حکم یہ ہے کہ جن عقائد کا دینِ اسلام میں سے ہونا تواتر اور پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہو، اس کا انکار کرنا کفر ہے۔

اور جو عقائد اس درجہ یقین کے ساتھ ثابت نہ ہوں مثلاً فرشتہ افضل ہے یا عام انسان؟ یا اس جیسے دیگر ظنی مسائل، تو اس کا اعتقاد نہ رکھنا کفر نہیں اور محض اس کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا، تاہم بعض اوقات فاسق قرار پاتا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وكذلك نقطع بتكفير كل من كذب وأنكر قاعدة من قواعد الشرع وما عرف يقينا بالنقل المتواتر من فعل الرسول ووقع الإجماع المتصل عليه كمن أنكر وجوب الصلوات الخمس وعدد ركعاتها وسجداتها ويقول إنما أوجب الله علينا في كتابه الصلاة على الجملة وكونها خمسا وعلى هذه الصفات والشروط لا أعلمه إذ لم يرد فيه في القرآن نص جلي والخبر به عن الرسول صلى الله عليه وسلم خبر واحد-

"ہم ہر اس شخص کی تکفیر پر جزم کرتے ہیں جو شریعت کے کسی قاعدے کی تکذیب و انکار کرے یا حضور ﷺ کے کسی ایسے فعل کا انکار کرے جو یقین و تواتر کے ساتھ ثابت ہو اور اس پر اجماع ہو چکا ہو جیسا کہ کوئی پنج وقتہ نمازوں اور ان کی رکعات و سجدات کا انکار کر بیٹھے اور کہے کہ ہم پر تو صرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز فرض کی ہے، اس سے زیادہ باتوں کو(مثلاً پانچ وقت ہونا وغیرہ وغیرہ) میں نہیں جانتا، کیونکہ قرآن میں اس کے متعلق کوئی واضح نص

موجود نہیں ہے اور حضور ﷺ کی حدیث خبر واحد ہے۔" [۱]

امام طبری رحمہ اللہ نے بڑا اچھا نکتہ لکھا کہ اگر کوئی شخص دین کے تمام احکامات کی تصدیق کرے، اس کو دل وجان سے تسلیم بھی کرے لیکن صرف کسی ایک ثابت شدہ کا انکار کرے تو وہ مسلمان نہیں، بلکہ کسی نبی یا آسمانی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے تمام مندرجات کی تصدیق کی جائے، اگر ان میں سے کسی ایک حکم کا بھی انکار کرے تو وہ ایمان نہیں بلکہ کفر ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

أن المؤمن بالكتب والرسل، هو المصدق بجميع ما في الكتاب الذي يزعم أنه به مصدق، وبما جاء به الرسول الذي يزعم أنه به مؤمن. فأما من صدق ببعض ذلك وكذب ببعض، فهو لنبوة من كذب ببعض ما جاء به جاحد، ومن جحد نبوة نبي فهو به مكذب.

"کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے والا وہ شخص کہلائے گا جو اس کتاب کے تمام مندرجات پر ایمان لائے جس کی وہ خود تصدیق کر رہا ہے اور جس رسول ﷺ کی وہ تصدیق کرتا ہے اس کی لائی ہوئی تمام باتوں پر ایمان لائے، لہٰذا جو شخص ان میں سے کچھ کی تصدیق اور کچھ کی تکذیب کرتا ہے گویا وہ اس نبی کی نبوت کا انکار کرتا ہے جس کی یہ بات ہے اور جو کسی نبی کی نبوت کا انکار کرے تو وہ اس کی

---

[۱] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، فصل في بيان ما هو من المقالات كفر وما يتوقف أو يختلف فيه وما ليس بكفر، ج۲ ص۲۸۷.

تکذیب کرتا ہے۔" [۱]

اقوال میں شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم

جن اقوال کا شریعت کی طرف سے ایک مسلمان کو پابند بنایا گیا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم ان اقوال کی ہے جن پر خود شریعت نے اسلام کا دار مدار رکھا ہے، اور اس کے نہ کہنے کی وجہ سے کسی پر کفر کے احکام جاری ہوتے ہیں، اور دوسری قسم زبان سے ادا کی جانے والے ان اورادو عبادات کی ہے جن کو شریعت میں پہلی قسم کی طرح ایسا لازم نہیں قرار دیا گیا کہ جس کی بناء پر ایمان یا کفر کا فیصلہ کیا جائے۔

شہادتین کی اہمیت

پہلی قسم میں صرف اور صرف شہادتین داخل ہیں یعنی توحید ورسالت کا اقرار، اگر کوئی شخص مطالبہ اور اصرار کے باوجود کسی عذر کے بغیر شہادتین کا تلفظ نہ کرے تو کم از کم دنیا کی حد تک اس پر کفار کے احکام جاری ہوں گے، کیونکہ ایمان وکفر کا اصل تعلق اگرچہ قلب کے ساتھ ہے لیکن شرعی احکام ظاہر پر مبنی ہوتے ہیں جس کا بہتر اور مناسب طریقہ یہی ہے کہ وہ زبانی طور پر توحیدِ خداوندی اور رسالتِ محمدی کا اقرار کرکے اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف کرے، اسی لئے بہت سی روایات میں بھی انسان کے معصوم ہونے کا دارو مدار اسی تلفظ بالشہادتین پر رکھا گیا، اور شاید اسی اہمیت کی بناء پر امام صاحب رحمہ اللہ

---

[۱]جامع البیان ،رقم الآیۃ: ۱۵۰،ج۹ص ۳۵۳.

ایمان کی تعریف میں اقرار باللسان کی قید بھی لگائی ہے جیسا کہ بہت سے حضرات متکلمین نے امام صاحب سے تعریف نقل فرمائی ہے۔ [۱]

شہادتین کے بغیر زبان سے ادا کی جانے والی تمام عبادات دوسری قسم میں داخل ہیں جس کو چھوڑنے کی وجہ سے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، مثلاً زبان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا شریعت نے مسلمان کو مکلف بنایا ہے، سلام کے جواب کو قرآن کریم نے ضروری قرار دیا ہے، اذان واقامت وغیرہ مختلف اُمور کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے، اور ایک مسلمان کو ان احکامات پر عمل کرلینا چاہیئے، بلاعذر اس کو چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص اس کو بلاعذر بھی چھوڑدے تو محض اس کی وجہ سے اس کو کافر کہنا جائز نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ شریعت میں جن قولی عبادات کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے صرف ایک شہادتین ہی ہیں جس کو چھوڑنے سے کسی شخص کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے، باقی اقوالی عبادات پر عمل نہ کرنا موجب کفر نہیں۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی تحقیق

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے ایمان کی تعریف پر تحقیقی بحث فرمائی ہے کہ اس میں اقرار باللسان کی قید لگانی چاہیئے یا نہیں؟ اس میں متکلمین کے دو مؤقف بیان فرمائے ہیں، اس کے بعد یہی تحریر فرمایا کہ اس بحث سے ہٹ کر کہ ایمان کی تعریف میں تصدیق کے ساتھ ساتھ زبانی اقرار کی قید لگائی جائے یا نہیں، یہ بات تمام حضرات کے نزدیک مسلم

---

[۱] المسايرة، خاتمة: ص ٢٧٤.

ہے کہ جب کبھی زبانی اقرار کا مطالبہ کیا جائے تو زبانی طور پر بھی اقرار کرنا ضروری ہے، ورنہ اگر ضرورت کے وقت مطالبہ کے باوجود بھی اس نے اقرار نہیں کیا اور کوئی عذر بھی موجود نہ ہو، تو اس عناد کی وجہ سے اور دنیا میں اس پر کفار کے احکام جاری ہوں گے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

اتفق القائلون بعدم اعتبار الإقرار على أنه متى طولب به أتى به، فإن طولب به فلم يقر فهو كفرعناد، وهذا ما قالوا إن ترك العناد شرط وفسروه به-

"جو حضرات اقرار کا اعتبار نہیں کرتے، ان کا بھی اتفاق ہے کہ جب مطالبہ کیا جائے تو اقرار کرنا ضروری ہے، اگر مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہ کرے تو یہ کفر عناد ہے، یہی وہ چیز ہے جو وہ کہتے ہیں کہ (اسلام معتبر ہونے کے لئے) ترک عناد شرط ہے اور اُنہوں نے عناد کی یہی تفسیر کی ہیں۔" [۱]

علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

من اعتقد الإيمان بقلبه ولم ينطق به بلسانه دون تقية فهو كافر عند الله تعالىٰ وعند المسلمين.

"جو کوئی دل سے ایمان کا عقیدہ رکھے اور زبان سے تقیہ کے بغیر بھی تلفظ نہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک کافر ہے (یعنی دنیاوآخرت

---

[۱]نفس المصدر، ص:۲۷۹.

دونوں میں وہ کافر شمار ہو گا)۔" [۱]

اعمال میں شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم

"اعمال" عمل کی جمع ہے اور یہاں عمل سے مراد شریعت کے وہ احکام وعبادات ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب ودماغ اور زبان کے علاوہ دیگر اعضاء وجوارح کے ساتھ ہو، مثلاًزکوۃ اور صوم وغیرہ عبادات۔

کونسے اعمال کفریہ ہیں اور کونسے نہیں؟

اس اعتبار سے اعمال کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک قسم وہ اعمال ہیں جن کے چھوڑنے کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے حضرات ائمہ اور علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے کہ آیاان کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جاسکتاہے یانہیں؟

۲۔ دوسری قسم ان اعمال کی ہے جس کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ ان کے چھوڑنے سے کوئی کافر نہیں ہوتا۔

پہلی قسم شہادتین کے علاوہ دین اسلام کے باقی چار بنیادی ارکان سے عبارت ہے جن کو حضور ﷺ نے اسلام کی بنیاد اور اس کے ستونون کی مانند قرار دیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم " بني الإسلام على خمس:

---

[۱]المحلى بالآثار، كتاب التوحيدج۱ ص٦١.

شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وإقام الصلاة، وإيتاء الزكاة، والحج، وصوم رمضان "[۱]

ترجمہ: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ ۱: توحید ورسالت کی گواہی دینا۔ ۲: نماز قائم کرنا۔ ۳: زکوٰۃ دینا۔ ۴: حج کرنا۔ ۵: رمضان کا روزہ رکھنا۔

اس حدیثِ مبارک میں جن پانچ چیزوں پر اسلام کا مدار رکھا گیا ہے، ان میں سے شہادتین کا حکم تو "قولی عبادات" کے تحت گزر چکا۔ اس کے علاوہ باقی چار ارکان کے متعلق اہل سنت والجماعت میں اختلاف ہے، بعض حضرات بلاعذر نماز چھوڑنے والے کو مختلف احادیث کی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں، لیکن نماز کے علاوہ دیگر ارکان کے تارک کو کافر نہیں کہتے، اور بعض حضرات کا چند دیگر روایات کی وجہ سے چاروں ارکان کے متعلق یہ مؤقف ہے کہ بلاعذر اگر کوئی مسلمان ان ارکان پر عمل نہ کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

امام زین الدین بن رجب رحمہ اللہ (۷۹۵ھ) نے اپنی کتاب "جامع العلوم والحکم" میں اس حدیث کی تشریح میں ان تمام اقوال کو کافی بسط وتفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ [۲]

ان چار اعمال وعبادات کے علاوہ دیگر تمام عبادات کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ محض ان کو چھوڑنے کی وجہ سے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج

---

[۱]صحيح البخاري،كتاب الإيمان، باب قول النبي ﷺ "بني الإسلام على خمس" رقم الحديث:۸.

[۲]جامع العلوم والحكم، الحديث الثالث: بنى الإسلام على خمس، ج۱ص۱۴۳ تا۱۵۳.

نہیں ہوتا۔

فقہاءِ احناف اور جمہور حضرات کا مؤقف

واضح رہے کہ ایمان کے ان چار ارکان کے متعلق اگرچہ بعض متقدمین ائمہ کرام سے یہ مؤقف منقول ہے کہ ان کا چھوڑنا کفر ہے اور چھوڑنے والا کافر دائرہ اسلام سے خارج ہے، لیکن جمہور اُمت اور فقہاء احناف کے نزدیک ان ارکان کا چھوڑنا کفر ہے، نہ چھوڑنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے، کیونکہ کفر ایمان کی ضد ہے، جس طرح ایمان تصدیق کا نام ہے اسی طرح کفر انکار و تکذیب کا نام ہے، اور نماز نہ پڑھنا، زکوۃ نہ دینا وغیرہ انکار کو مستلزم نہیں، بلکہ بعض اوقات دل میں مکمل تصدیق و یقین کے بغیر بھی ایسی کوتاہی ہو ہی جاتی ہے، اس لئے جمہور حضرات کے نزدیک اس کو کفر کہنا درست نہیں۔

علامہ زین الدین عراقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ذهب جمهور أهل العلم إلى أنه لا يكفر بترك الصلاة إذا كان غير جاحد لوجوبها، وهو قول بقية الأئمة أبي حنيفة ومالك و الشافعي، وهي رواية عن أحمد بن حنبل أيضا.

"جمہور اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ جب تک کوئی نماز کے واجب ہونے کا انکار نہ کرے تو صرف چھوڑنے کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا یہی قول باقی ائمہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ علیہم کا بھی ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔"[۱]

---

[۱] طرح التثريب في شرح التقريب، كتاب الصلاة، ج٢ ص١٤٧.

یہاں تک شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم کا حکم ذکر کیا گیا یعنی شریعت کے اوامر پر عمل نہ کرنا، اس کے بعد شریعت کے دوسری قسم کی مخالفت کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

مخالفت کی دوسری قسم

شریعت کی مخالفت کی دوسری بنیادی قسم یہ ہے کہ نواہی کا ارتکاب کیا جائے یعنی شریعت نے جن اُمور سے بچنے کی تلقین کی ہو کوئی شخص اسی کا ارتکاب کرے۔

پہلی قسم کی طرح اس کی بھی تین ذیلی قسمیں بنتی ہیں:

اعتقاد: یعنی جن عقائد سے بچنے کی ہدایت کی، اسی کو اختیار کرنا۔

اقوال: جن باتوں کے کہنے سے منع فرمایا گیا، انہی کا تلفظ کرنا۔

اعمال: جن کاموں کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا، ان کو کرنا۔

ذیل میں ہر ایک قسم کی تفصیل ذکر کر دی جاتی ہے۔

اعتقاد میں شریعت کے مخالفت کی دوسری قسم

شریعت نے جن اعتقادات سے بچنے کا حکم فرمایا، ان سے بچے رہنا ضروری ہے، رہا یہ سوال کہ کیا اس طرح عقیدہ رکھنے سے کوئی شخص کافر بھی ہو جائے گا یا نہیں؟

تو اس کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں بعض بنیادی عقائد کو ضروری قرار دیا گیا، مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لانا، اس کی وحدانیت کا عقیدہ، تمام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت ورسالت کا اعتراف، ان کی تعظیم ومحبت، کلام الٰہی کی تصدیق اور قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا عقیدہ، موجودہ تمام ادیان میں صرف اسلام کی حقانیت کا اعتقاد، قیامت قائم ہونے اور جزا وسزا، جنت وجہنم پر یقین رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

اگر کوئی شخص اپنی طرف سے کوئی ایسا عقیدہ تراشے جو دین حق کے ان جیسے قطعی

اور یقینی عقائد کی ضد ہو تو وہ یقیناً کفر ہے اور اس طرح عقیدہ رکھنے سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، یہی حکم "ضروریاتِ دین" کا بھی ہے جس کی پوری تفصیل اسی باب کے فصل اول میں گزر چکی ہے، اگر کوئی شخص ایسا عقیدہ رکھے جو ان ضروریات دین کی ضد یا نقیض ہو تو وہ بھی کفر ہے اور اس کی وجہ سے بھی انسان دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔

نیز باب اوّل میں ایمان کی کچھ شرائط اور لوازم ذکر کئے گئے ہیں، اگر کوئی شخص ان کے خلاف کوئی عقیدہ رکھے تو یہ بھی کفر ہے۔

اقوال واعمال میں مخالفت کی دوسری قسم

جن باتوں سے شریعت نے روکا اس سے بچتے رہنا ضروری ہے، اسی طرح جن کاموں کے کرنے سے شریعت نے منع فرمایا، ان سے بچے رہنا لازم ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کی مخالفت کرے یعنی ان ممنوعہ باتوں کا تلفظ کرے یا ان ناجائز کاموں کا ارتکاب کرے جن سے شریعت میں منع فرمایا گیا ہے، تو کیا اس کی وجہ سے وہ شخص کافر ہو جائے گا یا نہیں؟ اس پر کفر کے احکام جاری ہوں گے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب کو پوری طرح سمجھنے سے پہلے ایمان کی شرائط اور ارکان کو ایک بار پھر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو باب اول میں تحریر کئے گئے تھے، کیونکہ اس جواب کو کماحقہ سمجھنا ان شرائط کے استحضار پر موقوف ہے، اس لئے یہاں اولاً ان شرائط کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اس کے بعد مذکور سوال کا جواب دیا جائے گا۔

ایمان کے چار بنیادی لوازم

کتاب کے شروع میں ایمان کے پانچ شرائط ذکر کی گئیں ہیں، ان میں سے پہلی شرط اقرار باللسان تھی، یہاں اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ دنیوی احکام

جاری ہونے کی شرط تھی اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اصرار کے باوجود اقرار نہ کرنا بھی دراصل باقی لوازم کے ضمن میں داخل ہو جاتا ہے، باقی کل چار لوازم رہ جاتے ہیں:

۱۔ **رضا و محبت:** دین اور تمام ضروریاتِ دین پر راضی رہنا اور ان کے ساتھ محبت کرنا۔

۲۔ تعظیم و احترام: دین اور تمام ضروریاتِ دین کی تعظیم کرنا، ان کو قابل عظمت و احترام سمجھنا۔

۳۔ تسلیم و انقیاد: دین اور اس کے سارے قطعی احکام کی فرمان برداری کرنا۔

۴۔ مخالف ادیان و مذاہب سے بیزار ہونا۔

یہ چاروں اُمور ایمان کے ضروری لوازم ہیں، ان میں سے اگر کوئی ایک بھی فوت ہو جائے تو ایمان کالعدم شمار ہو گا اور اس طرح کرنے سے انسان مسلمان باقی نہیں رہے گا، کتاب کے شروع میں اس کی تفصیل گزر چکی کہ ان اُمور کو ایمان کا لازمہ کیوں قرار دیا گیا؟ وہاں حضرات متکلمین اور فقہاء کرام کی عبارات سے بھی اس لزوم کو واضح کیا گیا تھا اور عقلاً بھی اس کی وجہ لزوم بیان کی گئی ہے۔

ان اُمور کے لوازم ایمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کہیں یہ فوت ہو جائیں یا ان میں سے کسی ایک کی ضد یا نقیض پائی جائے [۱] تو ایمان جاتا رہے گا اور ایسے شخص کی تکفیر کی

فائدہ: ضد اور نقیض کے درمیان فرق

[۱] ضد اور نقیض دو مختلف الفاظ ہیں، دونوں اگرچہ عام طور پر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں مگر اصل معنٰی کے لحاظ سے دونوں کے درمیان فرق ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ضد اور نقیض دونوں الفاظ کا اطلاق کسی چیز کے منافی پر ہوتا ہے مگر دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ضدین میں سے ہر ایک وجودی ہوتا ہے جبکہ نقیضین کے درمیان عدم اور وجود کا تقابل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقیضین ایک جگہ

جائے گی، مثلاً محبت کی ضد بغض ہے اوراس کی نقیض عدم محبت ہے، اب اگر کوئی شخص اسلام کا دعوی کرتا ہے، لیکن دین اسلام یا اس کے کسی قطعی حکم کے ساتھ بغض رکھے یا اس کے ساتھ بالکل محبت نہ کرے تو ایسے شخص کو کافر قرار دیا جائے گا۔

تعظیم واحترام ایمان کا لازمہ ہے، تعظیم کی ضد توہین ہے اوراس کی نقیض عدم تعظیم، اب اگر کوئی شخص دین اسلام یا اس کے کسی قطعی حکم کی توہین وگستاخی کرے یا اس کی عدم تعظیم کرے تو بھی اس کو کافر ہی قرار دیا جائے گا۔

اسی طرح تسلیم وانقیاد بھی ایمان کے لوازم میں سے ہے، تسلیم کی ضد رد اور تردید ہے، انقیاد کی ضد انحراف، اور نقیض عدم تسلیم اور عدم انقیاد ہے، اگر کوئی شخص دین کے

جمع ہوسکتے ہیں نہ ہی بیک وقت ان دونوں کا ارتفاع ممکن ہے جبکہ ضدین کا اجتماع اگرچہ محال ہے لیکن ارتفاع بالکل ممکن بلکہ واقع ہے۔ مثلاً حرکت ایک لفظ ہے، اس کا معنٰی ہے گردش کرنا۔ اس کی نقیض سکون یعنی گردش نہ کرنا ہے، اب دنیا جہاں کے تمام اشیاء یا حرکت میں ہوں گے یا سکون ان کو لاحق ہوگا، کوئی بھی چیز ان دو حالتوں سے خارج نہیں ہے، نہ ہی یہ دونوں عوارض ایک ہی چیز کو ایک ہی وقت میں ایک ہی حیثیت سے عارض ہوسکتے ہیں کیونکہ نقیضین کا اجتماع وارتفاع دونوں ممکن نہیں ہے۔

اور ضدین کی مثال جیسا کہ سواد اور بیاض، یعنی سفیدی اور کالا پن، کہ ایک چیز ایک وقت میں ان دونوں اوصاف کی حامل نہیں ہوسکتی لیکن ممکن ہے کہ کوئی چیز نہ کالی ہو نہ سفید بلکہ زرد یا سبز ہو۔

علامہ عسکری لکھتے ہیں:

الفرق بين الضد والنقيض: قيل: النقيضان: ما كان التقابل بينهما تقابل النفي والاثبات أو العدم، والملكة، ولذا لا يمكن اجتماعهما في مادة، ولا ارتفاعهما كالحركة والسكون. وأما المتضادان: فيجوز ارتفاعهما ويمتنع اجتماعهما كالسواد والبياض. (معجم الفروق اللغوية، "ض"ص: ٣٢٦).

کسی قطعی حکم کو یہ جانتے ہوئے کہ یہ شریعت کا قطعی اور ثابت شدہ حکم ہے، تردید کرے یا اس کو تسلیم نہ کرے تو ایسا شخص مسلمان باقی نہیں رہے گا۔

یہی حال چوتھے لازمہ یعنی مخالف ادیان ومذاہب سے بیزار ہونے کا بھی ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اپنے ایمان واسلام کا دعویٰ کرے، لیکن وہ اسلام کے ماسوا دیگر ادیان مثلاً یہودیت، نصرانیت اور قادیانیت وغیرہ سے بری نہ ہو، یازبان سے تو دعوی کرے مسلمان ہونے کا، لیکن اسلام کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں ان ادیان کی حقانیت کا بھی قائل ہو اوران کو قابل اتباع سمجھتا ہو تو وہ مسلمان نہیں ہو گا۔

اس قسم کی مخالفت کا شرعی حکم

لوازم ایمان کی اس مختصر سی تفصیل کے بعد اب اصل مسئلہ کا حکم ذکر کیا جاتا ہے، اصل سوال یہ ہے کہ جن اعمال اور اقوال سے شریعت میں منع فرمایا گیا، اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کرے گا تو کیا وہ مسلمان باقی رہے گا یا اس کا اسلام جاتا رہے گا؟

تو اس کا حکم یہ ہے کہ شریعت کی ممنوعات سے منع ہونا ضروری ہے ان کا ارتکاب کرنا معصیتِ خداوندی ہے جو اگرچہ گناہ اور جرم ہے لیکن یہ جرم اس درجے کا بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے کفر جیسے انتہائی اور سب سے بڑی سزا جاری ہو، ایسا کرنا زیادہ سے زیادہ گناہ کبیرہ ہو جائے گا اور اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ محض گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کرنے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا۔

گناہ کبیرہ کے متعلق اہل سنت والجماعت کا مؤقف

قرآن وسنت کے بیسوں نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے، اہل سنت والجماعت کے متکلمین نے مختلف انداز سے ایسے متعدد نصوص ذکر فرمائے ہیں جن سے مختلف طرقِ

استدلال کے ساتھ یہی ثابت ہوتا ہے کہ محض گناہ کبیرہ کا ارتکاب موجب کفر نہیں اور صرف اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا یا اس کو غیر مسلم قرار دینا بالکل جائز نہیں۔

امام طحاوی رحمہ اللہ اہل سنت والجماعت کا یہی متفقہ مؤقف ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لا نكفر أحدا من أهل القبلة بذنب ما لم يستحله-

"ہم گناہ کی وجہ سے اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے، جب تک وہ اس گناہ کو حلال نہ سمجھے۔" [۱]

خود امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی یہی ذکر فرمایا، چنانچہ حضرت ابو مطیع البلخی رحمہ اللہ کی روایت سے آپ کی جو "فقہ ابسط" ہم تک پہنچی ہے، اس میں پہلا سوال ہی یہی تھا، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا:

ألا تكفر أحدا من أهل القبلة بذنب ولا تنفي أحدا من الإيمان-

"آپ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کریں اور کسی سے ایمان نفی نہ کریں۔" [۲]

اس قاعدے کے متعلق اگرچہ بہت کلام کیا گیا اور بعض جدت پسند حضرات اس کو بنیاد بنا کر تکفیر کے باب میں انتہائی تسامح بالکل تساہل پر زور دیتے ہیں جو شریعت کے مزاج، علم کلام کے اُصول، اُمت کے اجماعی توارث اور خود اسی قاعدے کے اصل پس

---

[۱]العقيدةالطحاوية ،ص٦٠.

[۲]الفقه الأبسط بتحقيق العلامة الكوثري ضمن كتابه" العقيدة وعلم الكلام"، ص٥٩٩.

منظر کے بالکل خلاف ہے لیکن کم از کم اس حد تک اس ضابطہ پر اتفاق ہے کہ کسی مسلمان کو محض گناہ کبیرہ کی وجہ سے کافر قرار دینا جائز نہیں۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

من ارتکب کبیرةً لکسلٍ أو حمیة أو أبقة أو غلبة شهوة أو رجاء عفو کان التصدیق معه باقیا، ومادام التصدیق موجودا کان التکذیب معدوما ضرورة؛ لمضادة بینهما، فبطل القول بکفره والتکذیب معدوم، أو بزوال الإیمان والتصدیق موجود، أو ثبوت النفاق والتصدیق في القلب باق.

"جو شخص سستی، غیرت وحمیت، غلبہ شہوت یا معافی کی اُمید پر کبیرہ کا ارتکاب کرے تو تصدیق اس کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور جب تک تصدیق موجود ہے تو تکذیب معدوم ہے کیونکہ دونوں میں تضاد (بمعنیٰ تناقض ہے اور اجتماع نقیضین محال ہے) لہٰذا اس کو کافر کہنا غلط ہے اسی طرح جب تصدیق بر قرار ہے تو اس کے ایمان ختم ہونے یا اس کے منافق ہونے کی بات بھی باطل ہے۔" [۱]

مزید تفصیل کے لئے امام محمد ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ (المتوفی ۳۳۳ھ) کی "کتاب التوحید" ملاحظہ فرمانا مفید ہے، جس میں آپ نے بڑی تفصیل اور تدقیق کے ساتھ اس بات کو ثابت فرمایا ہے اور اپنے معمول کے مطابق معتزلہ وغیرہ کے استدلالات کے معقولانہ انداز میں جوابات دئے ہیں۔ [۲]

---

[۱] الاعتماد في الاعتقاد، ص:٤٠٦

[۲] کتاب التوحید مسألة: اختلاف المسلمین في مرتکبي الکبائر، من صفحة ۳۲۹ تا ۳۶۵.

البتہ جن اقوال واعمال سے مندرجہ بالالوازم ایمان میں سے کسی لازم کی نقیض یااس کی ضد یقینی طور پرلازم آرہی ہوتوایسا قول وعمل موجبِ کفر شمار ہوگااوراس کی وجہ سے وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہوجائے گا، لیکن ظاہر ہے کہ اس تکفیر کی اصل وجہ صرف اس ناجائز کام کاارتکاب نہیں ہے بلکہ لازمِ ایمان کافوت ہونااس کی اصل وجہ اور بنیادی سبب ہے۔

ذیل میں مندرجہ بالاایمان کے چاروں لوازم کی چندمثالیں ذکر کی جاتی ہیں جن کی بنیادپر فقہاء کرام رحمہم اللہ علیہم نے ایسا عمل کرنے والے کوکافر قرار دیا۔

رضاومحبت فوت ہونے کی بنیاد پر تکفیر کی مثال

کفرپر خوش ہونا، اس کی نشرواشاعت پرراضی ہونااور خوشی خوشی اس کی تبلیغ تلقین کرنا، ان تینوں اُمور کو حضرات فقہاءِ کرام موجبِ کفر قرار دیتے ہیں، اوراس میں یہ تفصیل ذکر کرتے ہیں کہ کسی شخص کاخوداپنے کافر ہونے پرخوش ہونایااپنے کفرکواچھا سمجھنا بالاتفاق کفرہے، اوردوسرے شخص کے کافر ہونے پرراضی ہونے کی وجہ سے کوئی مطلقاًکافر نہیں ہوتا، لیکن اگر یہ رضامندی خودکفرہی کواچھا سمجھنے کی وجہ سے ہوتواس کے کافر ہونے میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ [۱]

شرح العقائد وغیرہ کتب میں بھی یہی ذکرکیاگیااور حضرات فقہاء کرام بھی کلمات الکفرمیں اس کوبڑے اہتمام سے ذکر فرماتے ہیں بلکہ اس قاعدہ کی بناءپر متعدد مسائل متفرع فرماتے ہیں۔

---

[۱] درر الحكام شرح غرر الأحكام، كتاب الكراهية والاستحسان، ج١ ص٣٢٤.

رضا بالکفر کفر کیوں ہے؟

اگر غور کیا جائے تو یہ قاعدہ مندرجہ بالا ضابطہ میں داخل ہو جاتا ہے کیونکہ ایمان اور کفر آپس میں دو متقابل اور متضاد اشیاء ہیں، جن کا ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں جمع ہونا ممکن نہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص کفر پر راضی ہوتا ہے تو وہ یقیناً ایمان کے ایک "لازم" کو ضائع کر رہا ہے، کیونکہ ایمان کے لوازم میں سے ایک لازم یہ بھی ہے کہ دین اسلام اور اس کے احکامات کے ساتھ رضا و محبت رکھی جائے، کفر کے ساتھ محبت کا علاقہ استوار نہ کیا جائے بلکہ وہ تو انتہائی قابل نفرت چیز ہے، لہٰذا کفر پر راضی ہونے میں چونکہ یہ لازم ایمان فوت ہو رہا ہے، اس لئے اس کے کفر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کافر ہونے پر راضی ہو تو وہ کافر ہے، لیکن اگر کوئی شخص خود اپنے کفر پر خوش نہ ہو بلکہ دوسرے آدمی کے کافر ہونے کو پسند کرے، یا اس کے لئے کفر پر مرنے کی بد دعا کرے، تو کیا یہ بھی کفر ہے؟ اور اس کی وجہ سے بھی ایسا شخص کافر تصور ہو گا یا نہیں؟

تو اس کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ اگر تکفیر کے متعلق سابقہ تمام ابحاث پر ایک نظر دوڑائی جائے تو مطلقاً ایسے شخص کی تکفیر درست معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس میں تفصیل کرنے کی ضرورت ہے، کفر پر رضامندی اور اس کو مرغوب سمجھنا یقیناً کفر ہے لیکن اپنے کفر پر خوش ہونے اور دوسرے کے کفر پر راضی ہونے میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ چونکہ ایمان و کفر (کم از کم) انسان کی حد تک ضدین ہیں جن میں سے کسی کو ایک پسند کرنا دوسرے کے ناپسند کرنے کو مستلزم ہے (نیز خود کفر کو پسند کرنا بھی کفر ہی ہے) گویا ایک ضد کے وجود سے دوسرے کا انتفاء یقینی طور پر لازم آرہا ہے۔

اس کے مقابلے میں اگر دوسرے مسئلے پر غور کیا جائے یعنی دوسرے شخص کے کفر پر خوش ہونا، تو وہ اس حد تک متقابل نہیں، بلکہ اس میں اور واسطے اور مزید احتمالات بھی موجود ہیں، مثلاً کوئی شخص اپنے کسی دشمن کے بارے میں یہ پسند کرے کہ وہ کافر ہے رہے، کفر پر ہی اس کی موت واقع ہو تو دشمن کے کفر پر اس طرح راضی ہونے اس کو کافر نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس میں جس طرح یہ احتمال موجود ہے کہ اس چاہنے والے کو کفر سے محبت ہے، اسی لئے وہ دوسروں کے لئے اس کو پسند کرتا ہے، اسی طرح یہ احتمال بھی موجود ہے کہ وہ کفر کو ایک انتہائی سخت عذاب کا موجب جرم سمجھتا ہے اور دشمن کے بارے میں وہ چاہتا ہے کہ اسی عذاب سے اس کا سامنا ہو، اس لئے اس نے مذکورہ جملہ کہا۔

تکفیر کے متعلق اُصول کے سلسلہ میں اسی کتاب کے باب دوم میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاچکا ہے کہ جس بات میں کفر کے ساتھ ایمان کے موجود ہونے کا بھی احتمال ہو، گو وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو تو اس بات کی وجہ سے کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اس لئے اس صورت میں بھی محض کسی دوسرے شخص کے کفر کی تمنا کرنے اور اس کو اچھا سمجھنے کی وجہ سے اس کو کافر کہنا احتیاط کے خلاف ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس چاہت میں دوسرا احتمال ہی راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ دشمن کے لئے عام طور پر اچھی چیز کی تمنا نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے حق میں اس چیز کی کوشش کی جاتی ہے جو نقصان دہ اور تکلیف کا باعث ہو تاکہ چاہنے والے کے دلی حسد و بغض کی آگ ٹھنڈی ہو، اس لئے اس مضبوط احتمال کی بناء پر اس کو کافر کہنا درست نہیں۔

تاہم اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی شخص اسی صورت میں کفر ہی اچھا سمجھنے کی صراحت کرے تو یہاں چونکہ یہ احتمال باقی نہیں رہتا ہے، اس لئے اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

امام سرخسی رحمہ اللہ بھی یہی نکتہ ذکر فرمایا، آپ فرماتے ہیں:

فإن قيل: إذا كعموه حتى لا يسلم ينبغي أن يكون ذلك كفرا منهم؛ لأنهم رضوا بكفره، ومن رضي بكفر غيره يكفر. قلنا: لفعلهم ذلك تأويلان: أحدهما أنهم علموا أنه لا يسلم حقيقة، ولكن يظهر الإسلام تقية لينجو من القتل. فلا يكون ذلك رضا منهم بكفره. والثاني أن مقصودهم من ذلك الانتقام منه والتشديد عليه، لكثرة ما آذاهم لا على وجه الرضى بكفره. ومن تأمل قوله تعالى {ربنا اطمس على أموالهم واشدد على قلوبهم فلا يؤمنوا حتى يروا العذاب الأليم} يتضح له هذا المعنى.

"اگر کہا جائے کہ جب اُنہوں نے فرعون کا منہ بند کر دیا تا کہ وہ اسلام نہ لائے تو مناسب یہ ہے کہ یہ منہ بند کرنے کو کفر کہا جائے، کیونکہ اس فعل سے وہ فرعون کے کفر پر راضی ہوئے اور جو کوئی دوسرے کے کفر پر راضی ہو جائے وہ کافر ہے۔ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان کے اس فعل کی دو توجیہات ہیں:

ا۔ ان کو معلوم ہوا تھا کہ یہ در حقیقت اسلام نہیں لائے گا لیکن قتل سے بچنے کی خاطر تقیہ کے طور پر اسلام کا اظہار کرے گا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس اقدام سے ان کا مقصود اس سے انتقام لینا اور اس پر سختی کرنا تھا کیونکہ اس نے ان کو بہت ستایا تھا، کفر پر راضی ہونے کے لئے ایسا نہیں کیا (بلکہ جذبہ انتقام کے تحت ایسا ہوا)، جو کوئی مندرجہ بالا آیت میں اچھی

طرح غور کرے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی۔" [۱]

دوسروں کے کافر ہونے پر خوش ہونے کو جامع الفصولین وغیرہ بعض کتب میں اگرچہ اس تفصیل کے بغیر بھی مطلقاً کفر کہا گیا لیکن فتاویٰ ہندیۃ میں اسی تفصیل کو مفتی بہ قرار دیا گیا۔

ومن يرضى بكفر نفسه فقد كفر، ومن يرضى بكفر غيره فقد اختلف فيه المشايخ رحمهم الله تعالى في كتاب التخيير في كلمات الكفر إن رضي بكفر غيره ليعذب على الخلود لا يكفر، وإن رضي بكفره ليقول في الله ما لا يليق بصفاته يكفر، وعليه الفتوى كذا في التتارخانية.

"جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو گا وہ کافر ہو جائے گا اور جو دوسرے کے کفر پر راضی ہوتا ہے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔۔ اگر کوئی دوسرے کے کفر پر اس لئے خوش ہوتا ہے تاکہ اس کو ہمیشہ کے لئے عذاب ملتا رہے تو وہ کافر نہیں ہو گا اور اگر خوش اس لئے ہو تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان میں نازیبا کلمات کہے تو وہ کافر ہے، اسی قول پر فتویٰ ہے۔" [۲]

کفر کی تعلیم، تبلیغ اور اس کا مشورہ دینا بھی کفر ہے

امام ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے "رضا بالکفر" کے اس مسئلہ کو کافی تنقیح اور وضاحت

---

[۱]شرح السير الكبير،باب ما يتكلم به الرجل فيكون أمانا أو لا يكون،ص: ٥٠٤.

[۲]الفتاوى الهندية،الباب التاسع فى أحكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر أنواع منها ما يتعلق بالإيمان والإسلام،ج٢ص ٢٥٧.

کے ساتھ لکھا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ رضا بالکفر کی طرح کسی کو کافر ہو جانے کا مشورہ دینا، کفر کی تعلیم دینا اور اس کی تبلیغ و تلقین کرنا بھی کفر ہے، اگر کوئی شخص کفر کی نشر و اشاعت کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف ما لو قال لمسلم: سلبه الله الإيمان، أو لكافر: لا رزقه الله الإيمان، فإنه لا يكون كفراً على الأصح، لأنه ليس رضاً بالكفر وإنما هو دعاء عليه بتشديد الأمر والعقوبة عليه. هذا ما ذكره الشيخان وأنت خبير من قولهما: لأنه ليس رضاً بالكفر إلى آخره أن محل ذلك ما إذا لم يذكر ذلك رضاً بالكفر وإلا كفر قطعاً والذي يظهر من فحوى كلامهما أنه لو أطلق، ولم يقله على جهة الرضا بالكفر، ولا على جهة تشديد العقوبة عليه لا يكون كافراً وهو ظاهر. ولو رضي كافر بالإسلام أو أكره كافراً آخر عليه أو عزم عليه في المستقبل لم يكن بذلك مسلماً.

"اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے ایمان سلب ہونے یا کافر کو ایمان نصیب نہ ہونے کی بد دعاء کرے تو صحیح قول کے مطابق یہ کفر نہیں ہے، کیونکہ یہ کفر پر رضامندی نہیں ہے، بلکہ مخاطب پر سختی اور سزا ملنے کی بد دعاء ہے ۔۔۔ اگر کوئی کافر اسلام پر راضی ہوا یا دوسرے کافر کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا یا مستقبل میں اسلام لانے کا عزم کیا تو اس کی وجہ سے وہ ابھی مسلمان نہیں ہو گا۔" [۱]

[۱]نفس المصدر

تبلیغ و تعلیم کے کفر ہونے اور بد دعا کے کفر نہ ہونے کے درمیان بنیادی فرق

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کی اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کفر کی تعلیم و تلقین کرنا اور عملی طور پر اس کی نشر و اشاعت کرنا کفر ہے، لیکن دوسری طرف حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ علیہم نے کلمات الکفر کے ضمن میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے کفر پر مرنے کی بد دعا کرنا اگرچہ ناجائز اور حرام ہے لیکن محض اس کی وجہ سے بد دعا کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا۔

بعض اوقات ان دونوں جزئیات کو ایک دوسرے کے خلاف تصور کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی مسائل اپنی جگہ درست ہیں، آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

دوسرے شخص کے کافر ہونے کی تمنا کرنا بذات خود کفر نہیں جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے کہ اس میں کفر پر رضامندی یقینی نہیں بلکہ اس میں کفر کے علاوہ اور احتمال بھی موجود بلکہ غالب ہے جس کی تفصیل ابھی ذکر ہوئی، اس لئے اس بناء پر جب تک خود متکلم اسی کفریہ احتمال مراد لینے کی تصریح نہ کرے تب تک اس کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

لیکن کفر کی تبلیغ کرنا اور لوگوں کو کافر ہو جانے کا مشورہ دیدینے کا مسئلہ اس سے مختلف ہے کیونکہ یہ ایمان کے سابقہ چار (۴) لوازم کے خلاف ہے، کیونکہ کفر کی تبلیغ اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ دل میں اس کے ساتھ رضا و محبت بھی موجود ہے، اور اسلام کی متوازی ادیان و مذاہب کی تبلیغ خود اسلام کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے جو کہ اسلام کے تعظیم و احترام کے بھی خلاف ہے، اسی طرح نمبر چار میں ایمان کا یہ بھی ایک لازم ذکر ہوا کہ مخالف ادیان سے تبری بھی ہو اگر کوئی شخص ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام قبول کرنا چاہے اس طور پر کہ ہندو مت بھی نہ چھوڑنا پڑے اور اسلام میں بھی داخل ہو جائے، تو ایسا نہیں ہو سکتا،

کیونکہ ایمان واسلام کے معتبر ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیگرادیان سے براءت کا اظہار ہو ،جبکہ اس کی تعلیم و تبلیغ کرنااورلوگوں کواس کے اختیار کرنے کے مشورہ دینااس کے بالکل خلاف ہے اس لئے اس کو کفر قرار دیا گیا۔

علامہ ابنِ حجر ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومن المكفرات أيضاً أن يرضى بالكفر ولو ضمناً كأن يسأله كافر يريد الإسلام أن يلقنه كلمة الإسلام فلا يفعل أو يقول له: اصبر حتى أفرغ من شغلي أو خطبتي لو كان خطيبا أو كأن يشير عليه بأن لا يسلم وإن لم يكن طالباً للإسلام فيما يظهر وكلام الحليمي الآتي قريباً قد يدل على أن إشارته عليه بأن لا يسلم إذا كانت لكونه عدوه فيشير عليه بما يكرهه، وهو الكفر، ويمنعه عما يحبه وهو الإسلام لم يكفر، وفيه نظر والذي يظهر أنه يكفر بذلك، وإن قصد ما ذكر بأنه كان متسبباً في بقائه على الكفر، وليست هذه كمسألة الحليمي الآتية خلافاً لما توهمه؛ لأن تلك فيها مجرد تمنٍ فقط. وهذه فيها تسبب إلى البقاء على الكفر أو يشير على مسلم بأن يرتد. [۱]

"موجب کفر میں سے ایک کفر پر راضی ہونا بھی ہے اگرچہ ضمناً ہی ہو، جیسے کوئی کافر اسلام قبول کرنے کے ارادے کلمہ اسلام کی تلقین کرانے کی فرمائش کرے تو یہ تلقین نہ کرے یااس کو کہے کہ انتظار کرو تاکہ میں اپنی مصروفیت یا اگر

[۱]الإعلام بقواطع الإسلام ،ص۱۳۳.

خطیب ہو تو اپنی تقریر سے فارغ ہو جاؤں، یا اس کو اسلام قبول نہ کرنے کا مشورہ دے۔۔ علامہ حلیمی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسلام کا ارادہ کرنے والا اس کا دشمن ہو اور یہ اس کو اسلام قبول نہ کرنے کا مشورہ دے، کیونکہ خود اس کے نزدیک کفر بری چیز ہے اور اسلام محبوب، تو دشمن کو محبوب سے روکنے کے لئے ایسا مشورہ دے، تو اس سے وہ کافر نہیں ہو گا۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی وہ کافر ہو جائے، کیونکہ اس صورت میں بھی اس کے کفر پر برقرار رہنے میں یہ سبب بن گیا۔۔"

تعظیم واحترام فوت ہونے کی وجہ سے تکفیر کی مثال

ایمان کے معتبر ہونے کے لئے دوسرا لازم "تعظیم و محبت" ہے، حضرات فقہاء کرام نے اس کے فوت ہونے کی بناء پر بھی تکفیر فرمائی ہیں، کلمات الکفر کی بہت سی جزئیات کا مدار اس پر ہے کہ ایمان واسلام اور اس کی تمام ضروریات اور یقینی و قطعی احکام کی تعظیم ضروری ہے اور اس کے ساتھ محبت رکھنا لازم ہے، اگر یہ دونوں لازم پورے نہ ہوں تو اس ایمان کا اعتبار نہیں ہے۔

چنانچہ حضرات فقہاءِ کرام نے لکھاہے کہ جو شخص پوری شریعت کی یا اس کے ضروری مسائل کی توہین کرے یا کسی عبادت کی استہزا کرے تو وہ کافر ہو جائے گا مثلاً کوئی مسلمان تیمم کر رہا ہے اور دوسرا اس کے اس عمل کو دیکھ کر مذاق اُڑاتا ہے اور مذاق اُڑانے کی بنیاد یہی تیمم کا عمل ہو، کرنے والے کا کوئی اور ذاتی طرز عمل وغیرہ نہ ہو تو بھی وہ کافر ہو جائے گا۔ [۱]

---

[۱]شرح الإمام علی القاری علی کتاب ألفاظ الکفر للعلامة بدر الرشید، ص ۱٦۳

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی عبادت گزار کو مذاق کے طور پر کہے کہ اتنی عبادت نہ کرو کہ جنت پار کر باہر نکلو، اس کو بھی حضرات فقہاء کرام نے موجبِ کفر قرار دیا ہے۔[۱]

حکم شرعی کا مذاق کفر ہے

اور حکم شرعی کا مذاق کے کفر ہونے کے لئے یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ وہ حکم ضروریاتِ دین میں سے ہو، یا کوئی فرض واجب مسئلہ ہو تو اس کا مذاق ہی کفر ہو گا، بلکہ شریعت کا جو حکم جس درجے کا بھی ہو ، لیکن اگر کسی شخص کو اس کا حکم شرعی ہونا معلوم ہے اور اسی نسبت کی وجہ سے وہ اس کا مذاق اُڑا رہا ہے تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

جامع الفصولین میں لکھا ہے:

حكي أن في زمن المأمون سئل فقيه عمن قتل حايكاً فقال كفارت بت واجب شود فأمر المأمون بضرب الفقيه حتى مات وهذا للاستهزاء بحكم الشرع وهو كفر.

منقول ہے کہ مامون کے زمانے میں ایک فقیہ سے جولاہا کے قتل کرنے والے کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے جواب میں کہا کہ کیا بت کا کفارہ بھی واجب ہوتا ہے؟ تو مامون نے اس فقیہ کے گردن مارنے کا حکم جاری کیا یہاں تک کہ وہ مر گیا، یہ شریعت کے حکم پر استہزاء کرنے کی وجہ سے تھا جو کہ کفر ہے۔" [۲]

ملا علی قاری رحمہ اللہ اسی واقعہ کے ذیل میں نقل کرتے ہیں:

---

[۱]انظر: نفس المصدر، ص ١٦٥

[۲]جامع الفصولين، الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية ،ج ٢ص١٧٦.

الاستهزاء بحكم من أحكام الشرع كفر۔ [۱]

"شریعت کے کسی بھی حکم کا مذاق اُڑانا کفر ہے۔"

اسی طرح فقہاءِ کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر کوئی فقیہ یا محدث شرعی احکام اور صحیح احادیث کا درس دے رہا ہو اور کوئی ان احکام و احادیث کو رد کرتے ہوئے یہ کہے کہ یہ فضول چیز ہے یا کہے کہ یہ بے کار چیز ہے یا یہ کہے کہ یہ کسی بھی مرض کی دواء نہیں، تو ایسا کہنے سے وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص اس دوران کہے کہ یہ سائنس و ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس دور میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں، تو یہ بھی کلمہ کفر ہے اور اس کی وجہ سے بھی کہنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ [۲]

ان تمام صورتوں میں کفر کا اصل سبب اسی تعظیم و محبت کا فقدان یا معارضہ ہی ہے، اور اسی بنیاد پر کفر کا حکم لگایا گیا۔

تسلیم وانقیاد فوت ہو جانے کی وجہ سے تکفیر کی مثال

ایمان کی لوازمات میں سے تیسرا لازم "تسلیم وانقیاد" ذکر کیا گیا یعنی دل وجان سے شریعت کا فیصلہ قبول کرنا اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اس کا تابع فرمان بننا، یہ بھی ایمان کا ایک لازمی تقاضا ہے اگر کوئی دل و جان سے حضور ﷺ کی تصدیق کرے لیکن شرعی احکام کے سامنے تسلیم وانقیاد نہ کرے بلکہ اس کے کسی فیصلہ کو رد کرے تو اس کو مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔

---

[۱]شرح الإمام على القارى على كتاب ألفاظ الكفر للعلامة بدر الرشيد، ص ١٦٧-

[۲]نفس المصدر، ص ١٦٤

قرآن کریم میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا-

"پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہ ہونگے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو، اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کروائیں، پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔ [۱]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بڑی سخت وعید مذکور ہے، کیونکہ اوّلاً تو الفاظ قسمیہ ہیں، ثانیاً مزید تاکید کے لئے ابتداء میں "لا" بھی لایا گیا ہے، ثالثاً نفی بھی نیک ہونے یا کامل ہونے کی نہیں، بلکہ اصل ایمان ہی کی نفی مقصود ہے جو کہ تمام طاعات اور ہر قسم کی کامیابی کی اصل بنیاد اور جڑ ہے، حاصل یہ ہوا کہ کوئی اس وقت تک ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتا، جب تک وہ آپ ﷺ کو آپس کے تنازعات میں حکم مقرر نہ کریں، پھر صرف حکم کرنے پر ہی اکتفاء نہیں فرمایا گیا، بلکہ اس میں مزید شرائط بھی مقرر فرمائے گئے جن کے بغیر "تحکیم" کامل نہیں ہوتی۔

پہلی شرط یہ بیان فرمائی گئی کہ تحکیم کے بعد حضور ﷺ کے فیصلہ کے متعلق دل میں کوئی حرج، تنگی اور شک نہ ہونے پائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کو ظاہر و باطن سے تسلیم کرے۔

---

[۱]سورۃ النساء،٦٥-

پھر مزید تاکید کے لئے "تسلیما" مفعول مطلق کو دوبارہ ذکر فرمایا گیا، اب اس تفصیل کا حاصل یہ ہوا کہ جب تک کوئی بندہ مؤمن مندرجہ بالا طریقے سے تحکیم نہ کرائے اور پھر شریعت کے فیصلہ کو دل وجان سے قبول نہ کرے، اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ [۱]

واضح رہے کہ احکام شریعت کو بے چون وچرا تسلیم کرنا اور بات ہے اور کبھی کبھار عملی کوتاہی اوراحکام شریعت کو ترک کرنا اس سے بالکل مختلف امر ہے، اگر کوئی شخص احکام شریعت کو قبول کرے اس پر عمل کرنے کا جذبہ رکھے لیکن کبھی عملی میدان میں اس کی مخالفت ہوجائے، دنیاوی مفاد کی خاطر شریعت کے احکامات کی خلاف ورزی ہوجائے تو محض اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں کہلائے گا۔ [۲]

ادیان باطلہ سے بری نہ ہونے کی وجہ سے تکفیر کی مثال

ایمان کے مفید ومعتبر ہونے کے لئے چوتھی بنیادی چیز "ادیان باطلہ سے بری ہونا" ہے، قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین حق صرف اور صرف اسلام ہی ہے، اس کے علاوہ جتنے ادیان ومذاہب دیگر حضرات انبیاء کرام علیھم وعلی نبینا الصلوات والتسلیمات لے کر آگے تو وہ اگرچہ اپنے اپنے زمانے کی حد تک حق تھے لیکن حضور ﷺ کی بعثت سے وہ سارے ادیان منسوخ ہوگئے۔

اب اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا قرب و رضا حاصل کرنا چاہتا ہے یا آخرت میں

---

[۱] فتح القدير للشوكاني،ج۱ ص ۵۵۹.

[۲] اس بات کی تفصیل باب اوّل میں شرائط ایمان کی بحث میں ذکر کی گئی ہے۔

نجات کی اُمید رکھتا ہے تو اس کا واحد راستہ دین اسلام قبول کرنا ہی ہے، اگر کوئی شخص اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب بھی اختیار کرے تو وہ مسلمان نہیں کہلائے گا، بلکہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد بھی اگر کوئی شخص صرف اسلام کو حق نہ سمجھے، بلکہ ساتھ ساتھ یہودیت و نصرانیت وغیرہ ادیان کو بھی حق اور قابل اطاعت سمجھے تو وہ شخص بھی کافر ہو گا۔

حضرات فقہاء کرام کی چند جزئیات

حضرات فقہاء کرام نے اس پر بہت سے جزئیات میں کفر کا فتوی دیا ہے، حضرت علامہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

ولهذا نكفر من لم يكفر من دان بغير ملة المسلمين من الملل أو وقف فيهم أو شك أو صحح مذهبهم وإن أظهر مع ذلك الإسلام واعتقده واعتقد إبطال كل مذهب سواه فهو كافر بإظهاره ما أظهر من خلاف ذلك.

"جو شخص دین اسلام کے علاوہ دیگر ادیان اپنانے والوں کو کافر نہ کہے یا ان کے کفر میں شک وتردد کرے یا ان کے مذہب کی تصحیح کرے تو ہم اس کی تکفیر کرتے ہیں، اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کا اظہار کرے اور اس کی حقانیت، دوسرے تمام مذاہب کے باطل ہونے کا اعتقاد بھی رکھے تو بھی وہ کافر ہے کیونکہ اس نے اس کے خلاف اُمور کا اظہار کیا۔" [۱]

---

[۱] الشفاء بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، فصل في بيان ما هو من المقالات كفر وما يتوقف أو يختلف فيه وما ليس بكفر،ج۲ص۲۸۶.

دوسرے ادیان کو حق سمجھنا دور کی بات ہے، اگر کوئی شخص ان ادیان کو دل سے حق نہ سمجھے لیکن بلا ضرورت ان کے مذہبی شعار ورسومات کو دلی محبت سے اپنائے، اس پر خوشی کا اظہار کرے یا ان کے اس قسم کے مذہبی منکرات کی خوشی خوشی تائید کرے یا مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی ترجیح وتوصیف میں رطب اللسان رہے تو ان تمام اُمور کو بھی حضرات فقہاء کرام (رحمہم اللہ علیہم) موجبات کفر میں شمار فرماتے ہیں۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ موجبات کفر ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بوضع قلنسوة المجوسي على رأسه على الصحيح إلا لضرورة دفع الحر أو البرد وبشد الزنار في وسطه إلا إذا فعل ذلك خديعة في الحرب وطليعة للمسلمين وبقوله معلم صبيان اليهود خير من المسلمين بكثير فإنهم يقضون حقوق معلمي صبيانهم وبقوله المجوسية خير مما أنا فيه يعني فعله وبقوله النصرانية خير من المجوسية لا بقوله المجوسية شر من النصرانية وبقوله النصرانية خير من اليهودية وينبغي أن يقول النصرانية شر من اليهودية وبقوله لمعاملة الكفر خير مما أنت تفعل عند بعضهم مطلقا. وقيده الفقيه أبو الليث بأن يقصد تحسين الكفر لا تقبيح معاملته وبخروجه إلى نيروز المجوس والموافقة معهم فيما يفعلون في ذلك اليوم.

"سر پر مجوسیوں کی ٹوپی رکھنے سے بھی راجح قول کے مطابق کافر ہو جائے گا، البتہ گرمی سردی وغیرہ عذر کی وجہ سے ایسا کیا جائے تو کافر نہیں ہو گا، بدن پر درمیان میں (ذمیوں کی طرح) زنار باندھنے سے بھی کافر ہو جائے گا، مگر اگر جنگ میں

دھوکہ دینے کے لئے یا مسلمان کے جاسوس کے طور پر کوئی ایسا کرے تو کفر نہیں، یہ کہنے والا بھی کافر ہے کہ "یہودی بچوں کا اُستاد مسلمانوں سے بہت بہتر ہے، کیونکہ وہ اپنے بچوں کے حقوق ادا کرتے ہیں" اور اس کہنے سے بھی کہ "بت پرستی اس سے بہتر ہے جس کے اندر میں ہوں" اسی طرح اس کہنے سے بھی کہ "نصرانیت مجوسیت سے بہت بہتر ہے"۔۔اسی طرح اگر اپنے ساتھ معاملہ کرنے والے کو کہا کہ آپ کے معاملہ سے کفر بہتر ہے تو بعض فقہاء کے نزدیک مطلقاً (ہر حال) میں کافر ہو جائے گا جبکہ حضرت فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ اس میں یہ قید بھی لگائی کہ کہنے والے کا مقصود کفر کو اچھا سمجھنا ہو، اگر کفر کو مستحسن نہیں سمجھتا، صرف اس معاملہ کی برائی مقصود ہو تو کافر نہیں ہو گا، اسی طرح مجوسیوں کی عید نیروز میں نکلنا اور ان کے ساتھ اس دن کے رسومات میں موافقت کرنا۔ (یہ بھی ایسا اقدام ہے جس سے انسان کافر ہو جاتا ہے)[۱]

اس عبارت میں جن اُمور کو کفر قرار دیا گیا، بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم تو کفر اور اہل کفر کے شعار کو اپنانا ہے مثلاً مجوس کی خاص وضع وہیئت والی ٹوپی پہننا، صلیب گلے میں لٹکانا، زنار باندھنا یا نیروز وغیرہ مذہبی تقریبات میں شریک ہونا دوسری قسم یہ ہے کہ کفر کو اسلام کے مقابلے میں بہتر سمجھا جائے۔

دونوں کے کفر ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس میں ایمان کا ایک لازم یعنی مخالف ادیان ومذاہب سے بیزاری، فوت ہو رہی ہے اور لازم کی انتفاء سے ملزوم کی انتفاء ثابت ہو جاتی ہے۔

---

[۱] البحر الرائق مع منحة الخالق ،کتاب السیر،باب أحكام المرتدين، ج۵ ص۱۳۳

نیز اس عبارت میں فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ کے حوالہ سے جو قید ذکر ہوئی ہے، اس کی رعایت رکھنا ضروری ہے اور یہ صرف دوسری قسم اُمور کے متعلق نہیں ہے جیسا کہ عبارت کے ظاہر سے متبادر ہو رہا ہے، بلکہ پہلی قسم میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ جنگ و جاسوسی وغیرہ مقاصد کے لئے اگر کوئی ایسا اقدام کرے تو اس کو کافر قرار نہیں دیا گیا، تاہم اگر کوئی شخص اس کو مطلقاً کفر ہی سمجھ رہا ہو اور اس کے باوجود اس کا ارتکاب کرے تو کافر ہو جائے گا، مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہو گی کہ یہ اُمور بذات خود کفر ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اس اعتقاد کے باوجود ارتکاب کرنا در حقیقت کفر پر راضی ہونا ہے اور رضا بالکفر کفر ہے، اسی طرح استخفاف و استحلال وغیرہ کے ساتھ اگر ان کا ارتکاب کیا جائے تو بھی کفر ہے۔(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ قاضی خان، اور حضرت ملا علی قاری کی شرح الفاظ کفر)۔[۱]

---

[۱] فتاوٰی قاضی خان،باب ما یکون کفرا من المسلم وما لا یکون، ج۳ص۳٦۲. شرح الإمام علي القاري على كتاب ألفاظ الكفر للعلامة بدر الرشيد، ص۲۰۰تا۲۰۵.

باب خامس

- سیکولرازم کا تعارف، آغاز وارتقاء
- بنیادی اہداف واغراض اور زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اس
- کا نظریہ
- سیکولرازم کے شرعی حکم کی مکمل تحقیق

باب کا تعارف

سابقہ ابواب میں تکفیر سے متعلق کچھ بنیادی اُصول وضوابط کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی، تکفیر کے باب میں اُمت مسلمہ کے درمیان کئی ایک مسائل مختلف فیہا ہیں جن کو حضرات متکلمین عام طور پر اسی باب میں ذکر کرتے ہیں جس کے ضمن میں معتزلہ، خوارج اور جہمیہ کے اختلافات بھی ذکر کردئے جاتے ہیں اور یہ بحث ہوتی ہے کہ ان کے عقائد کفریہ ہیں یا نہیں؟ ان کے عقائد کی وجہ سے ان کو کافر کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟

قدیم متکلمین کے دور میں تو انہی فتنوں نے جنم لیا تھا، اس لئے وہ اس کی تردید میں مصروف تھے اور اُمت کے شیرازہ کو ان جماعتوں کے مبتدعانہ نظریات وخیالات سے بچانے کی بھرپور کوشش فرمائی جس پر وہ پوری اُمت کی طرف سے تحسین وآفرین کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو دفاع دین کی اس عظیم خدمت کا بہترین صلہ عطا فرمائیں۔

ان حضرات کے اَدوار میں اُنہی مسائل کی اہمیت تھی جس کا انہیں اچھی طرح احساس تھا، ہمارے اس دور میں بھی اُمت مسلمہ کو چند ایسے مسائل درپیش ہیں جن کا تعلق بھی اسی باب "تکفیر وعدم تکفیر" کے ساتھ ہے۔

قدیم وجدید فتنوں میں فرق

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دور حاضر کے مسائل معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ دینی فرقوں سے اس لحاظ سے انتہائی خطرناک ہیں کہ قدیم فرق باطلہ میں سے اکثر مسائل و اختلافات ایسے تھے کہ جو کم از کم دین کی اہمیت وافادیت پر مضبوط عقیدہ رکھنے والے افراد

کی طرف سے سامنے آئے تھے جن کی اصل بنیاد قرآن و سنت میں غور و فکر کرنا تھا، اگرچہ ان کا طرزِ فکر اور منہج استدلال بالکل غلط تھا، لیکن دیندار اور مسلمان ہونا وہ اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

جبکہ عصر حاضر کے مسائل کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے، یہ مسائل قرآن و سنت میں غور و فکر کرنے کا نتیجہ ہے نہ ہی کسی مسلمان قلب و دماغ نے اس کو ایجاد کیا، دینی ماحول و معاشرے میں جنم لینے کا شرف بھی اس کو نصیب نہیں ہوا، قدیم دور کے بعض اسلامی فرقوں کے فتنوں کے پسِ پشت مذہب سے وارفتگی اور اخلاص کا جو جذبہ کارفرما ہوتا تھا، ہمارے اس دور حاضر کے مسائل اس حسین جذبے سے بھی محروم ہیں۔

مفکرین جانتے ہیں کہ ان مسائل کا اصل مرکز یورپ ہے جہاں سے ان مسائل کو اُمت مسلمہ پر ایک خاص منصوبہ بندی اور منظم انداز میں مسلط کر دیا گیا ہے اور آج اس بیچاری اُمت مرحومہ کا ایک جم غفیر اس کا شکار ہے۔

اس قسم کے مسائل کی فہرست تو کافی لمبی ہے تاہم سرِ دست اس فہرست کے ایک اہم اور بنیادی مسئلہ "سیکولرازم" پر یہاں مختصر سی بحث کی جاتی ہے جس کے اندر آج اگر اکثر اُمت نہیں تو کم از کم ایک نہایت عظیم طبقہ ایسا ہے کہ جو اس فتنہ کے زلفوں کا اسیر بن چکا ہے اور اس خالص مغربی گمراہی کو اسلامی لباس پہنانے میں مصروفِ عمل ہے، بلکہ کچھ نادان اور عاقبت نا اندیش لوگ تو اس کو اسلام کا لیلیٰ عروس باور کرانے میں سرگرم ہیں۔

تکفیر کے باب میں ان مسائل کو ذکر کرنے کی بنیادی وجہ

"اُصول تکفیر" میں ان مباحث کو درج کرنے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان مسائل کا براہِ راست "مسئلہ تکفیر" سے تعلق ہے اور دیگر مسائل کے مقابلے میں اُمت مسلمہ کو ان

مسائل میں دینی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے، اس لئے یہاں اس فکر کا شرعی حکم بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی، لیکن چونکہ شرعی احکام بیان کرنے سے پہلے کسی چیز کا تعارف بھی ضروری ہوتا ہے، اس لئے اس مقصد کی خاطر اس کی مختصر سی وضاحت بھی ذکر کر دی جاتی ہے تاکہ حکم سمجھنے میں آسانی رہے۔

سیکولرازم کا تعارف

یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے، کیمبرج ڈکشنری میں اس کا معنٰی یہ لکھا ہے کہ:

secularism

the belief that religion should not be involved with the ordinary social and political activities of a country. [۱]

ترجمہ: سیکولرازم: اس بات کا یقین کرنا ہے کہ مذہب عام رسمی معاشرے کے ساتھ اوراسی طرح ملک کے سیاسی سرگرمیوں میں نہیں چل سکتا۔

عربی زبان میں اس کو" علمانیۃ" کہا جاتا ہے، عرب مفکرین اوراہل لغت میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل "عِلمانیۃ" عین کے زیر کے ساتھ ہے جو علم کی طرف منسوب ہے، اس تلفظ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نظریہ ہر چیز کو "جدید علم" کے ترازو میں تولتا ہے یعنی محض عقل اور مشاہدے سے پرکھتا ہے جو چیز مشاہدے میں آئے، اس پر یقین رکھتا ہے اور جو چیز مشاہدے سے باہر ہو، اس کو بالکل غلط اور بے بنیاد تصور کرکے اس کی تردید کرتا ہے اوراس کی طرف توجہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

لیکن بہت سے مفکرین اور عربی لغت کے ماہرین "ع" کے زیر کے ساتھ اس تلفظ

---

[۱] سیکولرازم کے متعلق بہت مقالات اور کتابیں لکھی گئیں۔کچھ اس کی مخالفت میں اور بعض اس کی تائید وحمایت میں، ان میں سے مفید کتاب دکتور سامی عامری کی کتاب ''العالمانیۃ طاعون العصر'' ہے، جس میں فاضل مؤلف (زید مجدہم) نے بڑی تفصیل و تحقیق کے ساتھ سیکولرازم کی حقیقت، تاریخ اور شرعی حکم پر گفتگو فرمائی ہے، اس کی مراجعت کرنا مفید ہے۔ کاش! اگر کوئی اُردودان اس کا ترجمہ کرے! اُردو میں بھی سیکولرازم کے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے شاید ڈاکٹر فریاد صاحب کی کتاب ''سیکولرازم، ایک تعارف'' مفید ہے۔

کو درست تسلیم نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے کہ یہ لفظ "ع" کے زبر کے ساتھ ہے یعنی "عَلمانیہ" اور علم سے مقصود "عالم" یعنی دنیا ہے اس کے مطابق اس کی نسبت کر کے اصل تلفظ "عالمانیہ" کہا جانا چاہئے، لیکن زیادہ استعمال کی وجہ سے الف کو حذف کیا جاتا ہے، اس تلفظ کے مطابق اس کا معنیٰ وہی بنا جو انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا نے کیا یعنی "دنیویہ" زندگی کے ہر میدان میں دنیا ہی دنیا کو ترجیح دینا اور آخرت کے معاملات پر اس کو فوقیت دینا۔

اصطلاحی تعریف

چونکہ یہ نظریہ یورپ کی طرف سے عالم اسلام میں برآمد کیا گیا، خود اہل اسلام نے اس کی ایجاد نہیں کی، اس لئے ابتداء میں اس کے متعلق یہ تصور دیا گیا کہ یہ نظام صرف سیاست کے میدان سے دین کو دور کرنے کا نام ہے، سیاست اور حکومت کے علاوہ زندگی کے تمام گوشوں میں اگر مذہب پر عمل درآمد ہوتا رہے تو یہ نظریہ اس کا بالکل مخالف نہیں۔ اسی تصور کی بناء پر بہت سے علماء کرام نے اس کی تعبیر " فصل الدين عن الدولة" یا "فصل الدين عن السياسة" سے کی یعنی صرف حکومت وسیاست کے میدان میں دین کو جدا کرلینا کہ حکومت وسیاست کسی دین کے تابع نہ ہو، خلافت عثمانیہ کے اخیر دور کے شیخ الاسلام اور اپنے ماحول کے حالات سے باخبر شخصیت علامہ مصطفی صبری رحمہ اللہ نے اپنی معرکۃ الاراء کتاب "موقف العقل "میں اسی تصور کو بنیاد بنا کر اس پر تفصیل سے قابل دید بحث فرمائی ہے۔[۱]

---

[۱] موقف العقل والعلم والعالم من رب العلمين، الباب الرابع فى عدم جواز فصل الدين عن السياسة،ج ٤ ص ٢٨٠.

لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک مغالطہ تھا جو اس وقت عام کر دیا گیا تھا، جوں جوں سیکولر ازم کا تاریخی پس منظر اوراس کا آغاز وارتقاء واضح ہوتا گیاتوساتھ ساتھ اس کے اہداف و اغراض بھی ظاہر ہونے لگے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد خوداسی تحریک کے پرجوش علمبرداروں نے وضاحت کے ساتھ یہ بیان کرنا شروع کیا کہ اس تحریک کا مقصد صرف "فصل الدين عن الدولة يا عن السياسة"ہی نہیں بلکہ اصل ہدف" فصل الدين عن الحياة"ہے یعنی صرف سیاست کو مذہب کی قیودات سے آزاد کرنا ہی منزلِ مقصود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں کو مذہب کی "خلاف عقل "پابندیوں سے آزاد کرنا ہی اصل ہدف ہے۔

چنانچہ ۱۴۲۹ماہ رجب بمطابق نومبر ۱۹۹۸ءجب مجمع الفقہ الاسلامی نے "علمانیہ" کے موضوع پرعالم اسلام کے چند علماء کرام سے مقالات لکھوائے،اس پر مجمع کے ارکان کے درمیان مباحثہ اور مناقشہ ہوا، اس کے نتیجے میں جو قرارداد منظور ہوا اس میں علمانیہ کا یہی مفہوم بیان کیا کہ "فصل الدين عن الحياة"[۱]

آغاز وارتقاء

قرونِ وسطی کے اندر جب یورپ میں کلیسا کا راج تھا، پورا عالم عیسائیت اس کے گویا زیر سلطنت تھا، کلیسا کا منشاو حکم بعینہ خدا کا حکم تصور کیا جاتا تھا جس کی ذرہ بھر مخالفت کرنا یا اس کو پورا کرنے میں تھوڑی دیر توقف کرنا خودکشی کے مترادف تھا، اس زمانے میں کلیسا اوراس کے درودیوار میں رہنے والے نام نہاد مذہبی رہنماؤں نے اپنی نہ ختم ہونے والی خواہشات اور مفادات کی خاطر عجیب وغریب دین وضع کیا تھا۔

---

[۱] مجمع الفقه الإسلامي،موضوع:الإسلام في مواجهة العلمنة،ج۲ص۲۲۱۱۲.

ان کا دعویٰ تھا کہ ہمارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست رابطہ ہے، خدا کی طرف سے ہمیں یہ عہدہ سپرد ہوا کہ لوگوں کے درمیان احکامات جاری کریں، ہمارا معاملہ عام انسانوں سے بالکل مختلف نوعیت کا ہے، ہمیں ہر قسم کا اختیار حاصل ہے، ہماری مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔۔۔

یہ اور اس قسم کے بے بنیاد دعاوی سے عیسائی عوام کو بے وقوف بنایا گیا، ٹیکسوں کا ظالمانہ نظام بھی بھرپور طریقے سے جاری تھا، کلیسا کے املاک بھی کسی ریاست کے املاک سے کم نہ تھے۔۔۔اس قسم کی باتوں نے عوام کے درمیان نفرت اور مخالفت کی ایک فضا پیدا کر دی جس کی آبیاری کلیسا کی طرف سے آئے روز کے ظلم و ستم سے مزید ہوتی رہی۔

یہاں تک کہ بعض جرأت مند نوجوان اُٹھے اور عوام میں کلیسا کے خلاف نفرت کے جذبے کو خوب پروان چڑھایا، لیکن یورپ چونکہ اس دور میں جہالت کی بند تاریکیوں میں گھسا ہوا تھا اس لئے کلیسا کے علاوہ ان کو کوئی اور مذہب نظر نہیں آیا اور یوں کلیسا کی مخالفت مذہب کی مخالفت بنتی چلی گئی، شاید مغرب نے بھی کنویں کے مینڈک کی طرح اپنی نادانی اور جہالت یا ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے کلیسا اور مذہب کو مترادف الفاظ سمجھ لئے۔

کلیسا کی کہانی

دوسری طرف کلیسا نے اپنی بادشاہت بلکہ خدائی برقرار رکھنے کی خاطر اپنے عوام پر پابندی لگا دی تھی کہ جس راستے سے بھی ان میں علم و حکمت یا عقل و شعور پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا تھا، اس کو قطعی حرام کر دیا جاتا تھا تاکہ کسی طرح کلیسا کی خدائی باقی رہے، اس لئے کلیسا کی طرف سے ہر علم و فن اور ترقی کی دشمنی کی جاتی تھی کہ جو فطرت کے خلاف ہے جبکہ اسی دور میں اندلس و قرطبہ میں عرب مسلمانوں نے علم و حکمت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے دریا نہیں، بلکہ گویا معطر سمندر بہانا شروع کئے تھے جس کو دیکھ کر عیسائیت میں

مقاومت کا جذبہ پیدا ہونا ایک فطری امر تھا، الیکن دوسری طرف اس کے پورا کرنے میں کلیسا کا نقصان تھا، اس لئے وہ ہر قیمت ان جیسے اقدامات کو کچلنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔

یورپ میں مذہب کے خلاف اس تصور کے قبول ہونے میں خود عیسائی مذہب کی فطرت کا بھی ایک حد تک دخل تھا، کیونکہ عیسائی مذہب دین اسلام کی طرح مکمل ضابطہ حیات نہ تھا جو انسانی دنیا کے ہر ہر گوشے کے لئے قابل عمل ہو، تعلیم و ثقافت، سیاست و حکومت، اخلاق و معاشرت، حدود و تعزیرات، عقائد و عبادات، اقتصاد و تجارت اور جنگ و جہاد وغیرہ زندگی کے تمام شعبوں کے تفصیلی احکام عیسائیت میں موجود نہ تھے، اور جو کچھ رہنمائی اصل مذہب میں موجود بھی تھی، اس کو بھی تغییر و تحریف کے گہرے سیاہ پردوں نے اتنا پوشیدہ کر رکھا تھا کہ اس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا بیچاری انسانی عقل و فکر کا کام نہ تھا۔

کلیسا نے محض اپنے مفاد کی خاطر ان سب چیزوں کو وضع کیا تھا اور ظاہر ہے کہ ایک خود غرض انسان کے بنائے ہوئے قانون سے اتنی بڑی انسانیت کو کہاں تک سکون و اطمینان نصیب ہو سکتا ہے؟ خصوصا جب بنانے والا بھی صرف اور صرف اپنے ہی مفاد کا پجاری ہو۔

یہی وجہ تھی کہ اگر کسی کے دل و دماغ میں اس خود ساختہ مذہب کے کسی حکم کے خلاف اشکال ذہن میں آتا یا اس کا کوئی حکم خلاف فطرت محسوس ہوتا تو کلیسا کی طرف یہی پٹی پڑھائی جاتی کہ "پہلے اپنی عقل کے چراغوں کو بجھاؤ، اس کے بعد حکم پر عمل کرو" گویا یہ احکام عقل سے سوچنے اور سمجھنے کی چیز ہے ہی نہیں، یہ تو عقل و روشنی کے دریچے بند کر کے قبول کرنے اور فوراہی عمل پیرا ہونے کے لئے ہیں۔ اس کھوکھلے پن کی وجہ سے بھی مذہب کے خلاف نفرت عام ہوتی گئی۔

عیسائیت اور مذہب کے خلاف عیسائیوں کے انقلاب برپا کرنے میں خود مذہبی جنگوں کو بھی بڑا دخل تھا، معمولی باتوں پر بڑی بڑی جنگیں لڑی جاتیں اور اس میں زیادہ تر نقصانات بے چارے عوام ہی کو اُٹھانا پڑتے تھے بلکہ کلیسا کی تاریخ و تہذیب سے یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ ذاتی مفاد کی جنگ کے لئے مذہب کا مقدس نام استعمال کیا ہو اور اس راستے سے دونوں طرف سے عوام کے کشت وخون کا بازار گرم کر کے اپنے اہداف پورے کئے ہوں۔

ان تمام اُمور کی وجہ سے یورپی عوام کے اندر مذہب کے خلاف نفرت کا جذبہ اپنی انتہاء کو پہنچا اور یوں کلیسا کے خلاف تمام عوام اُٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں اُنہوں نے اپنے اُوپر کلیسا کے اس نظام کو ختم کر ڈالا، لیکن ظاہر ہے کہ کلیسا اس تمام کاروائی میں مذہب ہی کا نام استعمال کرتا رہا، اس لئے کلیسا کی مخالفت مذہب کی مخالفت بنتی چلی گئی اور بالاخر یہی نظریہ قبول عام ہوا کہ دین کو سیاست و حکومت بلکہ تمام شعبہائے زندگی سے جدا کیا جائے، مذہب کو بس صرف مخصوص پوجا پاٹ تک ہی محدود رکھا جائے جس میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہو۔

اس "انقلاب" کے نتیجہ میں پوری زندگی سے دین سمٹ سمٹ کر صرف عبادت خانوں میں سکڑتا چلا گیا اور اسی نظریہ کو سیکولرازم کا بنیاد بنایا گیا۔

سیکولرازم کا فکر و فلسفہ برائے نظام زندگی

سیکولرازم کی اصل بنیاد مذہب کی مخالفت بنی اور اس نظریہ کے پرستاروں نے یہ دعوی کیا کہ انسانیت کو مذاہب کی تمام قیودات سے آزاد کرانا ہے، اور اس دعوی "جو چیز ہمارے مشاہدے میں نہیں، اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں" کو خوب شہرت دی گئی، تقریباً تمام سماوی مذاہب کا ایک بڑا حصہ ایمان بالغیب یعنی غیبی اُمور پر ایمان واعتقاد رکھنے پر مشتمل

ہوتا ہے اور تمام آسمانی مذاہب میں یہ بھی ایک قدر مشترک ہے کہ ان کا اصل ہدف انسان کی اُخروی زندگی کی اصلاح و درستگی ہے، اس لئے بہت سے احکام اپنے ماننے والوں کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اور بہت سے خواہشات کو بالکل ممنوع قرار دیا جاتا ہے، اسی مقصد کی خاطر ہر مذہب میں جائز و ناجائز کی ایک فہرست موجود ہوتی ہے۔

سیکولر نظریہ کے حاملین کو اسی بات سے چڑ تھی اور ہے، ان کا دعویٰ یہی تھا جس کو وہ بڑے زور و شور سے پیش کر رہے تھے کہ دنیا ہی سب کچھ ہے اور ہمارا علم و تحقیق، سائنس و ٹیکنالوجی ہی اصل ہدف اور کامیابی کی ضمانت ہے، جو چیز ہمارے تجربے میں نہیں اور جس چیز کا حواس سے کوئی سراغ نہ ملے، اس کے پیچھے پڑنا فضول اور آزادی کو ختم کرنا ہے اور انسانیت کو غلامی کا طوق پہنانا ہے، اب چونکہ مذہب کی بنیاد مغیبات پر ہوتی ہے، اس لئے وہ ہر قیمت پر اس کو کچل ڈالنا چاہتے ہیں، مذہب سے وارفتہ دل و دماغ کے سکون کے لئے ان کے ہاں اتنا کافی ہے کہ مذہب ہر کسی کا ایک شخصی معاملہ ہے، حکومت و ریاست بلکہ عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی فلسفہ کے تحت وہ مذہب کے خلاف مختلف قسم کے پروپیگنڈے کرتا رہا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ذیل میں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق سیکولرازم کے نظریات ذکر کئے جاتے ہیں۔

علم و فکر کے باب میں سیکولر نظریہ

سیکولرازم کا کہنا یہ ہے کہ دنیا میں مادہ ہی سب کچھ ہے، یہی زندگی کا اصل مقصد ہے اور اس میں ترقی اصل کامیابی اور تنزل اصل ناکامی ہے، مذہب کی بنیاد چونکہ غیبی اُمور پر ہے جن کو مادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اس لئے مذہب کوئی قابل اتباع چیز نہیں۔

حکومت وسیاست کے باب میں اس کا نظریہ

سیکولرازم میں مذہب کو حکومت وسیاست سے بالکل الگ کرنا ضروری ہے، یہ دونوں اُمور ہر ماحول اور ہر وقت کے رسمی طریقہ کار کے مطابق ہی سرانجام دینے چاہئیں، سیاست دان اور حاکم کے لئے عادل یا متقی ہونا، یا دینی علم رکھنا کوئی ضروری نہیں ہے، اسی طرح حکومت کے لئے دینی عقائد واحکام کی حفاظت کرنا، یا اس کے مطابق نظام زندگی ترتیب دینا، یا مذہب کے تحفظ ودفاع کے لئے جنگ کرنا قطعاً غلط ہے، حکومت کے اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دنیوی مفادات کا تحفظ کرے اور بس۔

دستور وقانون کے متعلق نظریہ

اسلام کا مؤقف یہ ہے کہ قرآن وسنت میں جو قوانین بتائے گئے ہیں وہ انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے ضروری ہیں اور حکومت وقت کا یہ اٹل فریضہ ہے کہ اپنی سلطنت میں قرآن وسنت ہی کے ان قوانین کو نافذ کرے اور اسی کے مطابق ریاست چلائے، لیکن سیکولرازم کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ قوانین مادیت کے مطابق نہیں، اس لئے یہ محض پراگندہ خیالات ہی ہیں (نعوذ باللہ)، عوام کی اکثریت جن نمائندوں کو منتخب کریں وہ مادیت اور لوگوں کے دنیوی مفاد کے خاطر جو بھی قوانین بنانا چاہے وہی اصل قوانین ہیں جن کا نفاذ حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اس دلسوز صورت حال کا یہ بھی ایک عجیب کرشمہ ہے کہ اگر یہی نمائندے اسی طریقہ کار کے مطابق بھی قرآن وسنت کے قانون کو ملکی دستور بنانا چاہیں تو سیکولرازم کے علمبرداروں کے نزدیک اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ یہ مادیت کے خلاف ہے اور اس سے انسانیت کو غیبی اُمور کی طرف رہنمائی ملتی ہے، گویا سیکولر نظریہ کے مطابق

عوام کے منتخب نمائندے بھی اس بات کے پابند ہیں کہ وہ مذہبی دستور کو نافذ نہ کریں، ورنہ ان کا انتخاب بھی سو فیصد غلط قرار پا جائے گا۔

معیشت واقتصاد کے متعلق نظریہ

اس نظریہ کا مؤقف یہ ہے کہ طلب ورسد کے مطابق ہر شخص کو تجارت کے میدان میں مکمل آزادی حاصل ہے، جہاں کوئی شخص اپنا فائدہ دیکھے تو وہ کاروبار کر سکتا ہے، کوئی شخص اس کا راستہ نہیں روک سکتا، یہاں سیکولرازم کے حمایت کرنے والے کہتے ہیں کہ "الغاية تبرر الوسيلة" یعنی جب اصل مقصود درست ہے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم وسائل استعمال کئے جاسکتے ہیں، اس میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز نہیں ہونی چاہئے۔

لہٰذا مذہب نے اس میدان میں انسانیت پر جو پابندیاں لگائی ہیں کہ وہ سود وقمار سے لازمی طور پر بچے، بیع فاسد اور باطل کو ممنوع قرار دیا وغیرہ وغیرہ ۔۔۔اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اخلاق وتربیت کے میدان میں اس کا نظریہ

سیکولرازم کا دعوی ہے کہ ہر زمانے کے اپنے اخلاق اور اپنا ایک خاص طرز عمل ہے، اس باب میں مذاہب کا پابند رہنا اور صدیوں پہلے کے اخلاق کو قبول کرنا حماقت ہے، زمانے کی عام روش جس چیز کو اخلاق کا درجہ دیدے، اسی کو اخلاق کہنا چاہئے اور اس حوالے سے کسی مذہبی داستان کی تقلید واتباع نہیں کرنی چاہئے، بلکہ اس کو دور اُکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔(نعوذ باللہ)

لہٰذا مذہب نے زنا، بد نظری اور ہم جنس پرستی وغیرہ جن اُمور کو ممنوع قرار دیا یا پردے کو لازم قرار دیا، یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ یہ باہمی رضامندی کی چیز ہے، اگر کوئی مرد و عورت زنا کرنے پر راضی ہیں تو مذہب کو اس میں مداخلت کا کیا حق ہے؟ اسی طرح اگر کوئی

جوڑا ہم جنس پرستی کرنا چاہے تو یہ ان کا حق ہے اور ان کا شخصی معاملہ ہے جس میں مذہب کو مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

تعلیم کے میدان میں سیکولر نظریہ

تعلیم بھی اُنہی چیزوں کی دینی چاہئے جن میں انسان کو کسی مادی فائدہ حاصل ہونے کا امکان ہو، اللہ کے وجود، توحید، انبیاء کرام کے واقعات اور حشر ونشر کی باتیں مذاہب کی طرف سے انسانیت کو فضول میں قید کرنے کے مترادف ہے، درست اور معیاری تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ اس کو ان جیسی باتوں سے بالکل دور رکھا جائے اور توجہ اُنہی اُمور پر مبذول کرلینی چاہے جہاں سے کوئی مادی فائدہ مل سکے۔

سیکولر تعلیمات و نظریات کا خلاصہ

لادینیت کی اس تحریک کے آغاز ونشوونما پر غور کرنے اور اس کے تمام نظریات کا تجزیہ کرنے کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

۱۔ اُخروی معاملہ کوئی قابل توجہ چیز نہیں۔

۲۔ انکے نزدیک دین ومذہب کی تعلیمات اس زمانے میں قابل عمل نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں سے جو لوگ اس تحریک سے متاثر ہوئے وہ برملا یہ واویلا کرتے ہیں کہ اس دور میں مسلمانوں کے پستی کی اصل جڑ مذہبی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہے یہی خرابی اور فساد کی اصل بنیاد ہے، مذہبیت کا جذبہ ہی وہ افیون ہے جس نے مسلمانوں کو بے خود کرکے تنزل کی اتاہ وادیوں میں ہمیشہ کے لئے دھکیل دیا ہے، ان میں سے ترکی کا کمال اتاترک، ہندوستان کا سرسید احمد خان اور مصر کا طٰہٰ حسین وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔

۳۔ دین ہر شخص کا ایک ذاتی معاملہ ہے جس میں ہر کوئی خود مختار ہے اور کسی کو

دوسروں کی زندگی میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں، اوران کے ہاں تمام مذاہب بالکل مساوی ہیں کسی کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں، نہ ہی مذہب کو بنیاد بنا کر کوئی امتیاز کرنا درست ہے۔

۴۔ عملی زندگی کے ساتھ دینِ اسلام سمیت کسی مذہب کا کوئی تعلق ہے نہ ہی اس کے احکام اس قابل ہیں کہ اس کو لے کر ترقی کے اس دور میں چلا جا سکے۔ اس کے مقابلے میں بہتر یہی ہے کہ ہر ملک میں اس کے منتخب شدہ نمائندے اس ملک کے مزاج و معاشرے کے مطابق قانون سازی کریں۔

سیکولرازم کے شرعی حکم کی تحقیق

اسی کتاب کے چوتھے باب میں تکفیر کا قاعدہ ذکر کیا گیا تھا، اس میں یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ اسلام معتبر ہونے کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ رضا و محبت: دین اور تمام ضروریاتِ دین پر راضی رہنا اور اسکے ساتھ محبت کرنا۔

۲۔ تعظیم واحترام: دین اور تمام ضروریاتِ دین کی تعظیم کرنا، ان کو قابل عظمت و احترام سمجھنا۔

۳۔ تسلیم وانقیاد: دین اور اس کے سارے قطعی احکام کی فرمان برداری کرنا۔

۴۔ مخالف ادیان و مذاہب سے بیزار ہونا۔

یہ چاروں اُمور ایمان کے ضروری لوازم ہیں، ان میں سے اگر کوئی ایک بھی فوت ہو جائے تو ایمان کالعدم شمار ہوگا جس کی تفصیل وہاں گزر چکی ہے۔

اگر سیکولرازم کے ان بنیادی نظریات اور ایمان کے ان چاروں لوازم پر غور کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سیکولر ازم کے اس نظریہ میں ایمان کے یہ چاروں لوازم مفقود ہیں۔

یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرلیناچاہئے کہ دین اسلام کاجو حکم بھی قطعیت کے ساتھ ثابت ہو، اس کے ساتھ یہ لوازم رضاومحبت ، تعظیم واحترام اور تسلیم وانقیادضروری ہیں، اگرکسی ایک حکم کے ساتھ بھی یہ لوازم نہ رہے بلکہ ان کی اضداد ونقائض پائی جائیں تو یہ کفر ہے۔

مثلاً کوئی شخص تمام شریعت کومانتاہے، اس کے ساتھ رضاومحبت بھی رکھتاہے تعظیم واحترام بھی کرتاہےاوراس کے سامنے تسلیم وانقیاد بھی بجالاتاہے لیکن سود کی حرمت کاشریعت نے جوحکم دیا، اس پر وہ راضی نہیں یاحرمت کے اس حکم شرعی کاوہ توہین و مذاق کرتاہے تویقیناً ایسا شخص کافرہے۔

اس نکتہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اگر سیکولرازم کے ان نظریات پر غور کیا جائے تواس میں شریعت کے کسی خاص حکم یاخاص باب ہی کے ساتھ یہ لوازم مفقود نہیں، بلکہ دین کے اکثر حصے کے ساتھ اس کایہی معاندانہ رویہ ہے، سیاست وحکومت، تجارت و اقتصاد، تعلیم وتربیت، نکاح ومعاشرت وغیرہ تمام ابواب میں شریعت کے دئے ہوئے سارے احکام کے ساتھ اس کایہی رویہ ہے کہ نہ ان تعلیمات پراس کی رضامندی ہے نہ ہی تعظیم واحترام کاکوئی شائبہ اورنہ ہی اس کو عملی زندگی میں تسلیم کرنے کاکوئی ارادہ ہے۔

بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے ان تمام شعبوں میں شریعت کے دئے ہوئے احکام سے نالاں اور قطعاناخوش ہے، اپنے آغاز سے لے کر آج تک مختلف انداز سے ان کی توہین وتذلیل کرتارہا، اور تسلیم وانقیادتوکیاکرتااس کواس قابل ہی نہیں سمجھتاجس پر موجودہ دورمیں عمل کیاجاسکے۔

لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ سیکولرازم کے نام لینے والوں میں ایک بڑی تعدادان لوگوں کی بھی شامل ہیں جواس نظریہ کے ان بنیادی حقائق اوراصل اہداف

سے بالکل ناواقف ہیں اوراس حوالے سے وہ سیکولرازم کے ان خلاف دین اُمور میں مذہب کے ساتھ ایک حدتک مخلص بھی ہیں، ایسے لوگ سیکولرازم کے اصل نظریہ کی طرح مذہب کو وہ حیثیت نہیں دیتے کہ مادے کواس پر ترجیح دینے لگے یادینی تعلیمات واحکام کو اس دور میں ناقابل عمل اورناقابل نفاذ سمجھے۔

ان دونوں اُمور کی وجہ سے تمام افراد پر یکساں حکم لگانامشکل اور خلاف احتیاط ہے، بس اُصولی طور پر مسئلہ یہ ہے کہ سیکولرازم کے اُصول واہداف جو ابھی مذکور ہوئے، ان تفصیلات کے مطابق یہ خالص کفریہ نظریہ ہے اور اس کے نام لینے والوں میں سے جو بھی شخص سیکولرازم کے مندرجہ بالا اُمور کا حامی ہو یااس کے علاوہ کسی ایسے نظریہ یا قول وعمل کا حامل ہو جس سے دین اسلام یااس کے قطعی اور کسی یقینی حکم کے ساتھ مندرجہ بالا چارلوازم میں سے کوئی لازم واضح اور یقینی طور پر فوت ہورہاہو، تووہ شخص بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے، اور اگر کوئی شخص ان جیسے نظریات کا بالکل حامل نہ ہو بلکہ صرف پروپیگنڈے کی وجہ سے "سیکولر" کہلاتا ہو لیکن اس کی بنیاد اور اصل اہداف سے قطعاًنابلد ہو تو ایسے شخص کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔

سیکولرازم کا نظریہ متقدمین کی نظر میں

متقدمین اور متاخرین تمام اہل حل وعقد کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن وسنت میں جو اوامر اور نواہی وارد ہیں، یہ کسی خاص زمانے یا مخصوص علاقے کے ساتھ مختص نہیں ہیں بلکہ قیامت تک کے لئے اور پوری دنیا کی طرف یہ احکام متوجہ ہوتے ہیں اور تمام انسان دین اسلام کے اُصول کے مطابق ایمان لانے اور پھر اس کے احکام پر عمل کرنے کے مکلف ہیں، متقدمین کے زمانے میں تو سیکولرازم جیسا بودا نظریہ ایجاد نہیں ہوا تھا، تاہم اس کے باوجود ان حضرات نے ایک دوسری گمراہی کو ختم کرنے کے ضمن میں جو تفصیلات ذکر

فرمائی ہیں، وہ آج کے دور کے سیکولر ازم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں، اسی طرح ان حضرات نے اس ضمن میں جو دلائل ذکر فرمائے ہیں وہ عصر حاضر میں بھی سمجھ دار آدمی کے لئے اس باب میں رہنمائی کا کافی کام دیتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک زمانے میں بعض جاہل صوفیہ نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ ہم قرب ورضا کے اس مقام پر پہنچے ہیں کہ اب ہمیں مزید اوامر اور نواہی پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں رہی، گویا اب ہم دین اسلام کے ان ظاہری احکام کے مکلف نہیں رہے۔

اس بات کی تردید میں تمام اہل سنت نے اس بات پر اتفاق کیا کہ دنیا کے اندر رہتے ہوئے کوئی ایسا مقام ورتبہ نہیں ہے جس پر پہنچنے کے بعد آدمی مکلف نہ رہے، بلکہ جب تک کوئی انسان عقل وبلوغ کی نعمت سے متصف ہو تو وہ اس دنیا میں مکلف ہی رہے گا جب تک کہ کوئی ایسے عوارض پیش نہ آئیں جن کی وجہ سے خود شریعت انسان سے تکلیف کا بوجھ اُٹھا دیتی ہے (جس کی تفصیل اُصول فقہ کی کتابوں میں ذکر کی جاتی ہے) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور خصوصاً سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس کی زندہ پائندہ مثال ہے کہ انسانیت کے لئے ممکنہ تمام ترقیوں اور رفعت وقربت کے سارے منازل بڑے کمال اور نہایت استقامت کے ساتھ طے فرمائے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو آخر عمر تک عبادات کا حکم دیا جاتا رہا۔

فقہاء کرام نے ان نام نہاد صوفیہ کے دعویٰ کو قرآن وسنت کے نصوص سے متصادم قرار دیا، بلکہ بہت سے حضرات نے اس دعویٰ کو ان بدعات کی فہرست میں شمار فرمایا جو موجب کفر ہوتے ہیں، چنانچہ امام شاطبی رحمہ اللہ اس موضوع پر اپنی مشہور اور مفید کتاب "الاعتصام" میں تحریر فرماتے ہیں:

فمن رأى أن التكليف قد يرفعه البلوغ إلى مرتبة ما من مراتب الدين - كمايقوله أهل الإباحة - كان قوله بدعة مخرجة عن الدين.

"جو کوئی یہ سمجھے کہ دین کے کسی رتبہ پر پہنچنے کے بعد تکلیف ختم ہو جاتی ہے تو اس کا یہ کہنا ایسی بدعت ہے جو انسان کو دین کے دائرہ سے نکال دیتی ہے۔"[۱]

واضح رہے کہ یہاں دینی رتبہ کی جو قید لگائی گئی، یہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں، جن لوگوں کی تردید کرنی مقصود تھی، ان کا یہی خیال تھا کہ دینی مراتب میں سے ایک بڑے مرتبہ پر پہنچنے کے بعد تکلیف ختم ہو جاتی ہے، اس لئے اس کے مطابق یہ قید لگائی گئی، ورنہ اس باب میں دین و دنیا کے اندر کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ بھی شرح العقائد میں اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

(ولا يصل العبد) ما دام عاقلاً بالغاً (إلى حيث يسقط عنه الأمر والنهي) لعموم الخطابات الواردة في التكاليف وإجماع المجتهدين على ذلك. وذهب بعض الإباحيين إلى أن العبد إذا بلغ غاية المحبة وصفا قلبه واختار الإيمان على الكفر من غير نفاق سقط عنه الأمر والنهي ولا يدخله الله تعالى النار بارتكاب الكبائر وبعضهم إلى أنه يسقط عنه العبادات الظاهرة

---

[۱] الاعتصام للشاطبي ت الهلالي،فصل الأخذ بالمطلقات قبل النظر في مقيداتها ،ج۱ص۳۱۳.

من الصلاة والصوم والزكاة والحج وغير ذلك، وتكون عبادته التفكر، وهذا كفر وضلال.

"انسان جب تک عاقل بالغ رہے تو وہ کسی ایسے مقام پر نہیں پہنچ سکتا جس کی وجہ سے اس سے اوامر ونواہی ساقط ہو جائیں، کیونکہ نصوص میں جو تکلیفی احکام بیان ہوئے ہیں وہ (تمام انسانیت کے لئے) عام ہیں اس پر مجتہدین کا اجماع ہے۔ بعض اباحت پسند لوگوں نے یہ مؤقف اپنایا ہے کہ جب بندہ محبت کی انتہا اور دل کی صفائی کے مقام کو پہنچے اور بغیر کسی قسم کے نفاق کے، ایمان کو کفر پر ترجیح دیدے تو اس سے احکام ساقط ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہوں کی وجہ سے اس کو جہنم میں داخل نہیں کریں گے۔ انہی اباحت پسندوں میں سے بعض نے یہ خیال اپنایا ہے کہ اور حج وغیرہ ساقط ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد اس کی عبادت (اللہ تعالیٰ کے اس مقام پر پہنچنے کے بعد (تمام تو نہیں البتہ) ظاہری عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ حج وغیرہ احکامات ساقط ہو جاتے ہیں اور اسکی عبادت صرف ذات وصفات میں) فکر کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ یہ خیال کفر اور گمراہی ہے۔"[۱]

جب دنیا میں رہتے ہوئے ایک انسان سے تکلیف ختم نہیں ہو سکتی تو پورے ملک کو دین سے کیسے مستغنی قرار دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ سیکولرازم کا اصل فلسفہ ہی یہی ہے کہ حکومت وسیاست بلکہ انسانی زندگی سے دین کے تسلط کو کچل دیا جائے جس کی تفصیل تعارف کے اندر ذکر کی جا چکی ہے۔

لہٰذا اگر ایک شخص کے متعلق یہ خیال بدعت مکفرہ ہے تو دین کو سیاست وحکومت

[۱] شرح العقائد النسفیةص ۵۳۹ (المطبوع مع النبراس من مكتبة البشریٰ).

اورولایت وتسلط سے بالکل باہر کرنا اور ان اُمور میں مکمل آزادی کو روا رکھنا، انسانیت کو اس سے بالکل مستغنی سمجھنا یقیناً بدعت مکفرہ ہے۔

مجمع الفقہ الاسلامی کی قرارداد

مجمع الفقہ الاسلامی نے اس کے متعلق قراردادرقم: ۹۰ (۱۱/۲)صادر فرمایا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ:

رابعًا: إن العلمانية نظام وضعي يقوم على أساس من الإلحاد يناقض الإسلام في جملته وتفصيله، وتلتقي مع الصهيونية العالمية والدعوات الإباحية والهدامة، ولهذا فهي مذهب إلحادي يأباه الله ورسوله والمؤمنون.

خامسًا: إن الإسلام هو دين ودولة ومنهج حياة متكامل، وهو الصالح لكل زمان ومكان، ولا يقر فصل الدين عن الحياة، وإنما يوجب أن تصدر جميع الأحكام منه، وصبغ الحياة العملية الفعلية بصبغة الإسلام، سواء في السياسة أو الاقتصاد، أو الاجتماع، أو التربية، أو الإعلام وغيرها.

"علمانیہ (سیکولرازم) ایک وضعی نظام ہے جس کی بنیاد ہی الحاد پر ہے، یہ مجموعی اور تفصیلی طور پر اسلام کے خلاف ہے، اس کی جڑیں عالمی صہیونیت اور اباحیت والی تحاریک کے ساتھ ملتی ہیں، اسی لئے یہ ایک الحادی مذہب ہے جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے بالکل خلاف ہے۔

پانچویں قرارداد: یقیناً اسلام ایک جامع دین، حکومت اور مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہر زمانے اور ہر جگہ کے مناسب ہے، دین کو زندگی سے جدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ

ضروری ہے کہ زندگی کے تمام احکام دین اسلام ہی سے صادر ہو، اور عملی زندگی کو اسلام کے رنگ سے رنگا جائے چاہے وہ سیاست واقتصاد کے میدان میں ہو یا اجتماع وتربیت اور صحافت کا میدان ہو (غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں دین سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے)۔"[۱]

سعودی عرب کے لجنۃ العلماء کا فیصلہ

سعودی عرب کے فقہی لجنہ کے پاس علمانیہ کے متعلق ایک سوال آیا، جس کے جواب میں اراکین نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ:

ج: ما يسمى بالعلمانية التي هي دعوة إلى فصل الدين عن الدولة، والاكتفاء من الدين بأُمور العبادات، وترك ما سوى ذلك من المعاملات وغيرها، والاعتراف بما يسمى بالحرية الدينية، فمن أراد أن يدين بالإسلام فعل، ومن أراد أن يرتد فيسلك غيره من المذاهب والنحل الباطلة فعل، فهذه وغيرها من معتقداتها الفاسدة دعوة فاجرة كافرة يجب التحذير منها وكشف زيفها، وبيان خطرها والحذر مما يلبسها به من فتنوا بها، فإن شرها عظيم وخطرها جسيم. نسأل الله العافية والسلامة منها وأهلها.وبالله التوفيق، وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم.اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء.

"سیکولرازم جو کہ حکومت سے دین کو جدا کرنے، صرف عبادات پر اکتفاء کرنے

[۱] مجلة مجمع الفقه الإسلامي،الإسلام في مواجهة العلمنة ،ج۲ص ۲۲۱۱۳.

اور باقی مکمل دینی آزادی کی طرف دعوت دینے کا نام ہے کہ جو اسلام کو بطور دین قبول کرنا چاہے تو کرے اور جو کوئی اس سے مرتد ہو کر دوسرا کوئی دین و مذہب اختیار کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہے، تو یہ اور اس قسم کے دیگر غلط نظریات ایک ناجائز اور کافرانہ دعوت ہے جس (کے انجام بد) سے لوگوں کو ڈرانا اور اس کی کمزوری اور خطرات وہولناکی واضح کرنا اور اس فتنہ میں گرفتار لوگوں کی تلبیسات ودسیسہ کاریوں سے بچنا لازم ہے کیونکہ اس فتنہ کا شر بڑا اور خطرات زیادہ ہیں۔"[۱]

اس جواب پر لجنہ دائمہ کے اراکین میں سے مندرجہ ذیل پانچ شخصیات کے دستخط ہیں:

۱۔ بکر أبو زید۔ ۲۔ صالح الفوزان۔ ۳۔ عبد اللہ بن غدیان۔ ۴۔ عبد العزیز آل الشیخ۔ ۵۔ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز

شیخ الاسلام مصطفی صبری رحمہ اللہ کی دقت نظری

جیسا کہ پہلے اس بات کی وضاحت کی گئی کہ سیکولرازم نے ابتدائی دور میں اپنا اصلی ہدف پورے طور پر واضح نہیں کیا تھا بلکہ ایک مبہم سا تصور عام کیا گیا کہ "اس نظام کا مقصد صرف سیاسی میدان سے دین کو مستقل طور پر الگ رکھنا ہے" خلافت عثمانیہ کے اخیر دور کے شیخ الاسلام علامہ مصطفی صبری رحمہ اللہ نے اس نظریہ پر اسی نکتہ نظر سے بحث کی، اور بڑے پُرزور انداز میں اس کی تردید فرمائی، بلکہ آپ نے اس کو حکومت کا ارتداد قرار دیا۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

[۱] فتاوی اللجنة الدائمة،الفرق، العلمانية والحرية الدينية،الفتوى رقم: (۱۸۳۹۶) ج۲ص۱۴۳.

قد كان فى كل بدعة أحدثها العصريون المتفرنجون في البلاد الإسلامية كيد للدين ومحاولة الخروج عليه لكن كيدهم في فصله عن السياسة أدهي وأشد من كل كيد في غيره، فهو ثورة حكومية علي دين الشعب في حين أن العادة أن تكون الثورات من الشعب علي الحكومة وشق عصا الطاعة منها أي الحكومة لأحكام الإسلام، بل ارتداد عنه من الحكومة أولا ومن الأمة ثانيا إن لم يكن بارتداد الداخلين في حوزة تلك الحكومة باعتبارهم أفراد فباعتبارهم جماعة، وهو أقصر طريق إلى الكفر من ارتداد الأفراد.

"معاصر انگریزوں نے اسلامی شہروں میں جو بھی بدعت ایجاد کی ہے، اس میں دین کے خلاف کوئی مکرو تدبیر اور دین کے خلاف نکلنے کی کوشش ضرور موجود ہوتی ہے تاہم دین کو سیاست معاملات سے نکالنے کا مکر نہایت تاریک اور ہر قسم کے مکر سے زیادہ سخت ہے، یہ ایک باقاعدہ حکومتی حملہ ہے افراد کے دین ومذہب کے خلاف، حالانکہ ابھی تک دستور یہ رہا کہ افراد حکومت کے خلاف حملہ کرتے ہیں، اور یہ حکومت کا احکام اسلام کی پیروی ختم کرنا ہے بلکہ اولاً حکومت کا پھر پوری امت کے ارتداد (کاذریعہ) ہے، اگر حکومت کے تحت داخل ہونے والے افراد ذاتی حیثیت سے مرتد نہ بھی ہوجائے تو بھی قوم وجماعت کے اعتبار سے یہ ارتداد ہے جو کہ افراد کے ارتداد سے مختصر راستہ ہے کفر کی جانب۔"[۱]

---

[۱] موقف العقل والعلم والعالم من رب العلمين، الباب الرابع في عدم جواز فصل الدين

اس عبارت سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ دین کو سیاست و حکومت کے میدان سے الگ کرنے اور اس میدان کو دینی احکام سے آزاد کرنے کے جواز کا نظریہ آپ کے نزدیک ایک کفریہ تصور ہے اور کوئی حکومت کی اگریہی پالیسی اپنائے تو آپ کے نزدیک ایسی حکومت مسلمان نہیں ہے، اورآپ رحمہ اللہ نے صرف حکومت ہی کا یہ حکم نہیں لکھابلکہ اس عبارت کے متصل بعد آپ نے مزید یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

بل أنه يتضمن ارتداد الأفراد أيضا لقبولهم الطاعة لتلك الحكومة المرتدة التي ادعت الاستقلال لنفسها بعد أن كانت خاضعة لحكم الإسلام عليها-

"بلکہ یہ افراد کے ارتداد کو بھی شامل ہو جاتا ہے، کیونکہ لوگوں نے اس مرتد حکومت کی اطاعت قبول کی ہے جو پہلے اسلام کے حکم کی تابع تھی اور اب اپنے لئے آزاد ہونے کا دعویٰ کیا۔"

یہ بات بھی بالکل واضح رہے کہ آپ نے اپنی یہ رائے صرف اس تصور کی بناء پر دی کہ دین کو صرف سیاست کے میدان سے نکالا جائے، لیکن اس کے باوجود آپ نے اس کو ارتداد قرار دیا، اس سے "علمانیہ" اور سیکولرازم کا اصل اہداف کا حکم باسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔

علامہ زاہد کوثری رحمہ اللہ کا فتویٰ

خلافت عثمانیہ کے سقوط کے ایک عرصہ بعد یہی سوال علامہ محمد زاہد کوثری رحمہ

عن السياسة، ص ٢٨١، ٢٨٢.

اللہ سے کیا گیا جو کہ دور خلافت میں نائب شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز تھے اور نہایت وسیع النظر، جرأتمند اور اعلیٰ علمی ذوق سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے، حلب کے بعض علماء کرام کی طرف سے آپ سے یہ استفسار کیا گیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان شخص اپنے شہر میں یہ کوشش کرے کہ حکومت کا سرکاری مذہب تو اسلام ہی رہے لیکن بطور قانون اسلام نافذ نہ رہے بلکہ اس کی جگہ وضعی قوانین جاری کر دیے جائیں تو ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کا آپ نے تفصیلی جواب لکھا جس میں آپ لکھتے ہیں:

فالمسلم إذا طالب بمثل ذلك في سلامة عقله يجري عليه حكم الردة.. وقد دلّت نصوص الكتاب والسنة على أن دين الإسلام جامع لمصلحتي الدنيا والاٰخرة ولأحكامهما دلالة واضحة لا ارتياب فيها، فتكون محاولة فصل الدين من الدولة كفرا صارخا منابذا لإعلاء كلمة الله وعداء موجها إلى الدين الإسلامي في صميمه، ويكون هذا الطلب من هذا المطالب إقرار منه بالانبتار والانفصال فيلزمه بإقراره، فنعدّه عضوا مبتورا من جسم جماعة المسلمين وشخصا منفصلا عن عقيدة أهل الإسلام فلا تصح مناكحته ولا تحل ذبيحته لأنّه ليس من المسلمين ولا من أهل الكتاب.

"اگر کوئی مسلمان شخص بقائمی ہوش و حواس ایسا مطالبہ کرے تو اس پر ارتداد کا حکم جاری ہو گا۔ قرآن و سنت کے نصوص اس بات کی رہنمائی کرتے ہیں کہ بلاشبہ دین اسلام دنیا و آخرت کے مصالح اور احکام پر پوری طرح مشتمل ہے، لہٰذا دین کو حکومت سے جدا کرنے کی کوشش کھلم کھلا کفر، اعلاء کلمہ اللہ کو ڈھانا

اور دین اسلام کے ساتھ دلی دشمنی ہے، ایسا مطالبہ گویا دین سے جدائی کا اقرار کرنا ہے اور اپنا یہ اقرار اس پر ثابت ہو جائے گا (دین سے نکل جائے گا) ہم ایسے شخص کو مسلمانوں کے اجتماعی جسم سے کٹا ہوا عضو سمجھیں گے (اور ہم اس کو یوں قرار دیں گے کہ) مسلمانوں کے عقیدے سے ہٹا ہوا شخص ہے، لہٰذا اس کے ساتھ نکاح کرنا بھی جائز نہیں اور اس کا ذبیحہ بھی حلال نہیں کیونکہ وہ نہ مسلمان ہے اور نہ ہی اہل کتاب میں سے ہے (جبکہ نکاح اور ذبح کے صحیح ہونے کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک ہونا ضروری ہے)۔

اس کے بعد آپ رحمہ اللہ نے اپنے اس دعویٰ پر حضرت ابو بکر اور اس کی معیت میں تمام حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے فیصلے سے استدلال فرمایا کہ حضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد عرب کے بعض قبائل نے جب صرف ایک حکم کے متعلق یہ رویہ اختیار کیا کہ اس کو حکومتی طور پر نافذ نہیں ہونا چاہئے تو صحابہ کرام نے اس کو ارتداد سمجھا اور مرتدین جیسا معاملہ فرمایا، جب ایک حکم کو سیاست و حکومت سے جدا رکھنے کا یہ حکم ہے تو پوری شریعت کو حکومت و قانون سے جدا رکھنے کا کیا حکم ہو گا؟

چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

وقد عدّ الصديق الأكبر رضي الله عنه الذين حاولوا إبعاد حكم جباية الزكوة عن الأحكام التي تنفذها الحكومة في سبيل الارتداد حتى عاملهم معاملة المرتدين من قتل وسبي و أجمعت الصحابة على موافقته.. فكيف من لايرضى بقضاء الإسلام خارجا عن عقيدة الإسلام منفصلا عن جماعة

المسلمين؟ [١]

"جن لوگوں نے زکوۃ کے حکم حکومت کے نفاذ واختیار سے دور کرنے کی کوشش کی تھی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کو ارتداد سمجھا اور ان کے ساتھ مرتدین جیسا معاملہ فرمایا کہ (لڑنے والوں کو) قتل کیا اور (باقی کو) قید کیا، اور صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) نے بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی موافقت پر اجماع کیا، تو جو کوئی اسلام کے قضاء (و قانون کو نافذ کرنے) پر خوش نہ ہو وہ کیونکر اسلام کے عقیدے اور اہل اسلام کی جماعت سے خارج نہیں ہوگا؟۔"

علامہ عبد القادر عودہ کی رائے

علامہ عبد القادر عودہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

يعتبر خروجًا عن الإسلام صدور قول من الشخص هو كفر بطبيعته أو يقتضي الكفر؛ كأن يجحد الربوبية فيدعى أن ليس ثمة إله-- أو جحد القرآن أو شيئًا منه أو جحد البعث أو أنكر الإسلام أو الشهادتين أو أعلن براءته من الإسلام أو قال إن الشريعة لم تجئ لتنظيم العلاقات بين الإفراد والجماعات والحاكمين والمحكومين وأن أحكامها ليست واجبة التطبيق فى كل الأحوال وعلى كل المسائل أو قال إن أحكام الشريعة كلها أو بعضها ليست أحكامًا دائمة وإن بعضها أو كلها موقوت

[١]مقالات الكوثري، حكم محاولة فصل الدين عن الدولة، ص٢٨٧.

بزمن معين أو قال إن أحكام الشريعة لا تصلح للعصر الحاضر وإن غيرها من أحكام القوانين الوضعية خير منها.

"جب کوئی شخص ایسی بات کرے جو کفر ہو یا کفر کا تقاضا کرتی ہو تو اس کی وجہ سے کہنے والے کا اسلام سے خارج تصور کیا جائے گا مثلاً کوئی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار کرے کہ کوئی خدا نہیں ہے یا قرآن کے کسی حصہ کا انکار کرے، قیامت، اسلام یا توحید ورسالت کا انکار کرے، اسلام سے اپنے بری ہونے کا علان کرے، یا یہ کہے کہ شریعت اس لئے نہیں کہ افراد اور جماعت اور حاکم ومحکوم کے درمیان تعلقات کو ترتیب دے، اسلام کے احکام ہر زمانے میں لاگو کرنا ضروری نہیں، نہ ہی اس کے تمام احکام لاگو کرنا کوئی لازم ہے، یا شریعت کے تمام احکام یا بعض احکام کے متعلق یہ کہے کہ یہ دائمی نہیں ہیں بلکہ کسی خاص زمانے کے ساتھ خاص تھے، یا یہ کہے کہ شریعت کے احکام موجودہ دور کے مناسب نہیں اور اسکے علاوہ موجودہ مروّجہ قوانین اسلامی احکام سے بہتر ہیں (تو یہ باتیں کفریہ ہیں اور ان کے کہنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔)[۱]

تحکیم بغیر ما انزل اللہ

عصر حاضر کے پیچیدہ اور گھمبیر نوعیت کے حامل مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ "تحكيم بغير ما أنزل الله" بھی ہے یعنی لوگوں کے درمیان تنازعات میں غیر شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا، اس مسئلہ کا تعلق براہ راست "تکفیر" کے باب کے ساتھ ہے

[۱] التشريع الجنائي الإسلامي مقارنا بالقانون الوضعي، الباب الثانی، الكتاب السابع: الردة،ج۲ص۷۱۰.

اور دوسری طرف معرکۃ الاراء بھی ہے اس لئے ذیل میں اس کے متعلق کچھ مختصر سی تفصیل ذکر کر دی جاتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسلام قیامت تک کے انسانوں کے لئے ایک جامع اور مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے متعلق احکام موجود ہیں، شریعت اسلامیہ نے انسانیت کے نام جو ضروری احکام جاری فرمائے ہیں، ان میں سے ایک اہم اور ضروری حکم یہ بھی ہے کہ تمام مسلمان اپنے باہمی تنازعات میں اسی دین حق کے مطابق ہی فیصلہ کیا کریں، اختلافات و تنازعات کو حل کرنے کے لئے شریعت اسلام ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔

ارشادِ خداوندی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا [النساء: ٥٩]

ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حاکم ہوں، پھر اگر آپس میں کوئی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیرو اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو یہی بات اچھی ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔"

دین اسلام میں اس حکم کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ قرآن کریم میں دین اسلام اور خدا کے نازل کردہ اس قانونِ حق کے علاوہ دیگر کسی دستور و قانون پر فیصلہ کرنے والے کو "کافر" تک فرمایا گیا، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

مَنْ لَمْ یَحْکُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰہُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ - [المائدة: ٤٤]

"اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی لوگ کافر ہیں۔"

لٰہذا اتنی بات تو اتفاقی ہے کہ شریعت اسلام کے مطابق ہی فیصلے کرنا ضروری ہے اور اس کے بالمقابل دیگر قوانین کے بنیاد پر فیصلے کرتے رہنا بالکل ناجائز اور حرام ہے، جس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن اگر کسی نے اس طرح خلاف حق فیصلہ کیا تو اس جرم کی وجہ سے کیا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا جس طرح کہ مندرجہ بالا آیت کریمہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے یا خارج نہیں ہو گا؟

مسئلہ کی نزاکت

مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت اس بات سے مزید بڑھ جاتی ہے کہ موجودہ دور میں اکثر مسلمان ممالک کا یہ حال ہے کہ وہاں جس قانون کو معیار بنایا جاتا ہے جس کے مطابق حکومت کی طرف سے فیصلے صادر ہوتے ہیں، وہ اکثر امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ مغربی ممالک کا قانون ہوتا ہے، یا اگر کسی ملک نے اپنا قانون بھی بنانا چاہا تو چونکہ حکومت کی بنیاد جمہوریت ہے، اس لئے پارلیمنٹ کے اکثریت کی طرف سے جو قوانین بنائے جاتے ہیں، ان ہی کو ملک کے قانون و دستور کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، بعض عرب ممالک میں احوال شخصیہ وغیرہ بعض شعبوں کی حد تک اسلامی قانون نافذ ہے، لیکن فوجداری وغیرہ تمام معاملات میں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر ہی فیصلے صادر ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خلاف شرع قوانین کے بنیاد پر فیصلہ کرنا کفر ہو تو اس کفر کا اطلاق کن کن لوگوں پر ہو گا؟ صرف عدالت پر جہاں سے یہ فیصلے جاری ہوتے ہیں؟ یا پارلیمنٹ بھی اس میں شریک ہو گا کیونکہ وہی خدائی قانون کے مقابلے میں دوسرا قانون

بنانے کی جسارت کرتی ہے؟ یا ان دونوں اداروں کے ساتھ ساتھ فوج و پولیس بھی اس جرم میں شریک ہوں گے کیونکہ وہی اس قانون کے محافظ ہیں؟ اور پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ تمام عوام اور رعایا کے دین وایمان پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ اسی حکومت اور اسی قانون کو اپنا آئین، قانون اور دستور کہنے پر صرف راضی ہی نہیں بلکہ مصر ہیں۔

معاصر فقہاء کرام کا اختلاف

دور حاضر میں جن اہل علم حضرات نے اس موضوع پر بحث فرمائی ہیں، ان کی بنیادی طور پر اس مسئلہ میں درج ذیل مواقف ہیں۔

بعض اہل علم کا مؤقف

ان حضرات کے نزدیک ایمان صرف دلی تصدیق ہی کا نام نہیں بلکہ "عمل" بھی باقاعدہ ایمان کا جز ہے، جس طرح تصدیق نہ کرنے کی وجہ سے کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے، اسی طرح بعض اعمال کو بھی شریعت نے کفر کہا اور کہنے والوں کو کافر قرار دیا، جو شخص اس عمل کا ارتکاب کرے تو وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، اگرچہ تصدیق موجود بھی ہو، کیونکہ تصدیق اور عمل دونوں ایمان کے دو مستقل اجزا ہیں، ان دونوں میں سے کسی ایک جز کے فوت ہونے سے بھی ایمان منتفی ہو جائے گا۔ ایمان کے فوت ہونے کے لیے دونوں اجزاء کا ایک ساتھ فوت ہونا ضروری نہیں۔

علامہ ابن تیمیہ کی تصریح

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اس مؤقف کی بڑے زور و شور سے ترجمانی کی ہے، آپ نے اپنے مجموع الفتاوی میں بھی اس پر تفصیلی بحث کی اور اپنی دیگر کتابوں میں بھی ایک سے زائد مقامات پر یہی مؤقف اپنے دلائل کے ساتھ بیان کیا، چنانچہ آپ اپنی کتاب الصارم

المسلول میں تحریر فرماتے ہیں:

إن سب الله أو سب رسوله كفر ظاهرا وباطنا وسواء كان الساب يعتقد أن ذلك محرم أو كان مستحلا له أو كان ذاهلا عن اعتقاده هذا مذهب الفقهاء وسائر أهل السنة القائلين بأن الإيمان قول وعمل.[۱]

"اگر کوئی خدا تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کو گالی دے خواہ حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کرے یا حرام یا ان باتوں سے غافل ہو، بہر حال ہر طرح سے کافر سمجھا جائے گا یہی تمام اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے جن کے نزدیک ایمان قول فعل کا نام ہے۔"

اس عبارت میں صراحت ہے کہ قرآن و سنت میں جن جن گناہوں کو کفر فرمایا گیا، ان کا صرف ارتکاب ہی کفر ہے، اگر چہ ارتکاب کرنے والے کو اس کے حکم شرعی ہونے کا اقرار بھی ہو اور اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو گناہگار ہی تصور کرتا رہے۔

اس عبارت کے بعد آپ نے اپنی تائید میں امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کا ایک قول بھی پیش کیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کی شان میں کوئی گستاخی کرے یا شریعت کے کسی ثابت شدہ حکم کو رد کر دے یا خدانخواستہ کسی نبی ﷺ کو قتل کرے تو ایسا شخص کافر ہے اگر چہ وہ توحید و رسالت کا اقرار بھی کرتا رہے، یعنی دل میں تصدیق بر قرار رہے یا نہ؟ اس کا کوئی لحاظ نہیں، اس جیسی حرکت خود ہی موجب کفر ہے۔[۲]

---

[۱] الصارم المسلول على شاتم الرسول، المسألة الرابعة في بيان السب المذكور

[۲] علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی معلومات میں وسعت، قلم میں تیزی و روانی اور مسائل بیان کرنے میں

فقہاء کرام مختلف گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں جو یہ تفصیل بیان فرماتے ہیں کہ اگر کرنے والے نے اس کو جائز یا مباح سمجھا تو کافر ہو جائے گا ورنہ نہیں، علامہ ابن تیمیہ نے اس باب میں اس تفصیل کی سختی سے تردید کی اور اس کو جہمیہ کا مذہب قرار دیا۔

اس قاعدے کے مطابق زیر بحث مسئلے کا حکم بھی واضح ہے کہ چونکہ قرآن کریم میں شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کو کافر فرمایا گیا ہے، اس لئے جو بھی شخص ان موجودہ خلافِ اسلام قوانین کے بنیاد پر فیصلہ کرے گا، وہ ہر حال میں کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

علامہ ابن تیمیہ کے اس مؤقف کو دور حاضر کے "سلفیہ" کہلانے والے اکثر حضرات نے اپنایا اور اسی کو بنیاد بنا کر دور حاضر میں اس جماعت کے کئی نامور علماء ور ہنماء اس بات کے قائل رہے ہیں کہ جو بھی شخص ان غیر شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرے وہ کافر ہے، شریعت کے خلاف ان قوانین کو بنانے والی پارلیمنٹ اور نافذ کرنے والی تمام قوتوں

میں جرات وصفائی وغیرہ کچھ عناصر ایسے تھے جن کی وجہ سے بسا اوقات ان کی عبارات سے ایک ہی مسئلہ میں دو مختلف ومتضاد باتوں پر استدلال کیا جاسکتا ہے، زیر بحث مسئلہ بھی ایسا ہی ہے، "الصارم المسلول" کی عبارت جو ابھی ذکر کی گئی ہے ان سے واضح ہوتا ہے کہ چونکہ ایمان کے مفہوم میں اعمال بھی داخل ہیں اس لئے بعض اعمال کی وجہ سے انسان کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے گو تصدیق بالقلب بر قرار بھی رہے، لیکن "منهاج السنة" وغیرہ کتابوں کی بعض عبارات سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دین اسلام پر عمل پیرا ہونے کا التزام کرے تو اگرچہ اس کے بعد وہ اتباع ہویٰ وغیرہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے علاوہ کوئی فیصلہ مان لے تو گناہ گار وعاصی شمار ہو گا، کافر نہیں ہو گا۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ کی عبارات کی بھی یہی صورت حال ہے۔

کا بھی ان حضرات کے نزدیک یہی حکم ہے۔

اس مؤقف کا نتیجہ

اس مؤقف کے اپنانے والے حضرات اس مسئلہ میں کوئی تفصیل نہیں کرتے کہ فیصلہ کرنے والے یا خلاف شرع قانون بنانے والے اس کو جائز سمجھتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ اس تفصیل میں پڑے بغیر خود خلاف شرع قانون بنانا ہی ان حضرات کے نزدیک کفر ہے، اگرچہ بنانے والے صوم وصلاۃ کے پابند ہوں اور توحید ورسالت کا اقرار کرتے ہوں۔

وقتی اور دائمی طور پر فیصلہ کرنے کا فرق

بعض اہلِ علم یہاں یہ تفصیل کرتے ہیں کہ شریعت مطہرہ میں جن واجبات و فرائض کا اُمت کو مکلف بنایا گیا ہے، ان کو چھوڑنے کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ ہے کہ عملی کوتاہی، سستی وغیرہ کی وجہ سے کبھی اس فریضہ پر عمل نہ ہو جائے۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ سرے ہی اس جنسِ حکم ہی کو چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت تو معصیت کی ہے جبکہ دوسری صورت یعنی جنسِ مامور بہ کو چھوڑنا کفر ہے۔ شیخ محمد بن حجر القرنی نے مکہ مکرمہ کے جامعہ اُم القریٰ میں اس موضوع پر ماجستیر کا مقالہ لکھا ہے، اس میں اُنہوں نے "اہل سنت" کا یہی مؤقف نقل فرمایا ہے اور اس کے خلاف خوارج ومرجئہ کا مؤقف نقل کر کے اس کی تردید فرمائی، چنانچہ وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> والّذي يهمّنا هنا هو الفرق بين الأمرين مِن جهة الكفر وعدمه، فإنّ اهل السنّة يقولون إنّ ترك جنس المأمور به كفر بخلاف فعل المحظور فلا يكفَر فاعلُه إلّا بجحود أو استحلال.

"یہاں قابل توجہ بات تکفیر اور عدم تکفیر کا معیاری فرق واضح کرنا ہے، وہ یہ ہے

کہ اہل سنت کے نزدیک مأمور بہ کو سرے سے چھوڑنا کفر ہے، البتہ کسی گناہ کے کام کا انکار یا اسے حلال سمجھے بغیر محض وقتی طور پر کرنا کفر نہیں۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ سلف صالحین نے استحلال کے بغیر محض گناہ کرنے کی وجہ سے کسی کی تکفیر کرنے سے جو احتراز واحتیاط کرنے کا مؤقف اپنایا ہیں وہ اسی صورت میں ہے جبکہ محض وقتی طور پر کوئی گناہ کا ارتکاب کرے اور اس میں ایمان سے متضاد کوئی بات نہ پائی جائے، اگر گناہ کی شکل یہ ہو کہ جنس حکم ہی کو چھوڑا جائے (یا کسی گناہ کو مستقل معمول کا درجہ دیا جائے) تو وہاں احتیاط کرنا ضروری ہے نہ ہی وہاں تکفیر کے لئے استحلال یا انکار کے قید لگانے کی ضرورت ہے بلکہ ایسا کرنا بہر حال موجب کفر ہے۔ فرماتے ہیں:

وهو المقصود بقولهم :"لا نكفّر أحدا مِن أهل القبلة بكلّ ذنب مالمْ يستحله"فشرط الاستحلال والجحود هو فيما يتعلّق بفعل المحظور أو ترك آحاد المأمور لا جنسه مالمْ يتضمّن ذلك الآحاد ما يضادّ الإيمان.

"اہل سنت کے قول کہ "ہم ہر گناہ پر اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے الّا یہ کہ اسے حلال سمجھے "اس میں تکفیر کے لیے استحلال یا انکار کی شرط وقتی طور پر کسی گناہ کے ارتکاب یا کوئی ایک حکم چھوڑنا کے بارے میں ہے، نہ کہ مکمل طور پر کوئی حکم شرعی کا ترک کرنا، (کیونکہ وہ استحلال اور انکار کے بغیر بھی کفر ہے) تاہم اگر انفرادی گناہ بھی ایمان کے منافی کسی بات پر مشتمل ہو۔ (تو اسکی وجہ سے بھی تکفیر ہو سکتی ہے۔)"

اس کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے خلاف کسی قانون و دستور پر فیصلہ کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ کسی خاص قضیہ میں خلاف شریعت فیصلہ

کرے، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسا کرنا کفر نہیں ہے الا یہ کہ اصل حکم شرعی کا انکار (واستھزاء) کرے یا اس طرح خلاف شریعت فیصلہ کرنے کو جائز سمجھے یعنیٰ استحلال واستخفاف وغیرہ قیودات کے بغیر ایسا کرنا بذاتِ خود کفر نہیں ہے۔ دوسری صورت اس کی یہ ہے کہ خلاف شریعت کسی دستور وغیرہ کو مستقل ودائمی قانون وفیصل کی حیثیت دیدی جائے تو یہ صورت بذات خود موجب کفر ہے چاہے اس میں استحلال واستخفاف وغیرہ مفاسد ظاہر نہ بھی ہوں۔[۱]

ایک جگہ یہ بھی صراحت فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں جو "تحكيم بغير ما أنزل الله " کرنے والوں کو کافر قرار دیا گیا ہے اور بہت سے مفسرین نے اس کی تفسیر میں

---

[۱]التشريع الوضعي في ضوء العقيدة الإسلامية،ص ٣٣٥. وما بعده.

یاد رہے کہ ہمارے نزدیک نظریاتی واعتقادی لحاظ سے اس فرق کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے کیونکہ ایمان در حقیقت تصدیق بالقلب کا نام ہے اگر تصدیق بالقلب ہے تو ایمان ہے ورنہ نہیں، اور ظاہر ہے کہ محض کسی عملی کوتاہی ومعصیت کی وجہ سے تصدیق مکمل طور پر زائل نہیں ہوتی، چاہے معصیت کا ارتکاب ایک بار ہو یا بار بار اس طرح جسارت کی جائے۔، خطیب شربینی فرماتے ہیں:

"لأن الإصرار كبيرة على الأصح. وقيل: ليس بكبيرة كما أن الكبيرة لا تصير بالمواظبة كفرا." (مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج ،كتاب الشهادات، ج٦ص ٣٤٦).

ترجمہ:"صغیرہ گناہ پر اصرار کرنا اصح قول کے مطابق کبیرہ ہے بعض کے نزدیک کبیرہ نہیں ہے جیسا کہ کبیرہ پر اصرار کرنا کفر نہیں ہوتا۔"

یہ الگ بات ہے کہ اجتماعی طور پر اور بار بار جب کسی گناہ کا ارتکاب کیا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کے گناہ ہونے کا خیال دل سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے خصوصاً جب کوئی گناہ مستقل طور پر معمول کا ایسا حصہ بن جائے کہ اس کا مقابل شرعی حکم عام لوگوں کے ذہنوں سے اوجھل رہے، اسی طرح جب اجتماعی طور پر کسی فریضہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور نسل در نسل یہی معمول برقرار رہتا ہے تو اس کے بعد اس کے فرض ولازم ہونے کا تصور بھی ذہنوں میں باقی نہیں رہ پاتا، اس لئے پھر ایسے اعمال میں استحلال، استہزاءوانکار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ موجبِ کفر ہو سکتا ہے۔

فرمایا کہ یہ یہودیوں کے متعلق ہے، تو خود یہودیوں کے کافر ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم و قانون کا انکار کیا، ایسا بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے علاوہ کسی قانون پر فیصلہ کرنے کو اُنہوں نے حلال سمجھا (یعنیٰ جحود و استحلال ان کے کفر کی وجہ نہیں ہے) نہ ہی ان کو اس لئے کافر قرار دیا گیا کہ اُنہوں نے اپنے خود ساختہ قانون کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ بلکہ خود ان کے کفر کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک ایسے اقدام پر مصر رہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اعراض و جحود پر دلالت کرتا تھا اور وہ "اقدام" یہی ہے کہ اُنہوں نے اپنے خود ساختہ دستور و قانون کو دائمی قانون کا درجہ دیا جبکہ ان کو معلوم تھا کہ ہمارا یہ وضعی دستور اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے۔[۱]

اہل سنت والجماعت کا مؤقف

اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان کی حقیقت باب اوّل میں تفصیل سے گزر چکی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ایمان در حقیقت "تصدیق بالقلب" ہی کا نام ہے، اعمال کی اپنی اہمیت بالکل بجا اور مسلم ہے لیکن وہ ایمان کے اس حد تک ضروری اجزاء نہیں ہیں جن کے محض چھوڑنے کی وجہ سے کسی کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا سکے۔

لہٰذا کسی نیک عمل یا فرض واجب کو چھوڑنے کی وجہ سے کسی شخص کو کافر قرار دینا درست نہیں بلکہ جیسا کہ باب چہارم میں تکفیر کے متعلق ضابطہ تحریر کیا گیا، اعمال کی وجہ سے تکفیر کی دو ہی صورتیں ہیں:

الف: کسی قطعی حرام عمل کا ارتکاب استحلال، استخفاف یا شرعی حکم کے استہزاء

[۱] کتابِ مذکور، ص ۳۰۵

کے طور پر کیا جائے۔

ب: کوئی عمل ایسا ہو جس میں ایمان کے جو چار لوازم باب چہارم میں ذکر ہوئے، ان میں سے کوئی ایک لازم یقینی طور پر فوت ہو جائے۔

ان دونوں صورتوں میں ہی کسی عمل کو بنیاد بنا کر کفر کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے اس مؤقف کا خلاصہ یہ ہوا کہ خلافِ شرع قوانین پر فیصلہ کرنا بالکل ناجائز اور حرام بلکہ کفریہ عمل ہے لیکن محض اس عمل کی بنیاد پر کسی کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا درست نہیں، بلکہ اگر مندرجہ بالا دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے ساتھ اس طرح فیصلہ کیا جائے تب ہی اس کو کفر کہا جا سکتا ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

مَن ارتكب كبيرة لكسل أو حمية أو أبقة أو غلبة شهوة أو رجاء عفو كان التصديقُ معه باقيا، وما دام التصديقُ موجودا كان التكذيبُ معدوما ضرورة لمضادة بينهما فبطل القول بكفره والتكذيب معدوم أو بزوال الإيمان والتصديق موجود أو ثبوت النفاق والتصديق في القلب باق. [۱]

"سستی، غیرت، غلبہ شہوت یا معافی کی امید کی وجہ سے گناہ کے ارتکاب کے باوجود تصدیق برقرار رہتی ہے، چنانچہ جب تصدیق برقرار ہے تو تکذیب ضرور معدوم ہوگی، کیونکہ ان دونوں کے درمیان تضاد ہے، لہٰذا تکذیب کے نہ

[۱] الاعتماد في الاعتقاد، ص: ٤٠٦.

ہوتے ہوئے بھی اسے کافر قرار دینا یا تصدیق کی موجودگی میں ایمان کے زوال کا فیصلہ کرنا غلط ہے اسی طرح دل میں تصدیق ہونے کے باوجود نفاق کا فیصلہ کرنا بھی درست نہیں۔"

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ کئی جگہ اس کی صراحت فرمائی ہے کہ اسلامی قانون چھوڑ کر محض غیر اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا کفر نہیں ہے جبکہ اس کی وجہ سے اعتقاد میں خلل نہ آئے اور کرنے والا اپنے اس اقدام کو معصیت سمجھتا رہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

والصحيح أن الحكم بغير ما أنزل الله يتناول الكفرين، الأصغر والأكبر بحسب حال الحاكم، فإنه إن اعتقد وجوب الحكم بما أنزل الله في هذه الواقعة، وعدل عنه عصيانا، مع اعترافه بأنه مستحق للعقوبة، فهذا كفر أصغر، وإن اعتقد أنه غير واجب، وأنه مخير فيه، مع تيقنه أنه حكم الله، فهذا كفر أكبر، وإن جهله وأخطأه فهذا مخطئ، له حكم المخطئين- [۱]

"اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے خلاف فیصلہ کرنا کفر ہے خواہ کفر اکبر (حقیقی) ہو یا اصغر (حکمی) یہ فیصلہ کرنے والے کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اگر وہ اس مسئلہ میں خدائی قانون پر فیصلہ کرنے کو لازم سمجھے اور نافرنی کی طور پر اس سے اعراض کر کے اپنے آپ کو دل ہی دل میں قصوروار اور سزاوار ٹھہرائے تو یہ کفر اصغر ہے، البتہ باوجود اس یقین کے کہ وہ اسے اللہ کا فرمان سمجھتا جانتا ہے

[۱]مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين، قُبيل فصل الكفر الأكبر، ج١ص٣٤٦.

پھر بھی خدائی قانون پر فیصلہ کرنا ضروری نہ سمجھے، بلکہ اس بارے میں خود کو
بااختیار سمجھے تو یہ کفر اکبر ہے، البتہ جب حکم خداوندی کا علم نہ ہو تو وہ خطاکار
کہلائے گا جس پر خطاکاروں جیسے احکام جاری ہونگے۔"

وضعی قوانین اور تکفیر کی متنوع صورتیں

خود ساختہ قوانین کی وجہ سے تکفیر کی صورتوں پر اگر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ "حکم بغیر ما انزل اللہ" گو فسق و معصیت ہے لیکن بہر صورت اس کو کفر قرار دینا درست نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون کے بالمقابل کوئی قانون بنانا بھی بلاشبہ سخت گناہ کی بات ہے جو اپنے تئیں کئی گناہوں اور خطرات رکھتا ہے لیکن بایں ہمہ محض یہ اقدام کرنا بذات خود کفر نہیں ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں درج ذیل صورتیں ایسی ہیں جو موجبِ کفر ہیں:

ا۔ شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کو ضروری نہ سمجھنا۔

یعنی اگر کوئی شخص شریعت کے احکام کے مطابق فیصلے کرنے کو ضروری ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس باب میں آزادی کا قائل ہو کہ جس ملک کا جو بھی قانون ہو، اسی کے مطابق فیصلے کرنے کو ضروری سمجھے، شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کو بالکل ضروری نہ سمجھے، تو یہ کفر ہے، کیونکہ قرآن وسنت کے کئی قطعی نصوص میں اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

امام جصاص رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إن كان المراد جحود حكم الله أو الحكم بغيره مع الإخبار بأنه حكم الله فهذا كفر يخرج عن الملة وفاعله مرتد إن كان قبل ذلك مسلما.[۱]

---

[۱] أحكام القرآن للجصاص ،سورة المائدة،ج۲ ص۵٤۸ . ط العلمية.

"اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار مقصود ہو یا دوسرے قانون پر فیصلہ کر کے اس کو اللہ کا قانون سمجھتا اور بتاتا ہو تو یہ کفر ہے جو دین اسلام سے نکلنے کا سبب ہے اور ایسا کرنے والا اگر پہلے مسلمان تھا تو اب مرتد ہو جائے گا۔"

۲۔ موجودہ قوانین میں سے غیر شرعی قوانین کو شرعی اوراسلامی قوانین واحکام کے مقابلے میں ترجیح دینا۔

دومتضاداشیاء میں سے کسی کو ایک ترجیح دینایعنی دوسرے کے مقابلے میں اس کو درست یا زیادہ مناسب تصور کرنا درحقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ جس چیز پر ترجیح دی جاتی ہے، اس کے ساتھ رضاومحبت کا تعلق نہیں، جبکہ رضاومحبت ایمان کے ان لوازم میں سے ایک ہے جن کے فوت ہونے سے ایمان فوت ہو جاتا ہے۔

"مجمع الأنهر "میں ہے:

ويكفر بقوله قصعة ثريد خير من العلم وبقوله الجهل خير من العلم وبقوله الجاهل خير من العالم وبقوله زاهد جاهل خير من عالم فاسق وبقوله " فعل دانشمندان همانست فعل كافران " ومن ذكر عنده الشرع فتجشأ فقال هذا الشرع كفر. ويكفر بقوله لا توحيد في علم الشريعة أو علم الحقيقة أعلى من علم الشريعة أو لا حقيقة علم الشريعة أو علم الحقيقة أحب إلي من الشريعة ويريد بالحقيقة علم الفلاسفة- [۱]

---

[۱]مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر،باب المرتد،ج۱ص۶۹٤.

"ایک پلیٹ ثرید علم سے بہتر ہے، یا جہالت علم سے، یا عالم سے جاہل بہتر ہے، یا جاہل زید فاسق عالم سے بہتر ہے، ان تمام باتوں سے آدمی کافر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ عقلمندی کا کام یہی کافروں والا کام ہے، اسی طرح کسی کے سامنے شریعت کی بات کہنے پر ڈکار لیتے ہوئے کہے کہ یہ شریعت ہے تو کافر ہو گا یا یوں کہے کہ علم شریعت میں توحید کہاں ہے؟ یا علم حقیقت علم شریعت سے بہتر ہے، یا علم شریعت میں حقیقت کہاں ہے؟ یا علم حقیقیت علم شریعت سے زیادہ محبوب ہے جبکہ علم حقیقت سے مراد فلاسفہ کا علم ہو تو ان سب باتوں سے کافر ہوتا ہے۔"

علامہ عبد القادر عودہ شہید رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

لا خلاف بين الفقهاء والعلماء فى أن كل تشريع مخالف للشريعة الإسلامية باطل لا تجب له طاعة وأن كل ما يخالف الشريعة محرم على المسلمين ولو أمرت به أو أباحته السلطة الحاكمة أيًا كانت ومن المتفق عليه أم من يستحدث من المسلمين أحكامًا غير ما أنزل الله ويترك بالحكم بها كل أو بعض ما أنزل الله من غير تأويل يعتقد صحته فإنه يصدق عليهم ما وصفهم به الله تعالى من الكفر والظلم والفسق كل بحسب حالته فمن أعرض عن الحكم بحد السرقة أو القذف أو الزنا لأنه يفضل غيره من أوضاع البشر عليه فهو كافر قطعًا ومن لم يحكم به لعلة أخرى غير الجحود والنكران فهو ظالم --ومن المتفق عليه أن من رد شيئًا من أوامر الله أو أوامر رسوله فهو خارج عن الإسلام

سواء رده من جهة الشك أو من جهة ترك القبول أو الامتناع عن التسليم- [۱]

"علماء کرام اور فقہاء عظام کے درمیان یہ بات اتفاقی ہے کہ شریعت اسلامیہ کے خلاف ہر طرح کا قانون باطل ہے، جس کی اطاعت لازم (جائز) نہیں، شریعت مطہرہ کے خلاف کوئی بھی حکومت کسی طرح حکم جاری کریں مسلمانوں پر اس کی اطاعت حرام ہے، چنانچہ یہ متفقہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف مسلمان جو قوانین بناتے ہیں اوراس کی وجہ سے بغیر کسی صحیح تاویل کے شرعی قوانین چھوڑتے ہیں توان لوگوں کے بارے میں خدا تعالیٰ کا بیان فرمودہ اوصاف کفر، ظلم اور فسق حسب حال بالکل چسپاں ہوتی ہیں، لہٰذا جو لوگ شرعی حدود مثلاً حدِ سرقہ قذف یا حدِ زنا سے روگردانی کریں کیونکہ اس کے مقابلے میں دیگر خود ساختہ قوانین کو بہتر جانے وہ بلاشبہ کافر ہے اور جو انکار یا حقیر سمجھے بغیر کسی اوروجہ سے اسے نافذ نہ کریں وہ ظالم اور گنہگار ہیں، چنانچہ اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کی کسی بات کو ٹھکرائے خواہ شک کی بنیاد پر یا اسے قبول نہ ہو یا اسے تسلیم نہ کرے تو وہ بلاشبہ کافر ہے۔"

۳۔ شرعی قانون واحکام کو مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا موجب سمجھنا۔

اگر کوئی شخص یہ نظریہ رکھے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کی پستی، ذلت وغربت

[۱]التشريع الجنائي الإسلامي مقارنا بالقانون الوضعي، الكتاب السابع: الردةج۲ ص ۷۰۹.

اور شکست وریخت کی اصل بنیاد دینی احکام پر عمل پیرا ہونا ہے تو ایسا شخص یقیناً کافر ہے، اور کفر کی وجہ یہی ہے کہ ایسا کہنا دین واسلام کی توہین ہے جو کہ تعظیم کی ضد ہے اور پہلے تحریر کیا جا چکا کہ تعظیم واحترام ایمان کے لوازم میں سے ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مسئلہ: آپس میں جب جھگڑا فساد ہووے تو واجب ہے کہ شرع کی طرف سے رجوع کریں اور شرع جس طور پر حکم کرے، اگرچہ طبیعت کے خلاف ہو تو بھی واجب ہے کہ اس حکم کو خوشی سے قبول کریں کیونکہ شرعی حکم کو بُرا جاننا کفر ہے اور اس میں انکار شرع لازم آتا ہے۔" [۱]

۴۔ غیر شرعی قوانین پر اس نظریہ کے ساتھ فیصلے کرنا کہ یہ کوئی ناجائز یا گناہ کا کام ہے ہی نہیں۔

یہ دراصل "استحلال" کا مفہوم ہے جس کی تفصیل چوتھے باب میں وضاحت کے ساتھ ذکر ہو چکی ہے، یعنی غیر شرعی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا ایک ناجائز اور گناہ کبیرہ ہے، اس کو ناجائز یا گناہ نہ سمجھنا بلکہ مباح خیال کرنا ان نصوص کی تردید ہے جس میں اس کو لازم قرار دیا گیا۔

۵۔ شرعی احکام و قوانین کا مذاق اُڑانا۔

حدود و تعزیرات کے متعلق آج کل بہت سے لوگوں کے بیانات اسی استخفاف پر مشتمل ہوتے ہیں، حالانکہ یہ بلاشبہ کفر ہے مثلاً کوئی کہے کہ اسلام میں جو حدود و تعزیرات

---

[۱] ما لا بدّ منه، ص۹۷.

کانظام ہے یہ جنگل کا قانون ہے، یاکوئی یہ کہے کہ اس کو انسانوں کے نہیں، جانوروں کے معاشرے میں نافذ کرلیناچاہئے وغیرہ۔ ایسا کہنادر حقیقت اِن شرعی احکام کا مذاق اُڑانا ہے جویقیناً کفر ہے، پہلے یہ ذکر کیاجاچکا کہ کسی ایک ثابت شدہ شرعی کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے۔

۶۔ اسلامی قانون اور دینی احکام کو اس دور میں ناقابل عمل یاناقابل نفاذ سمجھنا۔

مثلاً کوئی اسلامی احکام کے بارے میں یہ نظریہ رکھے کہ یہ دقیانوسی دور کے مسائل ہیں، ترقی کے اس دور میں اس کو نافذ کرنا حماقت ہے، یاکوئی یہ کہے کہ یہ احکام عرب کے جاہلی معاشرے کے لئے توکافی تھے لیکن سائنس وٹیکنالوجی کے اس دور میں اس کو نافذ نہیں کیا جاسکتا، یاکوئی یہ اعتقاد رکھے کہ دین اسلام توایک خاص معاشرے یاملک کا دین تھاجو اسی کے تقاضاکے مطابق تھا، گلوبل ویلیج کے اس دور میں یہ دین قابل نفاذ نہیں ہے اب تو کوئی دوسراعالمی دین چاہئے۔

البتہ اگر دین اسلام اور اس کے احکام ومسائل کی توہین واستخفاف مقصود نہ ہو، نہ ہی دین کو ناقابل نفاذ یاناقابل عمل سمجھنا مد نظر ہو بلکہ صحیح اعتقاد کے ہوتے ہوئے محض اپنی عملی کوتاہی کی وجہ سے کوئی ایساجملہ کہے تواس کا یہ حکم نہیں ہے۔

"مجمع الانہر" میں ہے:

ومن قيل له قم اذهب إلى مجلس العلم فقال من يقدر على الإتيان بما يقولون أو قال مالي ومجلس العلم كفر أو قال من يقدر على أن يعمل بما أمر العلماء كفر كما في أكثر الكتب لكن لو سمع في مجلس العلم ما لا يتيسر على كل أحد من كثرة النوافل والرياضات والمجاهدات التي تحكى عن الأنبياء وعن بعض السلف الصالح فقال تعجبا وتعظيما لشأنه مقرا بعجزه عن

مثله ونقصانه لا على سبيل الاستخفاف والإنكار ينبغي أن لا يكفر- [۱]

"اگر کسی سے علم دین کی مجلس میں شرکت کرنے کے لیے کہا جائے، اس کے جواب میں وہ کہے کہ ان کے کہے پر عمل کرنا کس کے بس میں ہے؟ یا کہے کہ میرا ان سے کیا واسطہ، یا کہے کہ علماء کی باتوں پر عمل کرنا کس کی بس میں ہے؟ تو ان سب باتوں کی وجہ سے کافر ہو گا، البتہ اگر علم کی مجلس میں ایسی کوئی بات سنے جس کا کرنا ہر کسی کی بس میں نہیں مثلا بہت زیادہ نوافل ریاضات اور مجاہدات جو انبیاء کرام علیہم السلام یا سلف صالحین سے منقول ہیں اس کے بارے میں تعجب یا تعظیما اس طرح کہے اور استہزاء کیے بغیر محض اپنی کمزوری بیان کرنا مقصود ہو تو کافر نہ ہو گا۔"

"فتاویٰ ہندیہ" میں ہے:

رجل رجع عن مجلس العلم فقال له رجل آخر: ازکنشت آمدی يكفر وكذا لو قال: مرابا مجلس علم جكار، أو قال: من يقدر على أداء ما يقولون يكفر كذا في الخلاصة- [۲]

"کسی بندہ کو علم کی مجلس سے واپسی پر دوسرا کہے کہ کنیسہ سے آئے ہو، یا کہے میرا علم کی مجلس میں کیا کام؟ تو اس سے کافر ہو گا یا کوئی یہ کہے کہ ان کے کہنے

[۱]مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر،باب المرتد،ج۱ص٦٩٦.

[۲]الفتاوى الهندية،الباب التاسع في أحكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر، ج۲ ص۲۷۰.

پر عمل کس کے بس میں ہے؟تب بھی کافر ہو گا۔"

۷۔ قرآن وسنت کے علاوہ کسی طاقت مثلاً عوام، پارلیمنٹ وغیرہ کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرح بذات خود لازم الاطاعت سمجھنا، کہ وہ جو کچھ کہے اس کی تعمیل کرنے کو ضروری تصور کیا جائے خواہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہو یا مخالف، دین وشریعت سے قطع نظر خود اس کی بات کو اللہ ورسول کی حکم کی طرح ضروری خیال کرنا، یہ شرک وکفر ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لله أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ- [يوسف: ٤٠]

"تم اس کے سوا کچھ نہیں پوجتے مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے مقرر کرلیے ہیں اللہ نے ان کے متعلق کوئی سند نہیں اُتاری حکومت سوا اللہ کے کسی کی نہیں ہے اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

قُلِ اللهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا- [الكهف: ٢٦]

"کہہ دو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کتنی مدت رہے تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے کیا عجیب دیکھتا اور سنتا ہے ان کا اللہ کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں اور نہ ہی وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔"

مفتی محمد ابن ابراہیم کی تحقیق

اس تحریر کے تیار ہو جانے کے ایک عرصہ بعد سعودی عرب کے سابق مفتی محمد ابن ابراہیم آل الشیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس موضوع پر ایک رسالہ پڑھنے کی توفیق ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ تحکیم بغیر ما انزل اللہ کبھی تو کفر اعتقادی کا موجب بن جاتا ہے اور کبھی کفر عملی کا سبب ہو جاتا ہے، جس کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ درج ذیل چھ (۶) صورتوں میں کفر اعتقادی کا ذریعہ بن جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان دائرہ اسلام سے نکل کر کافر بن جاتا ہے:

۱۔ جحود: اس بات کا انکار کرنا کہ تحکیم بما انزل اللہ ضروری ہے۔

۲۔ کسی وضعی قانون کو اللہ تعالیٰ کے قانون سے زیادہ اچھا، کامل وشامل سمجھنا۔

۳۔ وضعی قانون کو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مماثل یعنی اس جیسا حق سمجھنا۔

۴۔ یہ سمجھنا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے قانون پر فیصلہ کرنا جائز ہے یوں ہی غیر اللہ کے قانون پر بھی جائز ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کے قانون سے ضد وعناد کے جذبہ سے اس کے مقابل کوئی متوازی قانون تشکیل دینا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کے قانون سے اعراض کر کے کوئی اور قانون اپنانا جس طرح بعض قبائل میں رواج ہے۔ ان چھ صورتوں میں تحکیم بغیر ما انزل اللہ کفر اعتقادی کا موجب ہے جس کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

۷۔ ساتویں صورت یہ ہے کہ ان باتوں سے ہٹ کر محض کسی دنیوی حرص و خواہش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف کوئی فیصلہ کرے، حضرت

شیخ نے اس کو بڑی معصیت، زنا، شراب پینے، چوری کرنے اور جھوٹی قسم کھانے جیسے کبیرہ گناہوں سے بڑھ کر کبیرہ گناہ شمار فرمایا لیکن ساتھ یہ وضاحت بھی فرمائی کہ اس کی وجہ سے کوئی شخص دینِ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔[۱]

اس تحقیق سے بھی اسی مؤقف کی تائید ہوتی ہے جو "اہل سنت والجماعت" کے حوالہ سے پہلے درج کی گئی ہے کہ خود یہ عمل فی نفسہ کفر نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جائے، البتہ اگر اس کے ساتھ کوئی موجبِ کفر اقدام پایا جائے تو اس کو سببِ کفر قرار دیا جائے گا۔

****

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: مفتی محمد ابن ابراہیم رحمہ اللہ کا رسالہ "تحکیم القوانین"۔

المصادر والمراجع

۱. احتساب قادیانیت. عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، ملتان.

٢. إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام. مطبعة السنة المحمدية. الطبعة: بدون طبعة وبدون تاريخ

٣. أحكام القرآن للجصاص. دار الكتب العلمية بيروت – لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤١٥هـ/ ١٩٩٤م

٤. الإحكام في أصول الأحكام للآمدي. الناشر: المكتب الإسلامي، بيروت- دمشق- لبنان

٥. إحياء علوم الدين. الناشر: دار المعرفة –بيروت.

٦. الاختيار لتعليل المختار. الناشر: مطبعة الحلبي - القاهرة تاريخ النشر: ١٣٥٦ هـ- ١٩٣٧ م

٧. اشارات المرام. زمزم پبلشرز، کراچی-

٨. الأشباه والنظائر لابن نجيم. دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤١٩ هـ- ١٩٩٩ م.

٩. الأشباه والنظائر مع غمز عيون البصائر. الناشر: دار الكتب

العلمية. الطبعة: الأولى، ١٤٠٥هـ- ١٩٨٥م.

١٠. أصول البزدوي مع شرحه كشف الأسرار. الناشر: دار الكتاب الإسلامي.

١١. أصول الدين للبزدوي.الناشر المكتبة الأزهرية للتراث.

١٢. أصول السرخسي. الناشر: دار المعرفة –بيروت.

١٣. أصول السنة لابن أبي زمنين. مكتبة الغرباء الأثرية، المدينة النبوية - المملكة العربية السعودية. الطبعة: الأولى، ١٤١٥هـ

١٤. أصول الشاشي. الناشر: دار الكتاب العربي – بيروت.

١٥. الاعتصام للشاطبي. دار ابن عفان، السعودية. الطبعة: الأولى، ١٤١٢هـ- ١٩٩٢م

١٦. الاعتماد في الاعتقاد. المكتبة الأزهرية للتراث.

١٧. الإعلام بقواطع الإسلام . الناشر: دار التقوى/ سوريا. الطبعة: الأولى، ١٤٢٨هـ/ ٢٠٠٨م.

١٨. الاقتصادفي الاعتقاد. دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤٢٤ هـ- ٢٠٠٤ م.

١٩. اكفار الملحدين فى ضروريات الدين. المجلس

العلمي –باكستان. الطبعة: الثالثة – ١٤٢٤ هـ– ٢٠٠٤

٢٠. انيس الفقهاء في تعريفات الألفاظ المتداولة بين الفقهاء. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: ٢٠٠٤م-١٤٢٤هـ.

٢١. إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات إلى المذهب الحق. دار الكتب العلمية –بيروت. الطبعة: الثانية، ١٩٨٧م

٢٢. الإيمان للقاسم بن سلام. المكتب الإسلامي.الطبعة: الثانية، ١٤٠٣هـ– ١٩٨٣م.

٢٣. البحر الرائق مع منحة الخالق. دار الكتاب الإسلامي. الطبعة: الثانية – بدون تاريخ

٢٤. بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: الثانية، ١٤٠٦هـ– ١٩٨٦م.١

٢٥. بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية. مطبعة الحلبي. الطبعة: بدون طبعة، ١٣٤٨هـ.

٢٦. بیان القرآن. ادرہ تالیفات اشرفیہ، ملتان.

٢٧. تاج العروس. الناشر: دار الهداية.

٢٨. تالیفات رشیدیہ. ادارہ اسلامیات، لاہور.

٢٩. تأويلات أهل السنة . دار الكتب العلمية – بيروت،

لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤٢٦ هـ- ٢٠٠٥ م

٣٠. رسالة تحكيم القوانين للشيخ المفتي محمد بن إبراهيم أل الشيخ.

٣١. التشريع الجنائى الإسلامى مقارنا بالقانون الوضعى. دار الكاتب العربي، بيروت.

٣٢. التعريفات. الناشر: دار الكتب العلمية بيروت – لبنان. الطبعة: الأولى ١٤٠٣هـ-١٩٨٣م

٣٣. التقرير والتحبير علي تحرير الكمال بن الهمام. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: الثانية، ١٤٠٣هـ- ١٩٨٣م.

٣٤. التكفير وضوابطه لإبراهيم بن عامر الراحيلي، دار الإمام أحمد.

٣٥. تمهيد أبي شكور السالمي. النورية الرضويه، لاهور.

٣٦. تمهيد الأوائل وتلخيص الدلائل. مؤسسة الكتب الثقافية –لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤٠٧هـ- ١٩٨٧م

٣٧. التمهيد لقواعد التوحيد. دار الطباعة المحمدية.

٣٨. التشريع الوضعي في ضوء العقيدة الإسلامية، للشيخ محمد بن حجر القرني.

٣٩. تهذيب شرح السنوسية. مكتبة المعارف.

٤٠. جامع البيان ت شاكر . مؤسسة الرسالة. الطبعة:

الأولى، ١٤٢٠ هـ- ٢٠٠٠ م

٤١. جامع العلوم والحكم. الناشر: مؤسسة الرسالة – بيروت. الطبعة: السابعة، ١٤٢٢هـ- ٢٠٠١م

٤٢. جامع الفصولين. اسلامی کتب خانه. بنوری تاون.

٤٣. الجيش والكمين لقتال من كفرعامة المسلمين، مطبوعة دار الصحابة للتراث

٤٤. خيالي على شرح العقائد.

٤٥. الدر المختار مع حاشية ابن عابدين. مكتبه ايچ ايم سعيد كمپني پاكستان.

٤٦. الدر المنثور في التفسير بالمأثور. الناشر: دار الفكر – بيروت.

٤٧. درر الحكام شرح غرر الأحكام. الناشر: دار إحياء الكتب العربية.

٤٨. روضة الطالبين وعمدة المفتين. الناشر: المكتب الإسلامي، بيروت- دمشق- عمان. الطبعة: الثالثة، ١٤١٢هـ- / ١٩٩١م.

٤٩. سنن ابن ماجه. دار الرسالة العالمية. الطبعة: الأولى، ١٤٣٠ هـ- ٢٠٠٩ م

٥٠. سنن أبي داود. المكتبة العصرية، صيدا –بيروت.

٥١. سنن الترمذي ت شاكر. شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي –مصر. الطبعة: الثانية، ١٣٩٥ هـ - ١٩٧٥ م

٥٢. السنن الكبرى للبيهقي. الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت –لبنات. الطبعة: الثالثة، ١٤٢٤ هـ - ٢٠٠٣ م.

٥٣. شرح الإمام على القارى على ألفاظ الكفر. دار الفضيلة للنشر والتوزيع؛ السعودية.

٥٤. شرح السنة للبربهاري.

٥٥. شرح السنة للمزني. مكتبة الغرباء الأثرية – السعودية. الطبعة: الأولى، ١٤١٥هـ- ١٩٩٥م

٥٦. شرح السير الكبير. الناشر: الشركة الشرقية للإعلانات. تاريخ النشر: ١٩٧١م.

٥٧. شرح العقائد العضديه بتحقيق نزار حمادي.

٥٨. شرح العقائد النسفية، مكتبة رحمانيه. لاهور.

٥٩. شرح الفقه الأكبر للعلامة ملا علي القاري، قديمي كتب خانه، كراچي.

٦٠. الشرح الكبير للشيخ الدردير مع حاشية الدسوقي. الناشر: دار الفكر.

٦١. شرح المقاصد في علم الكلام. لناشر دار المعارف النعمانية.سنة النشر ١٤٠١هـ- ١٩٨١م

٦٢. شرح المواقف.دار الكتب العلمية بيروت.

٦٣. الشريعة للآجري. دار الوطن - الرياض / السعودية. الطبعة: الثانية،١٤٢٠ هـ- ١٩٩٩

٦٤. الشفاء بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني دار الفكر الطباعة والنشر والتوزيع عام النشر: ١٤٠٩ هـ- ١٩٨٨ م

٦٥. الصارم المسلول على شاتم الرسول.الناشر: الحرس الوطني السعودي، المملكة العربية السعودية.

٦٦. الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية. الناشر: دار العلم للملايين –بيروت. الطبعة: الرابعة ١٤٠٧ هـ- ١٩٨٧ م.

٦٧. صحيح البخاري. دار طوق النجاة (مصورة عن السلطانية بإضافة ترقيم ترقيم محمد فؤاد عبد الباقي)الطبعة: الأولى، ١٤٢٢ه

٦٨. صحيح مسلم. دار إحياء التراث العربي –بيروت.

٦٩. طرح التثريب في شرح التقريب. الناشر: الطبعة المصرية القديمة .

٧٠. الطريقة المحمدية.مكتبة حقانيه پشاور.

۷۱. عقیدہ نزول مسیح.بیت العلم کراچی.

٧٢. عمدة القاري شرح صحيح البخاري. الناشر: دار إحياء التراث العربي –بيروت.

٧٣. العواصم والقواصم في الذب عن سنة أبي القاسم. الناشر: مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت. الطبعة: الثالثة، ١٤١٥ هـ- ١٩٩٤ م.

۷۴. غیر مسلم کے ساتھ مختلف نوعیت کے تعلقات-عبید الرحمن،مکتبہ رحمانیہ مردان

٧٥. ألفاظ الكفر، مخطوط.

٧٦. الفتاوى الحديثية. دار الفكر، بيروت.

٧٧. فتاوى السبكي. الناشر: دار المعارف.

٧٨. فتاوى اللجنة الدائمة. الناشر: رئاسة إدارة البحوث العلمية والإفتاء الإدارة العامة للطبع الرياض

٧٩. الفتاوى الهندية. دار الفكر.الطبعة: الثانية، ١٣١٠ هـ-١ الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، باب المصرف،ج٢ص ٣٥١.

٨٠. فتاوى حقانيه، مؤتمر المصنفين جامعة حقانية اكوره ختك.

٨١. فتاوى قاضيخان.

٨٢. الفتاوي البزازية علي هامش الهندية.مكتبه حقانيه پشاور.

٨٣. فتاوٰی رشیدیه(محقّق ومدلّل). اشاعت اكيدمي پشاور.

٨٤. فتاوي عزيزي؛ ايچ ايم سعيد كمپني. پاكستان.

٨٥. فتح الباري. الناشر: دار المعرفة –بيروت.

٨٦. فتح القدير للشوكاني. الناشر: دار ابن كثير، دار الكلم الطيب – دمشق، بيروت. الطبعة: الأولى – ١٤١٤ ه.

٨٧. فتح القدير. دار الفكر. الطبعة: بدون طبعة وبدون تاريخ

٨٨. الفتح المبين . دار المنهاج.سن١٤٢٨ه.

٨٩. فتح الملهم. دار إحياء التراث العربي، بيروت، سن ١٤٢٦ه.

٩٠. الفصل في الملل والأهواء والنحل. مكتبة الخانجي –القاهرة.

٩١. الفصول في الأصول. الناشر: وزارة الأوقاف الكويتية. الطبعة: الثانية، ١٤١٤ه- – ١٩٩٤م.

٩٢. الفقه الأبسط بتحقيق العلامة الكوثري ضمن كتابه" العقيدة وعلم الكلام"، مكتبة الأحرار، مردان.

٩٣. الفقه الأكبر بتحقيق الإمام الكوثري ضمن " العقيدة وعلم الكلام". مكتبة الأحرار، مردان.

٩٤. فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت.قديمي كتب خانه مقابل آرام باغ كراچي.

٩٥. فيصل التفرقة بين الإسلام والزندقة بتحقيق محمود بيجو.

٩٦. قواعد الأحكام في مصالح الأنام. مكتبة الكليات الأزهرية –القاهرة.

٩٧. الكليات،مؤسسة الرسالة –بيروت

٩٨. كتاب التوحيد. الناشر: دار الجامعات المصرية – الإسكندرية.

٩٩. كشاف اصطلاحات الفنون. الناشر: مكتبة لبنان ناشرون –بيروت. الطبعة: الأولى - ١٩٩٦م.

١٠٠. لوامع الأنوار البهية. مؤسسة الخافقين ومكتبتها – دمشق. الطبعة: الثانية - ١٤٠٢ هـ- ١٩٨٢ م

١٠١. ما لا بدّ منه(مترجَم اردو)، قاضي ثناء الله پاني پتّي رحمه الله.

١٠٢. متن الطحاوية. ا لمكتب الإسلامي –بيروت. الطبعة: الثانية، ١٤١٤ هـ

١٠٣. مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر. الناشر: دار إحياء التراث العربي.

١٠٤. مجمع الفقه الإسلامي.

١٠٥. المجموع شرح المهذب. الناشر: دار الفكر.

١٠٦. المحلى بالآثار. الناشر: دار الفكر –بيروت.

١٠٧. مختار الصحاح . الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت. الطبعة: الأولى، ١٤١٧هـ-١٩٩٦م

١٠٨. المخصص. الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت. الطبعة: الأولى، ١٤١٧هـ-١٩٩٦م.

١٠٩. مدارك التنزيل وحقائق التأويل. دار الكلم الطيب، بيروت. الطبعة: الأولى، ١٤١٩ هـ- ١٩٩٨ م

١١٠. المسامرة شرح المسايرة.دار الكتب العلمية، بيروت.

١١١. المستدرك على الصحيحين. الناشر: دار الكتب العلمية –بيروت. الطبعة: الأولى، ١٤١١ – ١٩٩٠

١١٢. المستصفى. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: الأولى، ١٤١٣هـ- ١٩٩٣م

١١٣. مسند أحمد. مؤسسة الرسالة.الطبعة: الأولى، ١٤٢١ هـ- ٢٠٠١ م.١ شرح مشكل الآثار. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. الناشر: مؤسسة الرسالة. الطبعة: الأولى – ١٤١٥

ه، ١٤٩٤ م

١١٤. مشكوة الأنوار في أصول المنار. مكتبه إسلاميه كوئته.

١١٥. مصنف عبد الرزاق الصنعاني.المجلس العلمي-الهند.

١١٦. معالم أصول الدين. دار الكتاب العربي –لبنان.

١١٧. معجم الفروق اللغوية للعسكري. الناشر: مؤسسة النشر الإسلامي التابعة لجماعة المدرسين ب-«قم»الطبعة: الأولى، ١٤١٢هـ.

١١٨. المعجم الكبير للطبراني. مكتبة ابن تيمية –القاهرة.

١١٩. المغنى لابن قدامة. مكتبة القاهرة. تاريخ النشر: ١٣٨٨هـ- ١٩٦٨م

١٢٠. مفاتيح الغيب. دار إحياء التراث العربي –بيروت. الطبعة: الثالثة - ١٤٢٠ ه

١٢١. المفردات في غريب القرآن. الناشر: دار القلم، الدار الشامية - دمشق بيروت. الطبعة: الأولى - ١٤١٢ ه.

١٢٢. مقالات الكوثرى. المكتبة الحقانيه، پشاور.

١٢٣. مقاييس اللغة، دار الفكرعام النشر: ١٣٩٩هـ - ١٩٧٩م.

١٢٤. المنثور في القواعد الفقهية. الناشر: وزارة الأوقاف

الكويتية. الطبعة: الثانية، ١٤٠٥هـ- ١٩٨٥م

١٢٥. منهاج السنة النبوية. جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية. الطبعة: الأولى، ١٤٠٦ هـ- ١٩٨٦ م

١٢٦. الموافقات. الناشر: دار ابن عفان. الطبعة: الطبعة الأولى ١٤١٧هـ/ ١٩٩٧م.

١٢٧. المواقف. الناشر: دار الجيل –بيروت. الطبعةالأولى، ١٩٩٧

١٢٨. مؤقف العقل والعلم والعالم من رب العلمين و عباده المرسلين. دار إحياء التراث العربي.

١٢٩. النبراس شرح شرح العقائد النسفية، مكتبة البشرى كراتشي.

١٣٠. نسمات الأسحار على إفاضة الأنوار. إدارة القران والعلوم الإسلامية، كراچي.

١٣١. نهاية الوصول في دراية الأصول.المكتبة التجارية بمكة المكرمة.

١٣٢. نور الأنوار،مكتبة البشرى.

١٣٣. نور العين فى إصلاح جامع الفصولين، مخطوطة بجامعة الملک سعود.

١٣٤. نيل الأوطار. دار الحديث، مصر. الطبعة: الأولى، ١٤١٣هـ- ١٩٩٣م

١٣٥. اليواقيت والجواهر في بيان عقائد الأكابر.

١٣٦. ضوء المعالي لبدء الأمالي، دار اقرأ للطباعة والنشر، سوريا ، دمشق.